پرستش

طاہر جاوید مُغل

انتساب

"اپنی اہلیہ شفیقہ کے نام' جو میرے حصے کی پریشانیاں لے کر اپنے حصے کی طمانیت

اور فرصت مجھے دے دیتی ہے...... تاکہ میں قلم سے ناتا جوڑ سکوں"

طاہر جاوید مغل

فہرست

عرض مصنف

کہانی مجھے شروع سے اچھی لگتی تھی۔ غالباً اس وقت سے جب ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا...... سرد رات' الاؤ' چنگاریاں اور نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ جو کسی داستان کے سحر میں گم ہیں..... یہ وہ منظر تھا جو میرے تصور کو ہمیشہ بھایا تھا۔ لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی کہانی لکھوں گا۔

پھر ایک ایسا دور آیا جب سینے میں اتھل پتھل ہوئی اور کچھ کر گزرنے کو دل چاہا۔ انگلیاں جیسے خود بخود قلم کی طرف بڑھ گئیں۔ اس وقت بھی یہ خیال ذہن میں نہیں آیا کہ مجھے کہانی لکھنی چاہئے۔ میں نے شاعری کو تختۂ مشق بنا لیا۔ کہانی مجھ سے اتنی ہی دور رہی جتنا مشرق سے مغرب۔ دو تین برس گزر گئے۔ پھر ایک روز بیٹھے بٹھائے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں کہانی لکھ سکتا ہوں۔ مجھے کہانی لکھنی چاہئے۔ میں نے کہانی کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ اس سفر میں میرے ارادے کو مستحکم کرنے اور میرے قدموں کو متحرک رکھنے میں کچھ کرمفرماؤں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں اہم ترین نام محترم معراج رسول صاحب کا ہے۔ وہ پہلی کہانی جس پر میں نے بجا طور پر فخر کیا "انجان" کے عنوان سے سسپنس ڈائجسٹ میں ہی چھپی تھی۔

اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر میں معراج رسول صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے "لکھنے والوں" کے لئے ایک شجرِ سایہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تخلیق کے تپتے خارزاروں میں بھٹکنے والے "تھکے ماندے' دل فگار اور خستہ جان قلم کار اس شجر کے سائے میں بیٹھ کر ایک ایسی طمانیت اور آسودگی محسوس کرتے ہیں جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ اس طمانیت اور آسودگی کا تعلق کسی مادی فائدے سے نہیں صرف اپنائیت اور یگانگت سے ہے۔

پچھلے دس پندرہ برس میں اپنی بساط کے مطابق میں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ تاہم زیرِ نظر کتاب کے لئے جو کہانیاں منتخب کی گئی ہیں ان کا موضوع

"محبت" ہے۔ محبت کس نے نہیں کی؟ محبت سب نے کی ہے۔ میری کہانیوں کے
کرداروں نے بھی کی ہے۔ ان میں سے کچھ واقعی اپنا وجود رکھتے ہیں اور اسی جیتے جاگتے
ماحول کا حصہ ہیں جس میں آپ اور میں رہتے ہیں۔ ان کہانیوں میں سے "انوکھا لاڈلا" اور
"یہ اداس صبحیں، یہ اداس شامیں" کا مشترک موضوع، نوعمری کی محبت ہے، لیکن مجموعی
تاثر کے لحاظ سے یہ کہانیاں بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

میں خدا سے دعا گو ہوں کہ یہ کہانیاں آپ کو پسند آئیں تاکہ بھائی عبدالغفار نے
میری کتابیں مسلسل شائع کرنے کا جو عزم فرمایا ہے وہ مستحکم رہے اور میں ان کتابوں کے
ذریعے پھر بھی آپ تک پہنچتا رہوں۔

طاہر جاوید مغل

دیباچہ

کہانی شاید دنیا کے قدیم ترین فنون میں سے ایک ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی سب سے ابتدائی شکل قصہ گوئی ہوگی۔ اس لیے کہ انسان نے لکھنا اور پڑھنا بہت بعد میں سیکھا تھا۔ قصہ گوئی کے عناصر ترکیبی میں ماضی اور تخیل اہم ترین تھے۔ بعد میں جب قصہ گوئی نے کہانی نویسی کا روپ دھارا تو بھی یہ دونوں عناصر اہم ترین ہی رہے۔ کہانی لکھنے والا اپنے یا کسی اور کے تجربے سے کہانی کی روح اخذ کرتا ہے۔ (تجربہ جو ماضی ہے) پھر اس میں تخیل کے رنگ ملا کر لفظوں کی لکیروں سے تصویر بناتا ہے۔ بہرحال کہانی ماضی ہوتی ہے۔ ماضی جو گزر چکا ہے۔

اردو ادب میں افسانے اور ناول کا ایک زریں دور گزر چکا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے سے جمود طاری ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ دور انحطاط چل رہا ہے۔ میں ڈائجسٹ اور ادب کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مگر نہایت عاجزی سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سسپنس ڈائجسٹ نے ادب کی بہت خدمت کی ہے اور کر رہا ہے۔ میں کسی اور ڈائجسٹ کا اس ضمن میں تذکرہ نہیں کرنا چاہتا کہ سب سے معتبر اور کثیر الاشاعت ڈائجسٹ "پدرم سلطان بود" کے مصداق محض اردو ادب کے عطر فروش کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اس نے اردو ادب میں اضافے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن سسپنس ڈائجسٹ میں چھپنے والی طبع زاد کہانیوں اور خاص طور پر آخری صفحات میں شائع ہونے والی تحریروں کو پڑھیے تو تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اہل ادب کو میری اس رائے سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ لیکن کاش، وہ پڑھ کر اختلاف کریں کہ یہی ان کے شایان شان ہے۔

کہانی ماضی ہے اور عام طور پر لکھنے والا حال میں بیٹھ کر اُس ماضی کو لکھتا ہے۔ ایسے میں پڑھنے والا صرف پڑھتا ہے۔ مگر خاص طور پر بیسویں صدی کی اس آخری دہائی میں لکھنے والوں نے اسلوب اور کہانی پیش کرنے کی تیکنیک کے سلسلے میں بڑے کامیاب تجربے کیے۔ ان لکھنے والوں میں ایک نام طاہر جاوید مغل کا ہے۔ انہوں نے بہت کم وقت میں اس عہد کے بڑے اور اہم کہانی کاروں میں ایک بے حد ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

اب اچھے کہانی لکھنے والے ماضی کو ماضی میں ہی بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ وہ زندہ لمحوں کو رقم کرتے ہیں۔ وہ جو لکھتے ہیں، وہ اس وقت کا حال ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک جیتی

جاگتی فضا تخلیق کرتے ہیں۔ پڑھنے والا کہانی پڑھتے پڑھتے منظر میں شامل ہوتا ہے اور کہانی کے ساتھ بہنے لگتا ہے۔ یوں کہانی پہلے کے مقابلے میں آگے بھی بڑھی ہے اور مقبول بھی ہوئی ہے۔

طاہر جاوید مغل میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو ایک کامیاب کہانی کار کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ان کی تھیم بہت طاقت ور ہوتی ہے۔وہ عام طور پر محبت اور اس کے منفی جذبوں جیسے رقابت اور خاص طور پر شک پر کہانی کی بنیاد استوار کرتے ہیں۔ وہ کہانی کی پلاننگ ایسی کرتے ہیں کہ کہانی کھلنے نہیں پاتی اور قاری متجسس رہتا ہے۔ پھر وہ کردار نگاری بہت خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ ان کے کردار افسانوی نہیں، حقیقی ہوتے ہیں۔ وہ جیتے جاگتے، سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ تحرک کا یہ عالم ہوتا ہے کہ سوچتے ہوئے بھی ان کا کردار متحرک معلوم ہوتا ہے۔ پھر کسی کردار کا رد عمل افسانوی نہیں ہوتا۔ ہر کردار اپنی نفسیات اوراپنے مزاج کے مطابق Act اور React کرتا ہے۔ وہ کرداروں کے محسوسات اور ان کی کیفیات کو ایسے موثر پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا انہیں خود پر طاری کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے ہاں الفاظ کی نشست بے حد خوبصورت لیکن بے ساختہ ہوتی ہے۔ تحریر میں روانی اور بہاؤ ایسا ہے کہ پڑھنے والا اس سے نکل نہیں سکتا۔ مجھے طاہر کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے ایک بہت خوبصورت نظم لکھتے لکھتے اچانک اسے کہانی میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور کہانی نظم کے مقابلے میں کہیں زیادہ اچھی ہے۔

طاہر جاوید مغل کا مشاہدہ غیر معمولی اور تجربہ عمیق ہے۔ وہ سطح کے نیچے، بہت نیچے تک دیکھتا ہے۔ اس کی کہانی پڑھتے وقت آپ کو یہ احساس ہوگا کہ آپ اس کی انگلی تھام کر زندگی کے گھنے اور تیرہ و تار جنگل کو کھوجنے نکلے ہیں۔ اور یہ سیر آپ کو بہت پرلطف محسوس ہوگی۔ آپ خود کو پہلے سے زیادہ دانا محسوس کریں گے۔ میری رائے میں کسی کہانی پر طاہر جاوید مغل کا نام ایک متحرک اور Live مطالعے کی ضمانت ہے۔

اپنے اس شعر کے بارے میں اب مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید طاہر ہی کے لیے کہا تھا۔

شگفتہ دل ملے وہ خوش نصیب لوگ جنہیں
ہوا ہے علم ودیعت گداز سینوں کا

علیم الحق حقی

پرستش
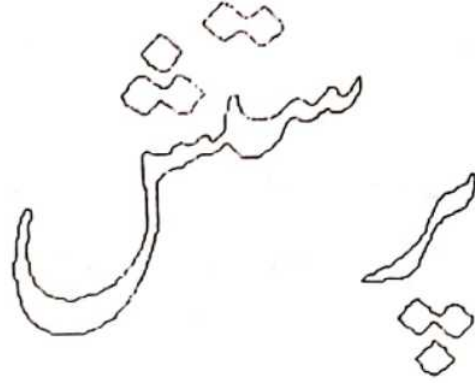
محبت کے موضوع پر جو کہانیاں میں نے لکھی ہیں یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔
یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے جسے میں بہت قریب سے جانتا ہوں۔
وہ بہت عقلمند تھا۔
اس کے ہاتھ ہر وقت اپنے "نفع و نقصان" کی نبض پر رہتے تھے۔
پھر اسے ایک پجارن سے محبت ہوئی۔
اس محبت نے اسے بتایا کہ عقل ہی سب کچھ نہیں'
نفع و نقصان ہی زندگی کا حاصل نہیں'
کبھی کبھی ایک خوبصورت نادانی بھی پوری زندگی سنوار دیتی ہے۔

والد صاحب کا انتقال ہو گیا تو مجھے فوری طور پر شہر چھوڑ کر گاؤں کا رخ کرنا پڑا۔ گاؤں میں ہماری کافی زمین تھی۔ کئی گودام تھے ۔ ایک بہت بڑا پولٹری فارم اور مچھلی فارم تھا۔ اپنی زندگی میں والد صاحب کی شدید خواہش رہی کہ میں گاؤں آجاؤں اور زمینداری میں ان کا ہاتھ بٹاؤں لیکن میں نے بالکل مختلف مزاج پایا تھا۔ درحقیقت اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شہر رنگ و بو لاہور میں گزارنے کے بعد میں دیہی ماحول اور زندگی سے کوسوں دور جا چکا تھا۔ میں انجینئرنگ میں داخلہ لینا چاہتا تھا لیکن ناکامی کے بعد بی ایس سی کیا اور پھر صنعت و حرفت میں اپنی دلچسپی کے سبب ایک چھوٹی سی فاؤنڈری کی داغ بیل ڈالی۔ یہ فاؤنڈری دن بہ دن ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی مگر اچانک والد صاحب حادثے کا شکار ہو گئے۔ خوشاب سے لاہور آتے ہوئے ان کی کار ایک راہ گیر کو بچانے کی کوشش میں بس سے جا ٹکرائی۔ والد صاحب اور ان کا ایک ملازم رب نواز موقع پر ہی ہلاک ہو گئے جبکہ ایک وکیل صاحب اور ایک ملازم کو شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچا دیا گیا۔

گاؤں میں پہنچتے ہی مجھ پر ذمے داریوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ زمین کے معاملات، فارموں کی دیکھ بھال، ملازمین کے تنازعے، رشتے داروں کی ریشہ دوانیاں، یہ سب کچھ جیسے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مصروفیت کی اس تند و تیز آندھی میں میرا شوق خزاں رسیدہ پتے کے مانند نجانے کہاں اڑ گیا۔ لاہور میں مجھے اپنا کام پہلے بند اور پھر ختم کرنا پڑا۔ یوں میں نے زراعت کے بجائے صنعت کو ذریعہ معاش بنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ ابتدائی مراحل میں ہی چکنا چور ہو گیا۔ اب میں تھا، آبائی حویلی تھی اور حویلی کے جھمیلے تھے۔ مجھے "چھوٹے مالک" کا خطاب دے کر عزت و احترام کی ایک ایسی مسند پر بٹھا دیا گیا تھا جس کے میں ہرگز لائق نہیں تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ایک آزاد خیال اور رنگین طبع شخص تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ میں دو جمع دو چار کا قائل تھا۔ ہر

معاملے میں حقیقت پسندانہ رویہ اپنا تا تھا' حتیٰ کہ شدید رومانی معاملات میں بھی میں نے کبھی ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ شہر میں' میں نے بڑا بھرپور وقت گزارا تھا۔ ہر ہر لمحے سے مسرتیں کشید کی تھیں لیکن گاؤں میں یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ یہاں کے اور شہر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اوپر سے میرے سر پر ادب و احترام کا جو پگڑ رکھ دیا گیا تھا وہ مجھے گردن ادھر ادھر گھمانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس صورت حال پر ہزار بار لعنت بھیج چکا تھا لیکن فوری طور پر چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

ہماری حویلی میں ایک لڑکی رابعہ عرف رابو کام کرتی تھی۔ وہ عام سی شکل و صورت کی مالک تھی۔ اگر اس کے چہرے پر کوئی چیز خوبصورت کہی جا سکتی تھی تو وہ ہونٹ تھے۔ لگتا تھا یہ ہونٹ کسی حسین و جمیل لڑکی کے چہرے سے اٹھا کر رابو کی ناک کے عین نیچے رکھ دیئے گئے ہیں۔ گداز' رسیلے اور لرزاں ہونٹ' جنہیں دیکھ کر دل میں کھد بدی ہونے لگتی تھی۔ رابو کی عمر بمشکل سولہ سال رہی ہوگی۔ رنگ گندمی تھا' بال لمبے مگر خشک اور الجھے الجھے سے۔ جسم عام لڑکیوں جیسا تھا۔ یعنی جیسا عام لڑکیوں کا کپڑوں میں دکھائی دیتا ہے۔ میں اکثر اسے اپنے قرب و جوار میں دیکھ چکا تھا لیکن کبھی زیادہ غور نہیں کیا۔ شاید اس میں زیادہ غور کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی اور ویسے بھی اب میں "چھوٹے مالک" تھا' ایسی عام سی لڑکی کے بارے میں اپنے ذہن کو سوچنے کی اجازت کیونکر دے سکتا تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ آنے والے دنوں میں یہ لڑکی میری زندگی میں کیا اہمیت اختیار کرنے والی ہے۔

میرے بارے میں' دوستوں میں مشہور تھا کہ جہاندار اصولوں ضابطوں کا بہت پابند ہے اور اگر اسے کسی سے ہاتھاپائی بھی کرنی ہو تو ہاتھاپائی کے لئے مخصوص ڈریس پہن کر جاتا ہے۔ یہ بات درست بھی تھی' میں ہر کام میں قرینے کا خواہشمند رہتا تھا۔ ایک روز میں منہ ہاتھ دھو کر غسل خانے سے برآمد ہوا تو میرا تولیا اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ تولیے کی عدم موجودگی مجھے ہمیشہ سے آگ بگولا کر دیتی ہے۔ میں نے ماماں کو ڈانٹ کر پوچھا کہ تولیا کہاں ہے۔ حویلی کی سب سے تجربہ کار ملازمہ ہونے کے باوجود وہ سہم گئی۔ گھبرا کر بولی۔

"میں نے رابو سے کہہ دیا تھا کہ تولیا غسل خانے کے باہر لٹکا دے۔" پھر وہ رخ پھیر کر رابو کو آوازیں دینے لگی "رابو............ او رابو' کہاں مر گئی ہے۔ ادھر آ جلدی

سے۔"

چند ہی لمحے بعد رابو تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ حسب معمول اس کے سر پر سلوٹوں والی سفید اوڑھنی تھی۔ وہ حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ماماں کو دیکھنے لگی۔ ماماں نے ساری ذمے داری رابو پر تھوپتے ہوئے گرج کر کہا۔ "حرام خور' کلموہی' صبح تجھے کہا نہیں تھا' چھوٹے مالک کا تولیا ان کے کمرے میں رکھ آ۔"

رابو ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ "جی............ وہ میں............ وہ میں بھول گئی تھی۔ دراصل ماں............" کچھ کہتے کہتے آواز رابو کے گلے میں اٹک گئی۔

"کیا ہوا' تیری ماں کو؟" میں نے پوچھا۔

"چھوٹے مالک! ماں کو بخار آ رہا ہے۔ چار پانچ دنوں سے............ کل ایک دم ان کی طبیعت جیادہ خراب ہو گئی۔ مجھے پتا چلا تو میں گھبرا کر جلدی سے گھر چلی گئی۔ ت............ تولیے کا یاد ہی نہیں رہا۔"

"اچھا کوئی بات نہیں۔ آئندہ دھیان رکھنا............ اب کیا حال ہے تمہاری ماں کا؟"

"پہلے سے اچھا ہے جی۔" رابو نے سادگی سے جواب دیا۔

"اچھا............ ٹھیک ہے جاؤ۔" میں نے کہا۔ وہ تشکر آمیز انداز میں سر جھکا کر باہر چلی گئی۔

میرا نرم رویہ دیکھ کر بوڑھی ماماں نے بھی اپنے تیور درست کر لئے۔ بولی "ویسے تو بڑی محنتی ہے جی۔ مشین کی طرح کام کرتی ہے۔ پر آج کل ماں کی وجہ سے جرا پریسان رہتی ہے۔ میں اچھی طرح سمجھا دوں گی۔"

میں نے ماماں کے خوشامدی لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں سے آتی ہے؟"

ماماں حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولی "آنا کہاں سے ہے جی۔ یہیں رہتی ہے حویلی کے پچھواڑے............ رب نواز کی بیٹی ہے۔"

میں اس اطلاع پر چونکا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اپنے اردگرد کے لوگوں سے میں کتنا بے خبر ہوں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں رب نواز اس ملازم کا نام تھا جو والد صاحب کے ساتھ حادثے میں جاں بحق ہوا۔ والد صاحب کے بقول یہ شخص ہمارا جدی پشتی ملازم تھا۔ غالباً رب نواز کا دادا ہمارے پردادا کی حویلی میں کام کرتا تھا اور یہ

تعلق اس سے پہلے بھی قائم تھا۔ یہ لوگ دیندار نامی ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ رب نواز کا دادا قتل کے کسی جھوٹے مقدمے میں انگریزوں سے سزائے موت پانے والا تھا۔ ہمارے پردادا نے اپنے اثر و رسوخ سے اس کی جاں بخشی کرائی۔ اس کے بعد اس شخص نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ حویلی کا خدمت گزار رہے گا اور اس خدمت کے بدلے میں کوئی نقد معاوضہ بھی قبول نہیں کرے گا۔ ہمارے پردادا بارسوخ زمیندار ہونے کے علاوہ ایک بڑے عالم دین بھی تھے۔ ہندو، سکھ غرض ہر مذہب کے لوگ ان کی توقیر کرتے تھے۔ والد صاحب بتاتے تھے کہ رب نواز کے دادا نے اپنی بیوی کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ہر صبح اپنے بالوں سے حویلی کے دیوان خانے میں جھاڑو دیا کرے یہ اور اس قسم کی کئی اور باتیں رب نواز کے خانوادے سے منسوب تھیں۔ اس خانوادے کے تین چار افراد اب بھی ہماری حویلی میں مختلف کام کرتے تھے۔ ان میں "ماماں" بھی شامل تھی۔ یہ رشتے میں رابو کی خالہ تھی۔

دھیرے دھیرے بالکل غیر محسوس طور پر میں رابو میں دلچسپی لینے لگا۔ میں اسے کن انکھیوں سے کام کاج کرتے دیکھتا۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم کھنک مجھے محظوظ کرتی۔ وہ کسی دن نظر نہ آتی تو مجھے انتظار رہتا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ خوبصورت اور دلربا لڑکیاں گاؤں میں اور میرے اردگرد موجود تھیں۔ شکل و صورت کے علاوہ ذہانت کے لحاظ سے بھی رابو کسی خاص زمرے میں نہیں آتی تھی۔ یہ بھی نہیں تھا کہ بہت خوش گفتار ہو۔ ہاں تھوڑا سا پڑھی لکھی ضرور تھی۔ اس نے مڈل کیا تھا۔ گاؤں میں یہی بڑی بات تھی۔ بہرحال اس کی یہ تعلیمی قابلیت میرے لئے متاثر کن نہیں ہو سکتی تھی............سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ دو وجوہات کے سبب میری نگاہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ گھریلو ملازمہ کی حیثیت سے ہر وقت میرے اردگرد رہتی ہے اور دوسری زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ وہ میرا بہت زیادہ دھیان رکھتی ہے۔ پچھلے سات آٹھ ماہ میں صرف ایک "تولیے والی" غلطی اس نے کی تھی۔ ورنہ میں شکایت کا موقع ہی ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔ میں جب فارم سے حویلی پہنچتا، کمرے میں ہر شے زبردست قرینے سے رکھی ملتی۔ بستر بے شکن الماری کے پٹ بند، گھر پہننے والا لباس استری شدہ کھونٹی پر ٹنگا ہوا، غرض میرا کمرا ہی نہیں پوری حویلی میں قرینے کی ایک لہر سی دوڑی محسوس ہوتی تھی اور اس لہر کے پیچھے جو ہاتھ نظر آتا تھا وہ واضح طور پر رابو کا تھا۔ ماماں نے سچ ہی کہا تھا وہ

مشین کی طرح کام کرتی ہے۔

میں نے جو یہ کہا ہے کہ وہ میری نگاہ کا مرکز بنتی جا رہی تھی، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں اس میدان میں اناڑی نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ محبت کب کرنی چاہئے اور کب صرف دلچسپی لینی چاہئے۔ دلچسپی کے بے پناہ فوائد کے علاوہ، محبت کے لامحدود نقصانات بھی میرے علم میں تھے۔ میں رابو میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اور یہ وہی دلچسپی تھی جس کا تعلق مرد و زن کے جسمانی تقاضوں سے ہوتا ہے۔ میرے کمرے کی صفائی رابو اس وقت کرتی تھی۔ جب میں فارم جا چکا ہوتا تھا، لیکن جمعے کے روز میں گھر پر ہوتا تھا اور اسے کمرے کی صفائی میری موجودگی میں کرنا ہوتی تھی۔ میں بستر پر نیم دراز ٹیلی ویژن دیکھتا یا اخبار کے مطالعے میں غرق رہتا۔ تاہم میری دزدیدہ نگاہیں رابو کو مصروف کار دیکھتی رہتیں۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، گھومنا، جھکنا سب کچھ نگاہ کے راستے جسم میں اترتا اور سنسناہٹ پیدا کر دیتا۔ میں جانتا تھا رابو کے اور میرے درمیان اتنا فاصلہ بھی نہیں جتنا میرے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ اور میرے ہونٹوں میں ہے۔ میں جب چاہوں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا ہوں لیکن درمیان میں "چھوٹے مالک" کی بلند و بالا دیوار کھڑی تھی۔ جو عزت و مان مجھے اس گاؤں نے دیا تھا وہ مجھ سے کچھ قربانیوں کا تقاضا کرتا تھا اور ان میں ایک قربانی یہ بھی تھی کہ میں خود کو لب و رخسار کی رنگینیوں سے دور رکھوں۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ جوانی میں ذہن کی سوچ خون کی حدت کے طابع ہوتی ہے۔ میں چھوٹے مالک کی مسند پر بیٹھ کر گاؤں کا کرتا دھرتا بن گیا تھا لیکن اندر سے وہی کھلنڈرا نوجوان تھا جو چند ماہ پہلے تک سہانی شاموں میں لاہور کی سڑکیں ناپتا تھا اور باغوں میں غیر نباتاتی حسن کی تلاش میں رہتا تھا............ ایک دن ماماں چھٹی پر تھی۔ شام کے وقت رابو کو چائے لے کر آنا پڑا۔ وہ نرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی اور میرے پلنگ کے قریب ٹھہر گئی۔ جب وہ جھک کر چائے بنا رہی تھی، میری نگاہیں نہ چاہنے کے باوجود اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے کھلے گلے کی قمیض پہن رکھی تھی اور باریک اوڑھنی اس کا جسم چھپانے میں ناکام تھی۔ ایکا ایکی میرے اندر ایک بند سا ٹوٹ گیا اور شوریدہ سر لہریں جسم میں ہلچل مچانے لگیں۔ عوت ایسی ہلچل سے بہت جلد باخبر ہو جاتی ہے۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا، رابو کے گندمی چہرے پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے لرزاں ہونٹ ہمیشہ سے زیادہ متحرک دکھائی دیے۔ میں نے پوچھا۔

"تمہاری ماں اب کیسی ہے؟"

"پہلے سے اچھی ہے مالک۔"

"اس کا خیال رکھو' کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔"

"بہت اچھا مالک۔"

میں نے چائے کی چسکی لے کر کہا "اور چائے تم خود ہی لے کر آیا کرو۔ اچھی بناتی ہو۔"

"جی مالک۔"

وہ اوڑھنی درست کرتی ہوئی واپس چلی گئی۔ میں چائے سے زیادہ اس کے تصور کو پیتا رہا اور اپنی دھڑکنوں کا آہنگ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

اگلے روز ماماں موجود تھی لیکن رابو خود ہی چائے لے کر آئی۔ ڈور کلوزر خود بخود دروازے کو بھیڑ چکا تھا۔ اس نے چائے بنا کر میرے ہاتھ میں تھمائی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"صبح غسل خانے میں صفائی تم کیا کرتی ہو یا ماماں؟"

"جی میں خود کرتی ہوں.........."

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ معلوم ہے مجھے کیسے پتا چلا؟"

"جی کیسے؟"

"ایسے کہ برش اسٹینڈ کے اوپر جو تھوڑی سی جگہ ہے اس پر مٹی جمی ہے۔ شاید پچھلے تین ماہ سے اسے صاف نہیں کیا گیا' لیکن اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تمہارا قد سوا پانچ فٹ ہے اور سوا پانچ فٹ سے وہ مٹی نظر نہیں آتی۔ میں چھ فٹ کا ہوں اس لئے نظر آجاتی ہے۔ ماماں بھی خاصی لمبی تڑنگی ہے اس لئے وہ بھی دیکھ سکتی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ غسل خانہ صرف تم ہی صاف کرتی ہو۔"

میری تشریح پر رابو پریشان ہو گئی۔ آہستگی سے بولی "معاف کیجئے چھوٹے مالک! میں ابھی صاف کئے دیتی ہوں۔"

وہ غسل خانے میں چلی گئی تو میں بھی چائے چھوڑ کر اس کے پیچھے گیا۔ وہ پنجوں کے بل کھڑی برش اسٹینڈ کے عقبی خلا میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی اوڑھنی کے پلو کو دو انگلیوں پر لپیٹ کر مٹی صاف کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے سمجھایا "ایسے نہیں بھئی! یہ دیکھو یہ جھاڑن ہے ناں۔ اسے اس طرح اچھال کر اسٹینڈ کے پیچھے ڈال دو۔ پھر دونوں کونے پکڑ کر دائیں بائیں حرکت دو۔ یہ آسان طریقہ ہے۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ یہ سب کچھ سمجھانے بجھانے کے چکر میں' میں اس کے کافی قریب آچکا تھا۔ میرا ایک پہلو اس کے جسمانی نشیب و فراز سے آگاہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ بڑی دلچسپ صورت حال ہوتی ہے جب سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھا جائے۔ چند ہی لمحے میں یہ کھیل ختم ہوا اور وہ وحشی ہرنی کے مانند کمرے سے نکل بھاگی۔ میرے لئے یہی حوصلہ افزائی بہت تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ ٹرالی لینے آئی تو میں نے نگاہیں پوری بے باکی سے اس کی نگاہوں میں گاڑ دیں۔ وہ سٹپٹا کر نیچے دیکھنے لگی۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی اپنے کمرے میں' کبھی حویلی کی چھت پر' کبھی باغ کے کسی گوشے میں۔ یہ ساری چار دیواری میری شکار گاہ تھی۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ میں اپنی مرضی کے وقت' اپنی من پسند جگہ پر گھات لگاتا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ گاؤں آکر کئی پابندیاں میں نے اپنے اوپر خواہ مخواہ لگا لی ہیں۔ شہروں کو رومان پروری میں فوقیت ضرور حاصل ہے لیکن دیہات میں بھی دیہی ڈھنگ سے خاصی "پیش رفت" ہو چکی ہے۔

ایک روز مجھے تاریخ پر لاہور جانا تھا۔ تین چار دن کا کام تھا۔ میں لباس بدل چکا تھا۔ بریف کیس بھی تیار تھا۔ باہر منشی خادم حسین اور ڈرائیور یار محمد کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ دل چاہا کہ جانے سے پہلے رابو سے دو باتیں کروں۔ ارد گرد نظر دوڑائی۔ کوئی ایسا کام دکھائی نہیں دیا جس کے بہانے اسے بلایا جاتا۔ پھر سوچا کہ ایسی بھی کیا بات ہے۔ میں بغیر بہانے کے اسے بلا سکتا ہوں۔ آخر میں "چھوٹے مالک" ہوں۔ ماماں کو آواز دی کہ وہ رابو کو بھیجے۔ تھوڑی دیر بعد رابو آگئی۔ وہ شاید آٹا گوندھتی آئی تھی۔ اس کے ہاتھ کہنیوں تک دھلے ہوئے تھے۔

"جی' کیا بات ہے؟" اس نے حسب معمول دھیمی آواز میں پوچھا۔ خشک بالوں کی ایک لٹ اس کے پھیکے پھیکے سے رخسار پر جھول رہی تھی۔

پوچھنے کو تو اس نے یہ سوال پوچھ لیا تھا لیکن چہرے مہرے سے ظاہر تھا کہ جواب وہ جانتی ہے۔ میری نگاہ اس کی پشت پر دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ جونہی ڈور کلوزر نے دروازے کو بھیڑا میں نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ میرا ہدف اس کے لب تھے۔ پتا نہیں وہ کس کے لب تھے جو اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ میں کافی دیر یہ "معما" حل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اچانک اس کے کومل جسم نے جھٹکا کھایا "کوئی آرہا ہے۔" وہ

جلدی سے الگ ہو گئی۔ ایسے معاملات میں عورت کی حسیات ہمیشہ قابل بھروسا رہی ہیں۔ واقعی کوئی آ رہا تھا۔ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ پٹ وا ہوئے تو سامنے ماماں کھڑی تھی۔ اس نے اطلاع دی کہ رابو کی ماں مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں اس اعلان پر بھونچکا رہ گیا۔ خیال آیا کہ شاید رابو والی بات اس کے کانوں تک پہنچ چکی ہے اور اس نے مجھے باز پرس کے لئے بلایا ہے۔ پھر میں نے خود ہی اس خیال پر لعنت بھیجی۔ یہ لاہور نہیں میرا گاؤں تھا۔ یہاں زمین کی ہر انچ میری ملکیت تھی۔ اور لوگوں کا رزق میرے وسیلے سے ان تک پہنچتا تھا۔ مجھ سے کون باز پرس کر سکتا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر ماماں سے پوچھا "کون ملنا چاہتا ہے؟"

"رابو کی ماں' چھوٹے مالک" ماماں نے دہرایا۔ "اس کی منجھی حویلی کے دروازے پر رکھی ہے۔"

رابو پہلے ہی ہراساں تھی' منجھی یعنی چارپائی کا ذکر سن کر اور ڈر گئی۔ بغیر پوچھے باہر کی طرف بھاگی۔ میں کچھ دیر شش و پنج میں کھڑا رہا۔ میری الجھن دیکھ کر ماماں نے کہا۔ "چھوٹے مالک' اس کی حالت بڑی کھراب ہے۔ بس ایک دو گھڑی کی مہمان ہے۔ شاید آپ سے اجاجت لینا چاہتی ہے۔"

"اجازت........ کیسی اجازت؟"

"مرنے کی اجاجت مالک اور کس کی۔ وہ کہتی ہے مالک اجاجت دے گا تو میری جان آسانی سے نکل جائے گی۔ ہمارے کھاندان میں یہی کائدہ ہے کہ مالک اجاجت دے تو مسکل آسان ہو جاتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میری بڑی بہن کی جان نہیں نکلتی تھی تو اس نے بھی اللہ بکھسے "بڑے مالک" سے اجاجت لی تھی۔"

"یہ کیا بیہودگی ہے" میں بے ساختہ بڑبڑایا۔ پہلے تو دل میں آئی کہ ماماں سے کہہ دوں کہ میں نہیں جا سکتا۔ مگر پھر سوچا کہ گاؤں والے کیا کہیں گے۔ بڑھیا کے پیچھے چلتا حویلی سے باہر نکلا۔ دروازے پر ایک چارپائی رکھی تھی جس پر ہڈیوں کا ایک ناقابل شناخت ڈھانچا پڑا تھا۔ یہی رابو کی ماں تھی۔ چارپائی کے گرد حویلی کے ملازمین اور دوسرے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ رابو ماں کے سرہانے بیٹھی زارو قطار رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر رابو کی ماں کی آنکھوں میں عجیب چمک نمودار ہوئی مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ابھی اپنے ڈھانچے کو سمیٹ کر اٹھے گی اور میرے پاؤں میں گر پڑے گی۔ اس شرمندگی سے بچنے کے لئے میں بے اختیار چند انچ پیچھے سرک گیا۔ یہ سراسر اضطراری فعل تھا۔ ورنہ اس جاں بلب

عورت میں اتنی سکت کہاں تھی کہ ایسی حرکت کر سکتی۔ اس نے اپنا استخوانی ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا پھر اس کے لب حرکت کرنے لگے۔ لوگ بالکل خاموش کھڑے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھ سے کسی رد عمل کی توقع کر رہے ہیں۔ ذہن نے مشورہ دیا کہ مجھے عورت کے قریب ہو کر اس کی بات سننی چاہئے۔ ناگواری کو دباتے ہوئے عورت کے چہرے کی طرف جھک گیا۔ اس کے خدوخال اب کچھ کچھ میری پہچان میں آنے لگے تھے۔ اس کا نام شاید طالعہ تھا۔ ہم سب اسے تالیاں تالیاں کہا کرتے تھے۔ تالیاں وہی کام کرتی تھی جو اب اس کی بیٹی انجام دیتی تھی۔ میں بچپن میں اسے اکثر حویلی کی چار دیواری میں گھومتے دیکھتا تھا۔ کبھی برتن مانجھتے' کبھی فرش دھوتے کبھی ڈھیروں کپڑے استری کرتے۔ پھر میں لاہور چلا گیا۔ بس کبھی کبھار آنا ہوتا تھا۔ چند سال پہلے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تالیاں بیمار ہے اور کام پر نہیں آتی۔ اتنے برس بعد آج اس کی بیماری انجام کو پہنچ رہی تھی۔ وہ سرسراتی آواز میں بولی۔

"چھوٹے مالک........ مجھے اجاجت دو۔ اگر کوئی گلتی ہو گئی ہے تو ماف کر دینا۔"

میں نے کہا "حوصلہ رکھو تالیاں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" کتنے بے روح' بے محل الفاظ تھے یہ اس کے باوجود میں یہی الفاظ کہہ سکتا تھا۔

تالیاں نے کہا "مالک' میرا سفر کھتم ہو رہا ہے۔ بس ایک بنتی کرنی ہے آپ سے۔"

"ہاں ہاں' کہو" میں نے چور نظروں سے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

"رابو اب آپ کے سپرد ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی ہیں۔ ابھی بالڑی ہے' کوئی گلتی کرے تو اسے معاف کر دینا۔"

میں نے دیکھا تالیاں کی گدلی آنکھوں میں عاجزی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بہ زبان خاموشی وہ مجھ سے کہہ رہی تھی "مالک! اپنی عمر بھر کی خدمت کے عوض میں تم سے صرف اپنی بیٹی کی سرپرستی مانگتی ہوں۔ تین کپڑوں میں اسے عزت کے ساتھ ٹھکانے لگا دینا۔"

"بے فکر رہو تالیاں" میں نے اپنی بھاری آواز کو کچھ اور بھاری بھرکم بنا کر کہا "رابو اور ماماں ہمارے گھر کے افراد کی طرح ہیں۔ میں انہیں اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں۔"

میں جلد از جلد تالیاں کے پاس سے اٹھنا چاہتا تھا۔ میری مرضی میرا رمزشناس منشی

خوب سمجھتا تھا۔ وہ میرے قریب جھک کر بولا "چھوٹے مالک' جلدی کیجئے۔ وکیل صاحب کا وقت نکل جائے گا۔"

میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ روتی دھوتی رابو پر ڈالی اور اپنے ملازمین کے ساتھ کار میں جا بیٹھا۔

لاہور میں میرا کام تین روز میں ختم ہو گیا' لیکن پھر تین چار روز افروزہ کی ناز برداریوں میں لگ گئے۔ افروزہ کا تعلق ہماری برادری سے تھا۔ نہایت خوش حال صنعت کار باپ کی بیٹی تھی۔ درحقیقت عملی زندگی میں' میں افروزہ کے والد انوار صاحب سے بے حد متاثر تھا۔ میری طرح انہیں بھی نوجوانی میں "صنعت کار" بننے کا جنون تھا۔ فرق یہ تھا کہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب رہے تھے جب کہ میں اپنے راستے پر آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے چلا آیا تھا۔ افروزہ حسین ہونے کے ساتھ ذہنی صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھی۔ میری اور اس کی ملازمت کالج کے زمانے میں ہوئی تھی۔ خاندانی قربت کے سبب ہمارے تعلقات تیزی سے بڑھے اور ہم ایک دوسرے کو کافی حد تک سمجھنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری طرف سے شادی کی پیش کش ہوئی تو دوسری جانب سے انکار نہیں ہو گا۔ مگر یہ فیصلہ میں اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے زندگی میں ہر کام سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ شادی میں عجلت کیسے کر لیتا۔ ایک ہفتے بعد جب میں لاہور سے فارغ ہو کر خوشاب پہنچا تو رابو کی ماں کو لحد میں اترے چار دن ہو چکے تھے۔

O------------☆------------O

وقت اپنی مخصوص رفتار گزرتا رہا۔ میں پوری تندہی سے اپنے پولٹری فارم کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اب میں دیہی ماحول سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ ہر اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھنے لگا تھا اور آغاز میں جو جھجک سی تھی وہ ختم ہو گئی تھی۔ جن دنوں میں حویلی میں ہوتا اکثر رابو سے ملاقات ہوتی رہتی۔ میں موقع دیکھ کر اسے بلاتا۔ میرے ایک اشارے پر وہ کچے دھاگے سے بندھی چلی آتی۔ میں اسے بانہوں میں سمیٹ کر اس بات کے واشگاف ثبوت فراہم کرتا کہ وہ میری ضرورت ہے لیکن ایک بات ہے۔ رابو کی تمام تر خود سپردگیوں کے باوجود میں نے ہمیشہ خود کو اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ اس کی وجہ میں خود بھی ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ بس ایک دیوار سی میرے سامنے آجاتی تھی۔ میں محسوس کرتا اس دیوار پر بڑے بڑے جلی حروف میں "چھوٹے مالک" لکھا ہے' اور وہ ان گنت جملے درج ہیں جو لوگ میری عزت افزائی

میں کہتے بنتے ہیں۔ اس دیوار کے اوپر مجھے اپنے باپ دادا اور ان کے بزرگوں کی شاندار پگڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دیتیں۔ مجھے لگتا' یہ دیوار گری تو یہ سب پگڑیاں بھی مٹی میں رل جائیں گی...... اور یہ دیوار صرف رابو اور میرے درمیان ہی نہیں تھی' میں جب بھی کوئی ایسا کام کرتا جس پر میرے اندر کے انسان کو قلق ہوتا' یہ دیوار ابھر کر سامنے آجاتی۔ اگر اسے خود ستائشی نہ سمجھا جائے تو کہوں گا کہ اپنی تمام تر رنگین طبعی کے باوجود خون میں شرافت اور پارسائی کا وہ جوہر کسی نہ کسی درجے میں موجود تھا جو مجھے وراثت میں ملا تھا اور جس کے سبب لوگ میرے بزرگوں کی عزت کرتے تھے۔

ایک روز کی بات ہے' صبح میں خلاف معمول دھوپ...... سینکنے کے لئے چھت پر چلا گیا۔ نو دس بجے کا وقت ہو چکا تھا لیکن آج فارم پر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دراصل کچھ شہری دوستوں کے ساتھ میں مرغابی کے شکار پر گیا ہوا تھا اور اس سہ روزہ مہم سے کل رات ہی واپسی ہوئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ آج سارا دن آرام کیا جائے۔ دفعتاً نیچے صحن کی طرف سے کچھ مدھم آوازیں سنائی دیں۔ غالباً رابو کسی دوسری نوکرانی سے جھگڑ رہی تھی۔ میں نے منڈیر کے جھروکے سے جھانک کر دیکھا۔ نلکے کے نیچے رابو اور چمپا کھڑی تھیں۔ چمپا میرے وہ شکاری بوٹ دھو رہی تھی جو کیچڑ اور گھاس پھونس کے ملغوبے سے لتھڑے ہوئے تھے۔ بوٹوں سے آلائش جدا کرنے کے لئے چمپا نے جھاڑو استعمال کیا تھا۔ رابو اسی بات پر خفا ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ چمپا نے بوٹوں کو جھاڑو سے کھرچ کر "ناقابل معافی جرم" کیا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چمپا کو دھکیل کر پرے ہٹا دیا اور خود بوٹ دھونے بیٹھ گئی۔ میں جھروکے پر رکوع کے بل جھکا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ چمپا چلی گئی تو رابو نے بڑی تسلی سے بوٹ دھونے شروع کئے۔ وہ کیچڑ اور گوبر وغیرہ اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہی تھی۔ بڑی محبت اور ملائمت کے ساتھ۔ جیسے بوٹ نہ ہوں کسی پیارے کا چہرہ ہو۔ بوٹ دھل گئے تو اس نے انہیں اپنی اوڑھنی سے پونچھا اور دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھ دیا...... پھر کہنیوں تک ہاتھ دھونے کے بعد بکھرے بالوں کو ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی صورت میں باندھا اور دوسرے کاموں میں لگ گئی۔ آستین چڑھائے صحن میں ادھر ادھر گھومتی وہ مجھے اچھی لگی۔ کبھی کبھی وہ خاصی پرکشش لگتی تھی۔ کوشش کے باوجود میں جان نہیں سکا کہ یہ کشش کہاں ہے۔ اس کے ہونٹوں میں' اس کے متوازن جسم میں' اس کی بھرپور نسوانی مسکراہٹ میں یا ان عریاں بانہوں میں جو اس کی چڑھی آستینوں میں سے جھانکتی رہتی تھیں...... اس کے چہرے پر جگہ جگہ

خوبصورتی کے نخلستان تھے۔ جن کی ٹھنڈک پیاسے ہونٹوں کو سیراب کر سکتی تھی۔ میں محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ میں کوئی مجبور عاشق نہیں تھا کہ آہیں بھر کر رہ جاتا۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی تو میں اس کیفیت کا اظہار عملاً کر سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ رات شہری دوستوں نے میرے کمرے میں جو ہڑبونگ مچائی تھی اس کے اثرات جوں کے توں ہوں گے اور رابو کو کمرا سنبھالنے میں کافی وقت لگے گا۔ اس "کافی وقت" میں سے کچھ وقت میں اپنے استعمال میں بھی لا سکتا تھا۔ چھت سے اتر کر میں بیڈ روم میں پہنچ گیا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ کمرا آئینے کی طرح صاف تھا۔ ہر شے قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ مجال ہے جو کہیں کوئی بے ترتیبی نظر آئے۔ یہ سب رابو ہی کا کیا دھرا تھا۔ وہ کام اچھا ہی نہیں زیادہ بھی کرتی تھی۔ یعنی کوالٹی اور کوانٹیٹی دونوں میں لاجواب۔ صبح سات بجے کے قریب حویلی میں داخل ہوتی تھی اور رات دس بجے تک بے تکان جتی رہتی تھی۔ دوسرے ملازمین یقیناً رابو پر دانت پیستے ہوں گے۔ کیوں کہ رابو کی وجہ سے انہیں بھی چستی کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ رابو اب میرا سامنا کرنے سے کتراتی ہے۔ کمرے کی آناً فاناً صفائی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ یقیناً حویلی کے ملازمین کو ہمارے تعلق کی بھنک پڑ چکی تھی۔ اور ان کی آگاہی رابو کے لئے حجاب بنتی جا رہی تھی۔ کچھ بھی تھا' ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے اتنی اچھی لگی تھی کہ اس کا کمرے میں آنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے لباس تبدیل کرنے کے بعد قمیض کے گریبان سے ایک بٹن توڑ کر علیحدہ کر دیا اور گرج کر ماماں کو آواز دی۔ وہ حسب معمول بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میں نے کہا۔

"یہ قمیض کا بٹن کہاں ہے؟"

وہ ٹوٹا ہوا بٹن دیکھ کر اور گھبرا گئی۔ جلدی سے بولی "غلطی ہو گئی چھوٹے مالک! میں ابھی ٹانک دیتی ہوں۔"

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سوئی دھاگا ڈھونڈ کر وہ میری طرف بڑھی۔ پھر اس کے ذہن میں وہ بات آئی جو میں پہلے سے جانتا تھا۔ بٹن ٹانکنا ماماں کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اسے تو معلوم نہیں سوئی کیسے نظر آ گئی تھی۔ ہراساں لہجے میں بولی۔ "ایک منٹ چھوٹے مالک' میں رابو کو بھیجتی ہوں۔"

سلیپر کھٹ کھٹ بجاتی ہوئی وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں زیر لب مسکرانے لگا۔ چند لمحے بعد رابو سوئی دھاگا لئے اندر آئی۔ کھلا گریبان اور اس میں سے جھانکتے

ہوئے سیاہ بال دیکھ کر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے بولی۔

"دیجئے قمیض۔"

"نہیں' ایسے ہی لگا دو" میں نے مسکرا کر کہا۔

اس کی شوخ سیاہ آنکھیں ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں سے ٹکرائیں پھر وہ آگے بڑھ کر ٹوٹے ہوئے دھاگے گریبان سے چننے لگی "بٹن کہاں ہے؟"

"کون سا؟"

"جو آپ نے توڑا ہے۔"

میں نے مسکرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور بٹن اس کے حوالے کر دیا۔ وہ بٹن ٹانکنے لگی' انگلیوں کی پوریں میرے سینے کے بالوں سے الجھ رہی تھیں۔ اس کے لباس سے اٹھنے والی بو کئی طرح کی ہوتی تھی۔ صابن کی بو' ترکاری کی بو' مشقت کے پسینے کی بو' لیکن ان ساری بوؤں کو وہ ایک تیز خوشبو میں چھپا لیتی تھی۔ یہ کوئی مصنوعی خوشبو نہیں تھی۔ اس کے کنوارے جسم کی مہک تھی جو ایک مست ادا کے ساتھ مجھے گھیر لیتی تھی۔ وہ بٹن لگا چکی تو میں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ رابو.......... میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کی کھوجی نگاہوں نے ایک لمحے میں میرے چنچل منصوبوں کی ٹوہ لے لی۔ بولی "ابھی نہیں چھوٹے مالک! ماماں اور چمپا باہر گھوم رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں بازار چلی جائیں گی تو آؤں گی۔"

میں نے اسے جانے دیا.......... گھڑے کی مچھلی ہی تو تھی۔ کچھ دیر بعد وہ باہر کے حالات درست کر کے واپس آ گئی۔ میں نے بانہیں کھولیں تو وہ ان میں یوں سما گئی جیسے ان بانہوں کا ہی ایک حصہ ہو۔ میں نے اس کے الجھے سلجھے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "رابو! کیوں میرے لئے اپنی جان ہلکان کرتی ہو۔ میں کوئی ایسا اچھا آدمی تو نہیں ہوں" وہ اس سوال پر خاموش رہی۔ میں نے اسے تھوڑا سا جھنجھوڑ کر جواب دینے پر اصرار کیا۔

وہ میرے کندھے کے گداز میں اپنی ناک دھنسا کر بولی۔ "چھوٹے مالک' میں تو کچھ بھی نہیں کرتی۔ میرے بس میں ہو تو اپنی کھال کی جوتیاں بنوا کر آپ کے پاؤں میں ڈالوں۔"

میں نے کھینچ کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کیا "لیکن کیوں؟"

اس نے بڑا سادہ سا جواب دیا لیکن اس جواب نے مجھے لرزا دیا۔ وہ بولی "آپ

ہی تو میرے سب کچھ ہیں" یہ بات کہتے ہوئے اس کا چہرہ اوپر کو اٹھا ہوا تھا' آنکھیں بند تھیں اور خوب صورت لب ادھ کھلے تھے' جیسے وہ مجھ سے نہیں' آسمان سے مخاطب ہے۔ اس نیلگوں بلندی سے مخاطب ہے جو قوت' اختیار اور لازوال عظمتوں کی علامت ہے۔ اس کے انداز نے مجھے شرمسار کر ڈالا۔ شرمساری کو چھپانے کے لئے میں نے بھی اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام کر دیا۔

وقت کا پنچھی روز و شب کے پر لگائے اڑتا رہا۔ حویلی کی چار دیواری میں رابو وقتاً فوقتاً میری تنہائی کو چمکاتی رہی۔ ایک موقع پر تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں سچ مچ رابو کی محبت میں گرفتار ہو رہا ہوں۔ یہ عجیب ہی کیفیت تھی۔ کبھی ہر وقت ہوتی اور کبھی دنوں تک نہ ہوتی۔ کہتے ہیں خواب ان سوچوں کا سایہ ہوتے ہیں جو ہم جاگتے ذہن سے سوچتے ہیں۔ میرے خوابوں میں رابو کا گزر ہونے لگا اور کبھی کبھی میں اسے ایک دلہن کے روپ میں دیکھتا۔ سرخ جوڑے میں لپٹی وہ میرے سامنے آتی۔ میں کھڑا اس کی طرف تکتا رہتا۔ کبھی خیال آتا' یہ میری دلہن ہے اور میرے قدموں کی چاپ کا انتظار کر رہی ہے۔ کبھی سوچتا کہ یہ معمولی لڑکی میری دلہن کیسے ہو سکتی ہے۔ یقیناً یہ کسی اور کی امانت ہے اور میں اسے ایک غیر محرم کی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا لیکن آنکھوں کو جتنا موندنے کی کوشش کرتا وہ اتنی ہی کھلتی جاتیں اور میں بیدار ہو جاتا۔

بہت جلد میں نے اپنی سوچوں کا دھارا بدل کر اس خواب پر قابو پا لیا۔ بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ رابو سے کسی طرح بھی میرا جوڑ نہیں۔ اس میں کوئی ایک بات بھی نہیں جس کی خاطر پوری زندگی اس سے وابستہ کی جائے۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی مگر اسے شریک حیات بنانا میرے جیسے شخص کے لئے جگ ہنسائی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ذہن میں یہ خیال مستحکم ہونے کے بعد مجھے اپنا وہ فرض یاد آنے لگا جو رابو کی ماں نے مرتے وقت مجھ پر عائد کیا تھا۔ میں رابو کی شادی کا سوچنے لگا۔ رابو کے قریبی عزیزوں میں صرف ایک ماماں تھی جس سے مشورہ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ماماں سے بات کی۔ اس نے بتایا کہ ہری پور میں ان کے کچھ عزیز رہتے ہیں۔ ان کا "دارا" نامی لڑکا کئی بار گاؤں بھی آ چکا ہے۔ وہ برسر روزگار ہے۔ فروٹ کی ٹوکریاں اور چھابے وغیرہ بنانے کا کام کرتا ہے۔ رابو کی مرحومہ ماں چاہتی تھی کہ رابو کا بیاہ دارا سے ہو جائے۔

میں نے ماماں سے کہا کہ وہ ہری پور جا کر ان لوگوں کی مرضی معلوم کرے اور اگر بات بنتی ہے تو رابو کا رشتہ طے کر دے۔ اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا' میں بھی کروں گا۔ ماماں اس بات پر خوشی سے پھولی نہیں سمائی۔ اگلے ہی روز وہ اپنی گٹھری باندھ کر ہری پور روانہ ہو گئی............ رابو غالباً ان معاملات سے لاعلم تھی۔ ماماں کی واپسی ایک ہفتے بعد ہوئی۔ وہ کامیاب لوٹی تھی۔ اس نے بتایا کہ ہری پور میں اس کی ملاقات اپنے ایک بھائی سے بھی ہو گئی ہے اور ان دونوں نے مل کر رابو کا معاملہ طے کر دیا ہے۔

ہماری حویلی میں رب نواز کے اہل خانہ کی حیثیت عام ملازموں سے مختلف تھی۔ عام ملازم کی بیٹی کو شادی پر پانچ ہزار روپے نقد یا اس کے برابر جنس ملتی تھی۔ میں نے رابو کے لئے دس ہزار روپے وقف کئے۔ آٹھ ہزار روپیہ میں نے اپنے منشی کو ماماں کی موجودگی میں دیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اسے بہتر طریقے سے استعمال کریں۔

ایک روز جب میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا اور رابو میرے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھی' میں نے آہستگی سے پوچھا "رابو' تو اس شادی سے خوش ہے نا؟"

اس کی انگلیوں میں اجنبی سی لرزش پیدا ہوئی۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی۔ میں نے مڑ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہ خوشی نہ غم' نہ دکھ نہ شکر گزاری' تراشیدہ ہونٹ باہم پیوست تھے۔ میں نے کہا "تم نے جواب نہیں دیا' دارا کیسا لڑکا ہے۔ میرا مطلب ہے تم نے اسے دیکھا ہوا ہے نا؟"

"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اس کے ساتھ خوش رہو گی ناں؟"

اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ بالوں میں انگلیوں کی حرکت بے ترتیب ہو گئی۔ اس نے سر اس انداز سے جھکایا کہ اوڑھنی خود بخود گھونگھٹ بن گئی۔ اس میلے سے بوسیدہ گھونگھٹ نے سب کچھ چھپا لیا............ یہ کوئی معمولی گھونگھٹ نہیں تھا۔ اس چند بالشت کپڑے کی اوٹ میں مشرقی عورت ہزاروں طوفان چھپا لیتی ہے۔ چیختی چنگھاڑتی آندھیاں' اشکوں کے سمندر' خوشیوں کے انبار اور دکھوں کے پہاڑ سب کچھ اس گھونگھٹ کے پیچھے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ گھونگھٹ ہزار سال پہلے بھی ناقابل عبور تھا اور آج بھی ہے۔ کوئی ایکسرے مشین کوئی لیزر کوئی اینٹی ڈارک اور اینٹی کلاتھ شیشہ اس گھونگھٹ کے پیچھے نہیں جھانک سکتا۔

چند دنوں بعد رابو حویلی میں کم کم نظر آنے لگی۔ میں نے ماماں سے پوچھا۔ اس

نے بتایا کہ شادی قریب آگئی ہے۔ اس لئے وہ سینے پرونے میں مصروف رہتی ہے۔ مجھے اس بات پر دھچکا سا لگا لیکن کئی دوسرے دھچکوں کی طرح میں اسے بھی بہ آسانی برداشت کر گیا۔ میں زیادہ وقت فارم میں گزارنے لگا۔ مرغیوں کے علاوہ اب میں بٹیر کی افزائش کا کام بھی شروع کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لئے میں انڈے سینے کی مشین "انکوبیٹرز" مقامی کاریگروں سے بنوا رہا تھا۔ اس سلسلے میں افروزہ کے والد بھی میری مدد کر رہے تھے۔ رات گئے میں فارم سے آتا اور پڑ کر سو رہتا۔ حویلی کے حالات کی زیادہ خبر نہیں رہتی تھی۔ ایک روز ماماں نے بتایا کہ پرسوں جمعے کے روز رابو مایوں بیٹھے گی (اس رسم کے بعد لڑکی شادی سے پہلے کہیں آجا نہیں سکتی) شادی میں اب چھ سات روز ہی رہ گئے تھے۔ ماماں کی درخواست پر میں نے اسے اخراجات کے لئے دو ہزار روپے مزید دے دیئے۔

جمعے کے روز میں حویلی میں ہی ستا رہا تھا۔ اچانک رابو نظر آئی۔ حسب معمول اڑسی ہوئی آستینوں میں سے اس کی سڈول بانہیں جھلک رہی تھیں اور وہ کام پر آمادہ نظر آتی تھی۔ میں نے حیرانی سے کہا "رابو! آج تو تیری رسم ادا ہونی تھی۔ تو یہاں چلی آئی؟"

وہ بولی "رسم کا کیا ہے، شام کو ہو جائے گی" پھر وہ تیزی سے غسل خانے میں گھس گئی۔ غسل خانہ صاف کرنے کے بعد باہر نکلی اور کمرے کی صفائی میں لگ گئی۔ اس روز میں اس کی تندہی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے لگا جیسے کوئی ستارہ ڈوبنے سے پہلے آخری بار اپنی چمک دکھا رہا ہے۔ اس نے میرے سارے ان دھلے کپڑوں کا انبار صحن میں لگالیا اور دھونے بیٹھ گئی۔ ان کپڑوں میں میرے کمرے کے دبیز پردے اور مسہریوں کی چادریں وغیرہ شامل تھیں۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو حویلی کا فرش دھونے لگی۔ بعد ازاں کچن میں چلی گئی اور کھانا پکانے میں باورچن کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اتنی دیر میں کپڑے سوکھ گئے۔ اس نے انہیں استری کر کے الماریوں میں رکھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میرے مختلف جوتے پالش کئے، میری کتابوں کو سلیقے سے لگایا اور روز مرہ استعمال کی اشیاء کو مقررہ جگہوں پر رکھا اس دوران اس نے مجھے دوبار چائے بھی بنا کر دی۔ میرے اندازے کے مطابق سات آٹھ گھنٹوں میں اس نے جتنا کام کیا وہ کوئی دوسری ملازمہ آٹھ دن میں بھی نہ کر پاتی۔ شام کو وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا اس کے گندمی رخساروں پر نقاہت کی زردی تھی لیکن آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تازہ دم ہے۔ ماماں میرے پاس آئی، کہنے لگی۔

"چھوٹے مالک، آپ ہی اسے کچھ کہیں۔ دوپہر سے گھر میں عورتیں آئی بیٹھی ہیں اور یہ گھر جانے کا نام نہیں لے رہی۔"

میں نے رابو کو پاس بلایا "جی" وہ سرہانے آکر کھڑی ہو گئی۔

"بھئی، تم گھر کیوں نہیں جاتی ہو۔ ماماں پریشان ہو رہی ہے۔ جاؤ اب گھر، بہت کام ہو چکا۔"

"بس چھوٹے مالک، ابھی جا رہی ہوں۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔"

"کیا رہ گیا ہے اب؟"

"وہ........ وہ کھانا لگا دوں آپ کے لئے۔"

"نہیں، لگ جائے گا کھانا" میں نے قدرے جھنجلا کر کہا "بہت ہیں یہاں کھانا لگانے والے۔ جاؤ اب تم۔ وہاں دوپہر سے انتظار ہو رہا ہے تمہارا۔"

میرے لہجے نے اسے ایک دم دکھی کر دیا۔ کوئی لو سی بھڑک کر اس کے رخساروں میں بجھ گئی "جی اچھا" وہ آہستگی سے بولی اور میری طرف دیکھے بغیر ماماں کے ساتھ واپس لوٹ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس کے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔ آخری وقت مجھے ایسے لہجے میں بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ کچھ دیر میں اس افسوس میں بیٹھا رہا، پھر کسی دوسرے دھیان میں لگ کر سب کچھ بھول گیا۔

O------------☆------------O

ٹھیک سات روز بعد رابو کی شادی ہو گئی۔ میں شام کے وقت فارم سے واپس آیا تو حویلی کے دروازے کے سامنے دلہا دلہن اور براتی کھڑے تھے۔ برات کی سواریاں یعنی ایک پیلی چھت والی ٹیکسی اور دو ٹریکٹر ٹرالیاں بھی پاس ہی کھڑی تھیں۔ منشی خادم حسین نے بتایا کہ یہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا "وہ کیوں؟"

منشی نے کہا "رواج کے مطابق یہ لوگ آپ کو سلام کئے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

میں ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ میں نے اس موقع سے فرار حاصل کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن پنجابی کہاوت کے مطابق "موئی ڈریا موت کولوں تے موت اگے کھڑی" آخر سامنا کرنا ہی پڑا تھا۔ جوں ہی میں اپنی ہنڈا کار سے اترا، ماماں نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں میں دوپٹا بچھا دیا۔ غالباً یہ بھی کوئی رسم تھی۔ دلہا دلہن آگے آئے اور ہندوؤں کے انداز میں پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں اس عمل سے روکا۔ وہ دونوں

سر جھکائے کھڑے رہے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں مضحکہ خیز صورت حال کا شکار ہوں۔ اپنی عمر سے قطع نظر میں حویلی کا مالک اور گاؤں کا معتبر اعلیٰ تھا۔ مجھ سے توقع کی جا رہی تھی کہ میں دلہا دلہن کے سر پر دست شفقت رکھوں۔ میں نے اس "کٹھن" ذمے داری سے کنی کتراتے ہوئے جیب سے پانچ پانچ سو کے دو نوٹ نکالے اور نوبیاہتا جوڑے کو دے دیئے۔ دلہا جو درمیانے قد کا گہرا سانولا شخص تھا اس نوازش پر فرط احترام سے دہرا ہونے لگا۔ رابو نے سر جھکا کر خاموشی سے شکریہ ادا کیا اور دلہا کے ساتھ الٹے پاؤں چل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ جب تک میں رخ پھیر کر حویلی میں داخل نہیں ہو گیا وہ لوگ وہیں کھڑے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد میں اپنے کمرے کی ایک کھڑکی سے ٹریکٹر ٹرالیوں اور ٹیکسی کو راستے کی دھول میں گم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ رابو جا چکی تھی۔

جانے کے بعد لوگ عموماً یاد آتے ہیں۔ رابو بیاہ کر پیا کے دیس چلی گئی تو دھیرے دھیرے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں نے اپنا بہت کچھ گنوا دیا ہے۔ اول اول میں سمجھا کہ یہ کیفیت عارضی ہے۔ جلد ہی میں کار دنیا میں محو ہو جاؤں گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وقت کی دھند میں رابو کا چہرہ دھندلانے کے بجائے اور نکھرتا چلا گیا۔ رابو کی شادی کے دنوں میں میرے اندر جو ایک دراڑ سی پیدا ہوئی تھی وہ اب پھیل کر ایک وسیع و عریض خلا میں بدل چکی تھی اور یہ خلا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے بہت کچھ اس خلا میں جھونکنے کی کوشش کی۔ شکار کھیلا' سیر و تفریح کی' کئی ہفتے لاہور رہ کر افروزہ کے پہلو سے لگا رہا لیکن سب بے سود رہا۔ جونہی میں حویلی میں واپس آتا در و دیوار پر رابو کی شبیہہ چسپاں نظر آتی۔ میں اس کے قدموں کی چاپ سنتا اس کی مدھم آواز راہداریوں میں گونجتی اور دو بھیدوں بھری سیاہ آنکھیں میرے ارد گرد چکرانے لگتیں۔ میں جھنجلا کر بال مٹھیوں میں جکڑ لیتا اور بڑبڑانے لگتا "کون سی حور پری تھی وہ۔ کیا رکھا تھا اس میں' کیوں یاد کرتا ہوں میں اسے' لعنت ہے مجھ پر اور میرے ذوق پر "ایسے میں' میں افروزہ کا خوشبودار جسم اپنے تصور میں بسانے کی کوشش کرتا۔ اس کی بے پناہ نفاست' ذہانت اور خوب صورتی کو ذہن میں لاتا اور سوچتا رابو کا اس سے کیا مقابلہ ہے۔ واقعی رابو کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ دونوں بالکل مختلف عورتیں تھیں۔ پھر بھی میں رابو کو یاد کر رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری دلی کیفیت ابتر ہوتی گئی۔ ایک روز رابو کے رخساروں جیسی زرد گندم کے کھیتوں میں اداس پھرتے پھرتے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں.......... رابو کے عشق میں.......... میں سر تا پا لرز گیا۔ کس

قدر شرم کی بات تھی اور کتنی توہین آمیز۔ میں جو معمولی نسل کا جانور نہیں خریدتا تھا۔ کم ذات شخص سے بات نہیں کرتا تھا' ایک قطعی معمولی لڑکی سے عشق کر رہا تھا۔ حماقت سی حماقت تھی' بلکہ حماقتوں کا سلسلہ تھا۔ بہتر تو یہی تھا کہ رابو جیسی لڑکی کو نگاہ میں جگہ ہی نہ دی جاتی اور اگر جگہ دے دی تھی تو پھر اس سے اتنا قریب نہ ہوا جاتا۔ میں نہ صرف قریب ہوا تھا بلکہ حتمی قربت کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ کوئی دیکھنے یا ٹوکنے والا نہیں تھا۔ وہ انگارہ جو آج شعلے کی طرح بھڑک رہا تھا۔ میرے کمرے میں یا حویلی کے کسی گوشے میں باآسانی بجھایا جا سکتا تھا۔ اس پر اتنا پانی پھینکا جا سکتا تھا کہ وہ غتربود ہو جاتا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو رابو سے شادی کی جا سکتی تھی۔ وہ جیسی بھی تھی کسی کو اعتراض کا کیا حق تھا' بدصورت تو نہیں تھی۔ پڑھی لکھی بھی تھی' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اندر ایک پجارن بیٹھی تھی جو اپنے اشکوں سے میرے پاؤں دھو دھو پینا چاہتی تھی۔ اب آخری حماقت میں یہ کر رہا تھا کہ اس وقت جب سب کچھ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں اپنی آہوں سے محبت کے بھڑکتے شعلے کو دن رات ہوا دے رہا تھا۔

شادی کے بعد تین چار ماہ تک رابو مجھے بالکل نظر نہیں آئی۔ پھر ایک روز وہ یوں نمودار ہوئی جیسے اچانک بادل پھٹ جائیں اور سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگے۔ میں گاؤں سے باہر اپنے فارم پر بیٹھا تھا کہ ماماں سلیپر چڑ چڑ بجاتی وہاں پہنچی اور بولی "چھوٹے مالک! رابو اپنے خاوند کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔"

سینے میں بپا ہونے والے زلزلے کو میں نے بمشکل چہرے تک آنے سے روکا "کک.......... کہاں ہے وہ؟"

"دونوں باہر کھڑے ہیں۔ کہتی ہے' پہلے مالک سے اجازت لے آؤ۔"

پہلے تو جی میں آئی کہ فوراً اندر بلا لوں لیکن پھر تحمل سے کام لیا۔ اپنی لرزاں آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا "دیکھ نہیں رہی ہو کام کر رہا ہوں۔ شام کو حویلی میں آ جانا۔"

یہ بات میں نے اس لئے کہی تھی کہ یہاں میرے علاوہ دو تین کارندے بھی موجود تھے اور میں کسی کے سامنے رابو کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ماماں چلی گئی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ رابو کیا کہنا چاہتی ہے.......... شام سے ایک گھنٹا پہلے ہی میں حویلی پہنچ گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا ہی تھا کہ رابو کی صورت نظر آئی۔ خاوند اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ دونوں اجازت لے کر اندر آ گئے۔ رابو نے گلابی پھولدار سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر

اسی رنگ کی موٹی اوڑھنی تھی۔ خاوند عام دیساتی لباس میں تھا۔ وہ پہلے کی طرح میلا کچیلا نظر آرہا تھا۔ جب کہ رابو پہلے سے زیادہ نکھری ہوئی تھی۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور کانوں میں جھمکے تھے۔ اسے دیکھ کر دل میں درد کی لہر اٹھی۔ میں نظریں ہٹا کر اس کے شوہر کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں خاموش کھڑے تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کی ہدایت کی۔ وہ جھجکتے ہوئے صوفے پر ٹک گئے۔ ایک دو رسمی باتوں کے بعد میں نے دارا سے پوچھا۔

"ہاں بھئی! کیا بات ہے؟ ماماں کہہ رہی تھی' کوئی مسئلہ ہے تمہارا؟"

"نہیں چھوٹے سرکار! مسئلہ تو کوئی نہیں۔ صرف ایک درخواست کرنا تھی آپ سے۔"

"ہاں ہاں' کہو۔"

دارا نے رابو کو ٹھوکا دیا کہ وہ بات کرے۔ رابو نے جوابی ٹھوکا اسے دیا۔ وہ بتیسی نکال کر عاجزی سے بولا "چھوٹے سرکار ادھر ہری پور میں' میں نے چھوٹا سا کھوکھا ڈال رکھا تھا۔ اور بھی کئی لوگ وہاں ٹوکریاں بیچ کر روجی کما رہے تھے۔ ت باجاری والوں نے سب کو مار بھگایا ہے۔ اوپر سے کام بھی بڑا مندا ہو گیا ہے.......... اگر آپ کے پاس میرا مطبل ہے' فارم وغیرہ میں کہیں گنجائش ہو تو مجھے رکھ لیں۔ رابو آپ کی کھدمت کر لیا کرے گی۔ ہم دونوں کی دال روٹی چلتی رہے گی۔"

میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ سوچا بھی نہ تھا کہ رابو جو اتنی دور چلی گئی ہے' ایک دم اس قدر قریب آجائے گی۔ ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ فوراً ہامی بھر لوں اور دونوں سے کہوں کہ کام پر آجایا کریں.......... لیکن پھر وہی ناقابل عبور دیوار سامنے آئی۔ ہمالیہ سے اونچی اور خیالوں سے طویل۔ میرے اندر سے کسی نے کہا۔ "جہانداد! اپنے عذاب میں سختی کا اہتمام مت کرو۔ تم آگ میں جل رہے ہو اور رابو کی موجودگی اس جلتی پر تیل ڈال دے گی۔ تم بھسم ہو جاؤ گے یا ہمالیہ سے اونچی دیوار خاکستر ہو جائے گی" دارا کی امید بھری نگاہیں میرے چہرے کی کشمکش پڑھ رہی تھیں۔ رابو بھی گم صم دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ دارا کی کیا مجال تھی کہ اس چہرے کے پیچھے جھانک سکتا۔ وہ کہانی پڑھ سکتا جو اس کمرے کے گوشوں میں لکھی گئی تھی اور رابو کے سینے میں محفوظ تھی۔ آخر میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے دارا' کل تم فارم پر آجانا' میں دیکھوں گا' تم کون سا کام کر سکتے ہو۔ لیکن.......... رابو کی جگہ تو میرا منشی پہلے ہی دو عورتیں رکھ چکا ہے۔"

دارا کے چہرے پر مایوسی جھلکی۔ میں نے کہا "بہرحال تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ محنت کرو گے تو فارم سے اچھی خاصی اجرت مل جایا کرے گی۔"

دونوں ایک ساتھ مجھے سلام کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے رابو سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن بھول ہی گیا کہ کیا پوچھنا تھا۔ بس ہونٹ کھول کر رہ گیا۔ چند لمحے کمرے میں بے ڈھنگی سی خاموشی طاری رہی پھر دونوں نے جھک کر سلام کیا اور الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گئے۔

اگلے روز سے دارا نے فارم پر آنا شروع کر دیا۔ وہ کوتاہ قد لیکن مضبوط جسم کا جوان تھا۔ بڑی جانفشانی سے کام کرتا تھا۔ اس کا دادا بھی ہماری حویلی میں کام کر چکا تھا۔ دارا کو اس بات پر فخر تھا کہ اس کے دادا کی ٹانگ میرے والد کو بچاتے ہوئے کٹی تھی۔ میرے والد چار پانچ برس کے تھے۔ حویلی کے سامنے کھیل رہے تھے کہ ایک دودھ فروش کا ریڑھا بے قابو ہو کر دوڑتا ہوا آیا۔ میرے والد کو ریڑھے کی زد سے بچانے کے لئے بوڑھے ملازم نے بے دریغ ریڑھے کے آگے چھلانگ لگا دی۔ نتیجے میں اس کی ٹانگ دو جگہ سے ٹوٹ گئی اور بعد میں کاٹنا پڑی۔ اس قسم کے اور بھی واقعات دارا سناتا رہتا تھا' اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ایک روز بہت لج لجا کر اس نے مجھ سے پچاس روپے ایڈوانس مانگے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ گھر والی کو میلہ دکھانے لے جانا ہے' میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ دلی کیفیت کو چھپا کر میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا "لگتا ہے بہت نخرے اٹھاتے ہو بیوی کے۔"

"وہ بھی تو میرا بہت دھیان رکھتی ہے جی" دارا نے ترت جواب دیا "میرے پسینے پر کھون گراتی ہے۔ پچھلے جے مجھے بکھار ہوا تھا۔ ساری رات میرے سرہانے بیٹھی سر دباتی رہی۔"

دارا بے خبری میں میرے دل پر چرکے لگا رہا تھا۔ میں نے اس تذکرے کو ختم کرنے کے لئے پچاس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور وہ چلا گیا۔ میں گہری ہوتی شام میں اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ ہری فصلوں کے درمیان خاکستری راستے پر وہ اینٹھ اینٹھ کر چل رہا تھا جیسے دنیا جہان کے خزانوں کا مالک وہی ہو اور ایسا غلط بھی کیا تھا۔ رابو اس کے گھر میں تھی۔ وہ رابو جو معمولی ہو کر بھی ایک غیر معمولی لڑکی تھی۔ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی سونے کی ڈلی.......... اور دارا روز شام کو اس وقت اسی ڈلی کو دریافت کرنے جاتا تھا۔ کتنا خوش نصیب تھا وہ۔ آسمان پر گہرے اودھے بادل چھا ہے تھے۔ ٹھنڈے ہوا

کے ساتھ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ ساون کی ایسی راتوں میں جوان دل رم جھم کی لے پر دھڑکتے ہیں۔ ہر جگہ جل تھل ہو جاتا ہے' جہاں بارش گرتی ہے وہاں بھی اور جہاں نہیں گرتی وہاں بھی۔ دارا اس بارش سے سیراب ہونے کے لئے اپنی کٹیا میں جا رہا تھا اور میں اس بارش میں جلنے کے لئے اپنی عالی شان حویلی کا رخ کر رہا تھا۔ برسات کی ایک ہی رات کتنی مختلف تھی ہم دونوں کے لئے۔

اس رات بارش شروع ہوئی تو مسلسل دو روز ہوتی رہی۔ تیسرے روز بھی یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ بادل گھر گھر کر آتے رہے اور اپنے جھول خالی کر کے نامعلوم سمتوں میں روانہ ہوتے رہے۔ تیسرے روز میں فارم میں بیٹھا تھا کہ علاقے کا ایک بیلدار بہت گھبرایا ہوا میرے پاس پہنچا۔ اس نے بتایا کہ بڑی نہر کی پٹڑی میں اوپر کی طرف دراڑیں آگئی ہیں اور وہ کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے۔ یہ بڑی روح فرسا خبر تھی۔ ہمارا گاؤں نشیب میں تھا۔ جب کبھی پٹڑی ٹوٹتی تھی' پورا گاؤں چھ چھ فٹ پانی میں ڈوب جاتا تھا۔ اس دوران دو تین اور افراد فارم پہنچے اور انہوں نے بھی یہی اطلاع دی۔ اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے فارم کی طرف سے تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پولٹری فارم کا چارج سنبھالتے ہی میں نے سب سے پہلے سیلابی ریلے کا انتظام کیا تھا۔ جہاں تک ہماری حویلی کا تعلق ہے وہ بھی خاصی بلندی پر تھی۔ پچھلے پچاس برسوں میں کبھی سیلاب کا پانی وہاں تک نہیں پہنچ سکا تھا لیکن اہل دیہہ کی جان تو عذاب میں آنے والی تھی۔ فارم میں کچھ ضروری انتظامات کرنے کے بعد میں خود بھی گاؤں کی طرف لپکا۔ سوزوکی جیپ میرے پاس موجود تھی لیکن ان حالات میں اسے فارم سے نکالنا ٹھیک نہیں تھا بوندا باندی میں' میں پیدل ہی گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ دارا اور رابو کا خیال آیا۔ ان کا نیم پختہ گھر گاؤں سے باہر تھا۔ یہ دراصل ایک ڈسپنسری تھی جو عرصے سے خالی پڑی تھی۔ میں نے پٹواری سے کہہ کر یہ جگہ دارا کو دلوا دی تھی۔ میں نے سوچا کہ ریلا آیا تو سب سے پہلے دارا کا گھر ڈوبے گا' لہٰذا اسے اطلاع دینا ضروری تھا۔ میرے قدم خود بخود اس کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ بارش اب تیز ہو چکی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو دارا کی جگہ رابو باہر نکلی۔ وہ غالباً چھت پر مٹی وغیرہ ڈال رہی تھی۔ اس کے ہاتھ گارے میں لتھڑے ہوئے تھے۔ باریک کپڑے بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے۔ میں اس دلچسپ منظر کو دیکھتا رہ گیا۔ "دارا کہاں ہے" چند لمحے بعد پھنسی پھنسی آواز میرے ہونٹوں سے نکلی۔

"وہ تو شہر گیا ہے۔ کل چھٹی ہے ناں۔ کہتا تھا ضروری کام ہے' دوپہر کو آجاؤں

گا...... آپ...... آپ اندر آجایئے ناں۔"

اندر تو میں آہی چکا تھا۔ اب تیز بارش سے بچنے کے لئے چھپر تلے آکھڑا ہوا۔ یہاں رابو جیسی کالی آنکھوں والی ایک بچھڑی بھی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے رابو کے بدن سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا "تت...... تو تم رات بھر اکیلی رہو گی۔"

وہ بولی "نہیں۔ دارا' ماسی حنیفاں (ماماں) سے کہہ گیا تھا وہ آتی ہی ہو گی۔ شاید تیز بارش کی وجہ سے رک گئی ہے۔"

زوروں سے برستی بارش' گرجتے بادل' تڑپتی بجلی اور ایک تن تنہا چار دیواری میں بھیگا ہوا ایک شعلہ میرے روبرو تھا۔ یکایک میرے سینے میں کوئی گٹھڑی سی کھلی اور اس میں بندھی ہوئی کوئی شے بکھرتی اور پھیلتی چلی گئی۔ میں نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ رابو نے کمزور آواز میں کہا "چھوٹے مالک! اندر آجایئے۔ آپ بھیگ رہے ہیں۔"

میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ میرے سینے میں کھلنے والی گٹھڑی سے آگاہ ہو گئی۔ میں ان آنکھوں' ان لبوں کو اور سانس کے اس زیروبم کو پہچانتا تھا۔ کسی دھاگے سے بندھا میں اندر کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ بادلوں نے شام سے پہلے ہی شام کر رکھی تھی اور کمرے میں یہ شام زیادہ گہری تھی۔ میں نے رابو کو روبرو دیکھا اور دفعتاً میرے ہاتھ اس کی طرف بڑھ گئے۔ وہ ذرا سا کسمائی اور پھر میرے سینے پر ڈھے گئی۔ نجانے کتنی ہی دیر ہم اسی طرح کھڑے رہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر' گرم سانسوں میں ڈوبتے ابھرتے رہے۔ لمس کی زبان ہمارا ذریعہ اظہار تھی۔ ہاں ان لمحوں میں مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں کہ یہ کتنے لمحے تھے۔ شاید تین چار منٹ' شاید اس سے بھی زیادہ' وہ سرتاپا میرے سپرد تھی۔ کھلی کتاب کی مانند جو تیز ہوا کے دوش پر رکھی تھی اور اپنے ورق خود بخود الٹ رہی تھی۔ چاہ رہی تھی کہ اسے ہر جگہ سے پڑھا جائے۔ لیکن یہ آمادگی ایسی نہیں تھی کہ بری لگتی یا شوق میں رتی بھر بھی کمی کرتی۔ دفعتاً بیرونی دروازے کے عین سامنے آہٹ سنائی دی۔ کوئی پانی میں چپاچپ چلا آرہا تھا۔ وہ تڑپ کر دور ہو گئی۔ میرے ذہن میں آیا شاید ماماں پہنچ گئی ہے لیکن صورت حال کہیں زیادہ تشویشناک نکلی۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور دارا اندر آگیا۔ چھپر تلے ٹھہر کر اس نے سر سے بھیگی چادر اتاری اور اسے زور زور سے جھاڑ کر بولا "رابو...... او رابو۔"

رابو نے ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری سانس خود بھی گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ یہ بڑے سنگین لمحے تھے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو کر رہ گئی

تھی۔ میری فوری خواہش یہ تھی کہ دارا کی نظروں سے بچا جائے۔ ساتھ والی کوٹھری میں ایک قد آدم الماری اس مقصد کے لئے موزوں نظر آئی۔ رابو کی نگاہ بھی اسی پر ٹکی تھی۔ میں جلدی سے اس چوبی الماری اور دیوار کے درمیانی خلا میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد دارا کھانستا اور رابو کو پکارتا ہوا اندر آگیا۔ رابو کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اس کی لرزاں آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"آپ تو شہر گئے تھے؟"

دارا نے تیزی سے کہا "بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے رابو۔ میرا کھیال ہے جلدی سے حویلی کی طرف نکل چلیں۔"

"کیوں۔ کیا ہوا ہے؟"

"سیلاب آرہا ہے پگلی۔ چھوٹی نہر ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی بھی جانے والی ہے۔ میں کھود دیکھ کر آیا ہوں۔ پٹڑی کا برا حال ہے۔ مشکل سے ایک آدھ گھنٹا نکلے گا۔"

رابو کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ یہاں آنے کے بعد کس طرح سیلاب کا خیال میرے دماغ سے نکلا اور جذبات کا سیلاب مجھے بہا لے گیا............ رابو نے غالباً سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا "اب کیا ہو گا؟"

دارا کی آواز آئی "تم جروری سامان باندھ لو۔ میں حویلی سے سن گن لے کر آتا ہوں۔"

وہ اچھا بھلا دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر دل میں نجانے کیا آئی کہ واپس الماری کی طرف آیا۔ اس نے الماری کے پیچھے جھانکا اور اپنی لاٹھی کھینچنے لگا۔ لاٹھی کیسے نکلتی۔ وہ تو میری کمر اور دیوار کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے حیرت سے سر اٹھایا۔ میری اور اس کی نگاہیں ٹکرائیں۔ وہ سکتے میں رہ گیا۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں کی دہشت اور حیرت میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ پھر اس کے لب تھرائے۔

"چھو............ ٹے............ مالک" ایک سیکنڈ کے اندر اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ اس نے مڑ کر بیوی کی طرف دیکھا۔ پھر مڑ کر میری آنکھوں میں جھانکا' اور تب جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ایک دو سیکنڈ کے اندر اس کا ذہن دور دور کی خاک چھان چکا تھا۔ قیامت کے لمحے تھے۔ میں بہ آہستگی الماری کی اوٹ سے نکلا۔ اس وقت تک دارا صحن پھلانگ کر بیرونی دروازے میں پہنچ چکا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ باہر نکل گیا۔ میں اور رابو ساکت کھڑے تھے۔ دو ایسی مورتیوں کی طرح جن کے قدم زمین پر گڑے

ہوں اور بے جان ہونے کے باوجود وہ ایستادہ ہوں۔ عقل منجمد اور زبانیں گنگ تھیں۔

"میں نے چھپنے کی حماقت کیوں کی؟" پچھتاوے کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ صورت حال سنگین ضرور تھی لیکن ٹھنڈے دماغ سے سوچا جاتا تو ایسی سنگین بھی نہیں تھی۔ میں کمرے میں اپنی موجودگی کے لئے کوئی مناسب بہانہ بنا سکتا تھا۔ یہ میرے خیال کا چور تھا جس نے میرے پاؤں تلے سے زمین نکالی۔ آخر میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"یہ اچھا نہیں ہوا رابو۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"وہ............ وہ کہاں گیا ہے؟" رابو نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم؟"

"کہیں وہ آپ کو............ مم............ میرا مطلب ہے' آپ یہاں سے چلے جائیے۔"

"نہیں۔ میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اگر مجھے اس سے خطرہ ہے تو تمہیں زیادہ ہے۔"

"میری کوئی بات نہیں مالک............ آپ جائیے وہ............ وہ ایسا تو نہیں ہے۔ پر کہیں غصے میں نہ آجائے۔"

"غصے میں آیا تو اپنا نقصان کرے گا" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ شاید اس طرح میں الماری کے عقب میں پکڑے جانے کا غم غلط کرنا چاہتا تھا۔

رابو بے قراری سے بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ کھلا تھا اور اس میں سے دور تک کھیتوں کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور بارش میں بھیگتی واپس برآمدے میں آگئی "اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟" میں اپنے ذہن سے بار بار یہ سوال پوچھ رہا تھا' لیکن اس سوال کا جواب دارا کے رد عمل سے مشروط تھا' اور دارے کا رد عمل کیا ہو گا' فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ رابو خاموش کھڑی تھی جیسے سوچنے کا سارا کام اس نے مجھے سونپ دیا ہو اور اب ایک کٹھ پتلی کی طرح میرے اشاروں کی منتظر ہو۔ ابھی میں اسی جان لیوا کشمکش میں مبتلا تھا کہ ایک مانوس شور سنائی دیا۔ میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جان گیا کہ یہ پانی کا شور ہے۔ پٹڑی ٹوٹ چکی تھی۔ میں اور رابو بھاگتے ہوئے دروازے پر آئے۔ قریباً نصف فرلانگ دور سرخی مائل پانی کا چار فٹ اونچا ریلا چارے کے کھیتوں کو نگلتا چلا آرہا تھا۔ یہ ایک سنسنی خیز منظر تھا۔ نشیب و فراز کو ایک کرتا'

اچھلتا کودتا پانی' عجیب پھنکار کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے بیرونی دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔ پھر ہم دونوں بھاگتے ہوئے کمرے میں پہنچے۔ رابو نے جلدی سے جستی پیٹی کھولی اور اس میں سے زیادہ ضروری اشیاء نکال کر باہر رکھنے لگی۔ ریڈیو' بجلی کی استری' ہیٹر' تھوڑی سی نقدی شادی کے دو تین گہنے' دو تین جوڑے کپڑوں کے۔ میں نے یہ ساری چیزیں پوٹلی کی صورت میں بستر کی چادر میں باندھیں اور انہیں بالائی منزل کے اکلوتے کمرے میں پہنچا دیا۔ سیلاب کا پانی اس دوران دروازے پر دستک دینے لگا تھا۔ لکڑی کی درزوں سے پانی کے فوارے نمودار ہو رہے تھے۔ رابو نے حتی الامکان تیزی سے چند لحاف بالائی کمرے میں پہنچائے۔ جب کہ میں ایک پیڈسٹل فین کندھے پر دھر کر اوپر چھوڑ آیا۔ یکایک مکان کی کچی چار دیواری کا ایک حصہ دھڑام سے صحن میں آگرا اور پانی کا پر شور ریلا اندر گھسنے لگا۔ اب چھپر تلے بندھی "بچھڑی" کے سوا کوئی اور چیز محفوظ کرنے والی نہیں تھی۔ میں نے بچھڑی کو کھولا اور ہم دونوں مل کر اسے سیڑھیاں چڑھانے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ بچھڑی بد کی ہوئی تھی کچھ سیڑھیوں پر پھسلن تھی' ہماری یہ کوشش قطعی ناکام رہی............ آخر ہم اسے پانی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اوپر آ گئے۔ منہ زور پانی نے آناً فاناً مکان پر قبضہ کر لیا۔ دونوں نچلے کمرے قریباً نو فٹ تک پانی میں ڈوب گئے۔

وہ میری زندگی کی عجیب و غریب رات تھی' گاؤں کی اصل آبادی سے تین چار فرلانگ کی دوری پر ایک تنہا مکان میں رابو اور میں محصور تھے۔ ہمارے چاروں طرف سیلاب کا ٹھاٹھیں مارتا پانی تھا۔ اس پر تیرتی ہوئی اشیاء کے ناقابل شناخت ہیولے تھے' اور یہ خوف تھا کہ کسی بھی وقت یہ مچان نما چوبارہ ہمارے قدموں کے نیچے سے نکل جائے گا۔ دور و نزدیک کسی متنفس کے آثار نہیں تھے۔ لوگ اپنے گھروں میں محصور ہو چکے تھے یا گاؤں چھوڑ کر اونچی جگہوں کی طرف چلے گئے تھے۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا ہماری حویلی میں پناہ گزینوں کا ہجوم ہے۔ پچھلے صحن میں لوگ سائبان تان رہے ہیں۔ مرد و زن ایک دوجے پر چیخ رہے ہیں۔ بچے چلا رہے ہیں۔ حسب معمول میرے منشی کی ہدایت پر دال گوشت کی دیگیں چڑھا دی گئی ہیں اور لنگر کا انتظام ہو رہا ہے۔ یقینی طور پر میری کمی بھی محسوس کی جا رہی ہو گی لیکن کسی کے ذہن میں یہ آ ہی نہیں سکتا تھا کہ میں اس طرح ایک معمولی کامے کے معمولی مکان میں گھرا ہوا ہوں۔ ملازمین نے پہلے تو یہی سمجھا ہو گا کہ کسی فارم میں رک گیا ہوں اور جب فارم میں نہ پایا ہو گا تو سوچنے لگے ہوں گے کہ میں

قریبی گاؤں حیات پور کی طرف نکل گیا ہوں۔ وہاں کے چودھری ملک حیات کا بیٹا میرا گہرا دوست بن گیا تھا اور میں تفریح طبع کے لئے اکثر جمعرات کی شب ان کے ہاں چلا جاتا تھا............ شاید پر خطر حالات کے باوجود میں موجود صورت حال سے لطف اندوز ہوتا کیوں کہ وہ عورت میرے ساتھ تھی جو میرے دل کا روگ بنی ہوئی تھی لیکن اس صورت حال سے پیشتر جو کچھ ہو چکا تھا وہ میرے اور رابو کے ذہن میں آہنی میخ کی طرح گڑا ہوا تھا۔ دارا ہمارے بارے میں جان چکا تھا۔ وہ رابو کا شوہر تھا اور کچھ بھی کر سکتا تھا۔ فوری طور پر تو وہ بھونچکا رہ گیا تھا اور کچھ بھی کہے سنے بغیر یہاں سے نکل گیا تھا لیکن اسے کوئی رد عمل تو ظاہر کرنا ہی تھا۔

رابو کو مجھ سے زیادہ تشویش ہونی چاہئے تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ نسبتاً کم پریشان ہے۔ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے گیلے کپڑے بدل لئے اور پھر کسی نہ کسی طرح لالٹین بھی روشن کر لی۔ کمرے میں ایک کہنہ سال کرسی کا ملبہ پڑا تھا۔ اس نے یہ لکڑیاں ایک کونے میں جمع کر کے آگ جلا دی۔ پھر سر جھکائے جھکائے بولی۔

"مالک! قمیض اتار دیجئے............ میں سکھا دوں۔"

میں نے قمیض اتار دی۔ اس نے نچوڑ کر گھٹنوں پر پھیلا لی اور آگ کے قریب بیٹھ گئی۔ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ جی چاہا وقت تھم جائے اور میں سب تفکرات بھول کر اسے دیکھتا جاؤں لیکن نہ وقت تھمتا ہے اور نہ اس کے پیدا کردہ مسائل مہلت دیتے ہیں۔ دارا کے خیال نے ایک بار پھر میرے ذہن میں پنجے گاڑ دیے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں اس وقت بالکل نہتا تھا' جب کہ دارا کے پاس ایک پکی رائفل تھی جو اس نے کسی کباڑیے سے خرید کر ٹھیک کرائی تھی اور فارم میں رکھی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسی رائفل سے یا کسی اور اسلحے سے مسلح ہو کر یہاں آ جاتا تو میں بے بس تھا۔ وہ مجھے یا ہم دونوں کو مار کر لاشیں غائب کر سکتا تھا۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ ہمارا قاتل "پانی" نہیں دارا کا غضب ہے۔

گاؤں کے اور ہمارے درمیان درختوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ حائل تھا۔ رات کے بارہ بجے تک کہیں نہ روشنی دکھائی دی اور نہ کوئی ہماری مدد کو پہنچا۔ پریشانی کے باوجود بھوک بھی اپنا کام دکھا رہی تھی۔ گھر میں اگر خورد و نوش کی کوئی چیز تھی تو وہ نچلے کمروں میں غرقاب ہو چکی تھی۔ اب ہم بالکل تہی دست تھے۔ رابو کا چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ اس بات پر شرمندہ ہے کہ میرے لئے کچھ کھانے کو فراہم نہیں کر سکتی۔ میں حیران تھا

کہ وہ میرے ہاتھوں اتنا کچھ کھو کر بھی کھانا فراہم نہ کر سکنے پر پشیمان ہے.......... اس وقت قریباً ڈیڑھ بجا تھا جب اچانک مجھے کسی کے تیرنے کی آواز آئی۔ ادھ کھلی کھڑکی سے گردن نکال کر میں نے بغور آواز کی سمت دیکھا۔ بدلیوں کی اوٹ سے پچھلی راتوں کا چاند نکل آیا تھا۔ اس کی مدہم روشنی سیلابی پانی پر چھوٹے چھوٹے ستارے بکھیر رہی تھی۔ ان ستاروں کے درمیان ایک شخص بغلوں کے نیچے کار یا ٹرک کی ہوا بھری ٹیوب دبائے ہماری طرف تیرتا چلا آرہا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ پانی میں زیادہ آواز پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے گردن اندر کرلی اور کھڑکی کے خلا میں سے آنے والے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ قریب پہنچا تو میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ وہ دارا ہی تھا۔ اب میں اس کے کندھے پر افقی رخ سے ٹکی ہوئی رائفل صاف دیکھ سکتا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے رابو کی طرف دیکھا۔ وہ ادھ بجھے کوئلوں کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ جیسے چھٹی حس نے اسے میرے احساسات سے آگاہ کر دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"دارا آیا ہے!" میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کے خلا میں سے باہر دیکھنے لگی۔ دارا اب بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ تیرتا مکان کے سیدھے رخ پر آگیا تھا۔ میں نے دوسری کھڑکی کے پٹ وا کئے اور دیکھنے لگا۔ دارا بڑی خاموشی کے ساتھ گری ہوئی چار دیواری میں سے راستہ بناتا ہوا صحن میں آگیا۔ بچھڑی مرچکی تھی۔ اس کی تیرتی ہوئی لاش کے پاس سے گزر کر وہ زینے پر پہنچ گیا۔ میرے اعصاب پوری طرح تن گئے۔ شاید فیصلہ کن مرحلہ آگیا تھا۔ وہی لاٹھی جو دارا الماری کے پیچھے چھوڑ گیا تھا' اس وقت میرے ہاتھ میں تھی۔ میں بہ آہستگی چلتا ہوا چوبارے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ کان سیڑھیوں پر لگے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے دارا نے پختہ سیڑھیوں پر دھات کی کوئی چیز رکھی ہے۔ شاید کوئی برتن وغیرہ تھا۔ اس کے بعد دارا کی آواز آئی۔ اس نے جو کچھ کہا وہ مجھے سکتے میں ڈال گیا۔ ایک ہی لمحے میں دل و دماغ تہ و بالا ہو گئے اور میں کسی گونگے بہرے شخص کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ کسی گھن گرج یا للکارے کے بجائے سیڑھیوں سے دارا کی نحیف آواز ابھری تھی۔

"رابو.......... روٹی لے جا۔"

یہ فقرہ دوبار دہرایا گیا۔ پھر شپ شپ کی آواز آئی اور دارا ٹیوب کے سہارے

تیرتا ہوا واپس چلا گیا۔ رابو سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو میں نے اسے شانے سے تھام لیا۔ یہ دارا کی کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ کھڑکی وا کر کے میں نے دیکھا۔ دارا چار دیواری سے نکل کر واپس جا رہا تھا۔ وہ کافی دور چلا گیا تو رابو نے پوچھا "جاؤں.......... چھوٹے مالک!"

"نہیں۔ میں خود جاتا ہوں" میں نے کہا اور دروازہ کھول کر سیڑھیوں پر آگیا۔ یہاں ایک چمکدار ٹفن پڑا تھا' اسے اٹھاتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس میں دو افراد کا کھانا ہے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں لیکن رابو کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ دارا کو یہی کرنا چاہئے تھا جو اس نے کیا ہے۔

○------------☆------------○

اگلے روز علی الصباح پانی دو تین فٹ نیچے چلا گیا۔ میں موقع دیکھ کر دارا کے گھر سے نکلا اور کبھی تیرتا کبھی چلتا ہوا حویلی واپس پہنچ گیا۔ میری غیر حاضری نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ سیلاب زدہ لوگوں کو میری ضرورت ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ میں شام تک مختلف امور انجام دینے میں لگا رہا لیکن جب رات گئے فراغت میسر آئی اور میں بستر پر لیٹا تو کل شب کے واقعات فلم کی طرح دماغ میں چلنے لگے۔ لگتا تھا رب نواز کے خانوادے نے ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنے کے لئے مجھے چن لیا ہے۔ رابو کے بعد اب دارا کا فدویانہ کردار سامنے آیا تھا۔ سوچتے سوچتے مجھے شک ہونے لگا کہ کہیں یہ میرے اعصاب پر مسلط ہونے کی کوئی سازش تو نہیں۔ مال و دولت کے لئے ابن آدم اور بنت حوا کچھ بھی کر گزرتے ہیں لیکن جب رابو کا سراپا میرے ذہن میں آیا تو یہ سوچ بے معنی محسوس ہونے لگی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے لئے میرے دل کی تڑپ ہی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔

چند روز بعد پانی اتر گیا تو گاؤں میں روز مرہ کے معمولات پھر شروع ہو گئے۔ میں بھی ایک چکیلی صبح کو فارم میں پہنچا۔ میری توقع کے مطابق دارا کام پر موجود تھا۔ میں سارا دن گاہے گاہے چور نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی چہرے پر یا رویے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے سرے سے کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔ یہ صورت حال میرے لئے خوش گوار تھی.......... تین چار دن کے بعد ایک صبح دارا کام پر نہیں آیا۔ میں نے اس کے گھر سے پتا کرایا تو معلوم ہوا کہ بخار ہے۔ اگلے روز دارا کی جگہ رابو کام پر آگئی۔ میں اسے دیکھ کر جہاں حیران ہوا وہاں غصہ بھی آیا۔ میں نے اپنی کیفیت کو چھپاتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیوں چلی آئی ہے۔ وہ بولی۔

"مالک.......دارا نے کہا تھا۔ وہ ذرا بیمار ہے نا۔"

فارم میں ایک دو عورتیں بھی کام کرتی تھیں لیکن نجانے کیوں مجھے رابو کا آنا اچھا نہیں لگا۔ میرے خیال میں اس کی جگہ مرغیوں کے بدبودار ڈربوں کے پاس نہیں، میری معطر آغوش میں تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے واپس بھیج دوں لیکن پھر اس خیال سے کہ وہ آنکھوں کے سامنے تو رہے گی میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ روزانہ کام پر آنے لگی۔ اپنی سیاہ آنکھوں میں بھید چھپائے اور بوسیدہ کپڑوں میں میری جان سمیٹے۔ میں نے اپنے آفس کے قریب ہی اسے نسبتاً صاف ستھرا کام دے رکھا تھا۔ ایک روز اکیلے میں، میں نے اس سے پوچھا۔

"دارا نے کچھ کہا تو نہیں تھا؟"

"جی نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تمہارے ساتھ خوش ہے؟"

وہ چپ ہو گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ باہمی تعلقات میں رخنہ پیدا ہو چکا ہے۔ تاہم اس رخنے کے حوالے سے کوئی افسردگی رابو کے چہرے پر دکھائی نہیں دی۔ وہی گھونگھٹ، وہی کیموفلاج، وہی اسموک اسکرین، چہرہ گونگا تھا۔ وہ باہر چلی گئی تو میں سوچنے لگا۔ دارا کیا چاہتا ہے۔ وہ سچ مچ بیمار ہے یا اپنی سمجھ اور نظریے کے مطابق "حق نمک" ادا کر رہا ہے........ کیا وہ مجھے اور رابو کو کھل کھیلنے کی اجازت دے رہا ہے؟" میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ پھر سات آٹھ روز کے بعد دارا نظر آیا۔ اس کا رویہ معمول کے مطابق تھا۔ وہی خدمت، وہی نیاز مندی اور توقیر۔ شام کے وقت مجھ سے کہنے لگا کہ اسے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔ میں نے پوچھا کتنے۔ اس نے صرف چار سو روپے مانگے۔ میں نے دے دیئے۔ دوسرے دن رابو کی زبانی پتا چلا کہ دارا کراچی چلا گیا ہے، وہاں کوئی کام ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ دارا کا جانا مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ وہ مجھے بتائے بغیر خاموشی سے نکل گیا تھا۔ اور رابو سے بھی اس نے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کی تھی۔ ایک طرح سے وہ میرے لئے میدان کھلا چھوڑ گیا تھا۔ ایک بار پھر میں اس "پوزیشن" میں تھا کہ دل کے ارمان نکال سکتا تھا۔ رابو کے حوالے سے اپنی ہر حسرت پوری کر سکتا تھا، لیکن ایسا کرنا ہوتا یا میں کر سکتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا۔ اپنی مقرر کردہ حدود کو توڑنا میرے بس میں نہیں تھا۔ بڑی سیدھی سی بات تھی، میں شادی کے بغیر رابو کو بیوی نہیں بنا سکتا تھا۔ میرے لئے اب ضروری تھا کہ کسی آخری فیصلے پر پہنچ جاؤں۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ میں رابو کے بغیر زندگی گزار سکتا ہوں یا نہیں۔ اور اگر نہیں گزار سکتا تو رابو کے لئے کیا کچھ قربان کر سکتا ہوں۔ اور اگر صورت حال برعکس ہے تو مجھے فوری طور پر کیا قدم اٹھانا چاہئے۔

بہت دن تک ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر وہی نتیجہ اخذ کیا جو پہلے کر چکا تھا۔ رابو کو شریک حیات بنانا میرے لئے ممکن نہیں تھا اور اب تو یہ کام یوں اور بھی مشکل ہو چکا تھا کہ وہ کسی کی منکوحہ تھی۔ ایک تعلق بنانے کے لئے دوسرا تعلق توڑنے کی مجھ میں ہمت تھی اور نہ میں اس حد تک گرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اندیشوں کے دیو ناچ رہے تھے۔ رابو کے جوبن کی ننگی تلوار ہروقت میرے سر پر لٹک رہی تھی۔ آگ اور بارود کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جیسے اس روز سیلاب سے پہلے ایک سیلاب آیا تھا........ ایسے نادیدہ سیلاب کا رخ موڑنے کے لئے ضروری تھا کہ میں ناقابل بھروسا پانیوں پر ازدواجی رشتے کا بند باندھ دوں........ شادی کے حوالے سے میرے دھیان میں صرف ایک ہی صورت آسکتی تھی، افروزہ کی صورت۔ پوائزن کی خوشبو میں مہکی ہوئی۔ چاند کی طرح چمکی ہوئی اور اجالوں کی طرح نکھری ہوئی۔ میں دل ہی دل میں پکار اٹھا۔ افروزہ مجھے تمہاری ضروت ہے۔ اس جادوئی اندھیرے سے نکلنے کے لئے مجھے تمہاری مومی بدن کی شمع درکار ہے........ اسی روز میں نے اپنی ہنڈا اکارڈ فارم سے نکالی اور رابو کو اس کے حال پر چھوڑ کر عازم لاہور ہوا۔

زندگی نام ہی حادثات اور انوکھے واقعات کا ہے۔ جس روز شاہ جمال لاہور کی ایک عالی شان کوٹھی میں افروزہ سے میرا نکاح ہوا، اسی روز شام کو مجھے گاؤں کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط کراچی سے تھا اور دارا نے لکھا تھا۔ شکستہ لکھائی میں اوٹ پٹانگ جملے تھے۔ اس خط کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

"چھوٹے مالک! مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ آپ کو اپنا منحوس چہرہ دکھا سکوں۔ لہٰذا آپ سے اتنی دور چلا آیا ہوں اور اب اور دور جانے والا ہوں۔ جو نوکر اپنے مالک کی خوشیوں کے راستے میں دیوار بنے وہ منحوس ہی تو ہوتا ہے۔ کتنا بدقسمت ہوں میں کہ اس روز میری وجہ سے آپ کو شرمندگی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ خدا کی قسم ہم لوگ آپ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ ہمیں ہمارے بزرگوں کی یہی وصیت ہے۔ آپ رابو کو پسند کرتے ہیں۔ وہ اگر آپ کو تھوڑی بہت خوشی بھی دے سکے تو یہ

اس کی خوش بختی ہوگی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ رابو کو طلاق دے دوں۔

آپ چاہیں تو یہ بات ظاہر کر دیں' چاہیں تو صرف اپنے اور رابو تک رکھیں۔ میں نے یہاں ایک واقف کار سے مل کر دوبئی جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ چند روز تک میں کراچی سے بذریعہ لانچ روانہ ہو جاؤں گا۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دیں۔"

فقط آپ کا نوکر دارا

O-----------☆-----------O

میں اس خط کو دیکھتا رہ گیا۔ تقدیر نے میرے ساتھ ایک بار پھر سنگین مذاق کیا تھا۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ سب کچھ دو ہفتے پہلے رونما ہو جاتا تو شاید حالات بہت مختلف ہوتے۔ رابو کے متعلق غور و فکر کرتے ہوئے میں ایک موقع پر بالکل ڈانواں ڈول ہو چکا تھا۔ کبھی خیال آتا تھا کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ کبھی سوچ ابھرتی تھی کہ میں رابو کو پانے کا موقع دوسری بار کھو رہا ہوں۔ اس وقت اگر یہ علیحدگی عمل میں آجاتی تو یقینی طور پر فیصلے کی میزان رابو کی جانب جھک جاتی اور عین ممکن تھا کہ میں اسے اپنا لیتا' لیکن اب ایک بار پھر ہم مختلف سمتوں کے راہی تھے۔ میں افروزہ کا شوہر تھا اور اس حوالے سے مجھ پر بہت سی ذمے داریاں عائد ہو چکی تھیں۔

خط میں دارا نے اپنا ٹھکانا نہیں لکھا تھا۔ اس سے رابطے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس کا خط تین چار روز اپنے پاس رکھا۔ دن رات سوچتا رہا کہ یہ اطلاع رابو کو کس منہ سے دوں۔ طلاق کی خبر عورت پر بجلی بن کر گرتی ہے۔ رابو پر یہ بجلی میری وجہ سے گر رہی تھی۔ میں نے اس کا گھر برباد کیا تھا اس کی زندگی اجیرن کی تھی۔ سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فی الحال مجھے یہ خبر رابو کو نہیں دینی چاہئے اور اپنے طور پر دارا کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اپنے خط کے مطابق وہ دوبئی روانہ ہوا تھا۔ دوبئی میں میرے جاننے والے موجود تھے۔ وہاں اسے تلاش کرایا جا سکتا تھا تاہم میرے یہ سارے منصوبے دھرے رہ گئے۔ چند دن بعد پتا چلا کہ میرے اندیشوں کے عین مطابق دارا نے ایک رقعہ رابو کو بھی لکھ دیا ہے اور وہ تمام حالات سے آگاہ ہو چکی ہے۔ یہ خبر مجھے ماماں کی زبانی ملی۔ اس نے بتایا کہ تین چار روز پہلے کراچی سے دارا کا کوئی خط رابو کے نام آیا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد رابو دیر تک روتی رہی.......... اور اب تک گم صم

ہے۔ پتا نہیں خط میں کیا لکھا تھا؟ اس سوال کا جواب ماماں کو نہیں مجھے معلوم تھا۔

O-----------☆-----------O

قدرت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ میں نے گھر بسا لیا اور رابو کو طلاق ہو گئی۔ اس سانحے کی خبر میں نے اور رابو نے اپنے تک محدود رکھی۔ رابو کو دیکھنے کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ یہ تعلق ٹوٹنے پر اسے افسوس ضرور ہوا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا میں سمجھتا تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح تاثرات سے عاری تھا۔ وہ عام سے لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔ نفرت یا تحقیر تو دور کی بات ہے' مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے سرد مہری بھی نظر نہیں آئی۔ جیسے جو کچھ ہوا اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ یہ سب کچھ ہونا ہی تھا' کوئی کچھ بھی نہ کرتا تو بھی یہ ہو کر رہتا۔ وہ پرستش میں ہر انتہا سے گزر جانے والی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اپنی قسمت پر شاکر' ہمیشہ کی طرح سراپا عجز و انکسار میرے سامنے کھڑی رہی۔

شاید رابو کا یہی عجز و انکسار اور یہی خود سپردگی تھی جس کے سبب وہ بطور شریک حیات میرے لئے قابل قبول نہیں تھی۔ میں فطری طور پر مشکل پسند تھا۔ مجھے ایک کنیز کی نہیں بیوی کی ضرورت تھی۔ جس کا اپنا طمطراق ہو' اپنی رائے ہو' ناز و نخرے ہوں۔ جو میرے شانہ بشانہ چلے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے۔ افروزہ ان شرائط پر پوری اترتی تھی۔ وہ ایک طرح دار لڑکی تھی' حسن اور دولت سونے پر سہاگا تھا۔ گھر میں ہوتی تو تاریک در و دیوار جگمگا اٹھتے' محفل میں ہوتی تو مرکز نگاہ بن جاتی وہ ایم ایس سی کر چکی تھی۔ یعنی کوالیفکیشن میں بھی مجھ پر برتری حاصل تھی۔ شادی سے پہلے افروزہ کے والد انوار صاحب نے میرے سامنے جو شرائط رکھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ تین چار سال کے اندر اندر مجھے اپنی زمینوں سے اٹھ کر شہر میں سکونت اختیار کرنا ہو گی۔ میرے خیال میں تین چار سال کی مہلت بہت تھی۔ اس دوران میں بتدریج اپنی زمینوں اور فارم وغیرہ سے فارغ ہو سکتا تھا۔ ساتھ ساتھ لاہور میں بھی کاروباری طور پر پاؤں جمائے جا سکتے تھے۔ بہرحال اگلے تین چار برس افروزہ کو حویلی ہی میں گزارنا تھے۔ میرے لئے ضروری تھا کہ حویلی کو آرام و آسائش کے اعتبار سے لاہور کی عالیشان کوٹھیوں کے مقابلے میں لا کھڑا کروں۔ پیسے سے کیا ممکن نہیں۔ میں نے بھی شادی کے بعد تین چار ماہ کے اندر اندر حویلی کی کایا پلٹ دی۔ اب وہ حویلی باہر سے تو گاؤں میں کھڑی تھی لیکن اندر سے نیویارک' پیرس یا لندن میں پائی جاتی تھی۔ سوئمنگ پول' ٹینس کورٹ' وسیع ٹیرس' قیمتی ساز و سامان سے آراستہ اور سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ' افروزہ اور دیگر احباب کی

گاڑیوں کے لئے میں نے حویلی سے جلال پور تک ڈیڑھ میل طویل پختہ سڑک ذاتی خرچ پر تعمیر کرانے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا۔ افروزہ اپنے ساتھ بیش قیمت جہیز بمع ایک فیکٹری تو لائی ہی تھی' نوکروں کا ایک چھتا بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ ان میں ایک اس کی ذاتی ملازمہ تھی۔ ایک ٹینس کوچ' ایک سائیس جو اس کے چار پالتو گھوڑوں کے ناز اٹھاتا تھا اور ایک باڈی گارڈ۔ ٹینس کوچ تو دو تین ماہ بعد واپس چلا گیا لیکن باقی تین ملازمین مستقلاً حویلی کے ہو رہے۔ ایک معروف صنعتکار فیملی کا داماد بننے کے بعد میرے سماجی مرتبے میں خاصا اضافہ ہوا۔ اردگرد کے زمیندار اور سرکردہ لوگ مجھ سے دبنے لگے۔ کئی مسائل جو اس سے پہلے پیچیدہ نظر آتے تھے' خود بخود حل ہو گئے لیکن کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ میں نے بھی شادی پر اور اس کے بعد حویلی کی شان و شوکت بڑھانے پر تیس چالیس لاکھ روپیہ نقد کھویا۔ چار پانچ مربع زمین بیچی اور کئی دوسرے مسائل بھی پال لے۔ زندگی اچانک ہی بے پناہ مصروف ہو گئی۔ جیسے کوئی گاڑی کسی گلی سے نکلے اور دفعتاً ایسی معروف شاہراہ پر آجائے جس پر کم از کم رفتار سو میل فی گھنٹا ہو اور سیکڑوں گاڑیاں آندھی کی رفتار سے اڑی جا رہی ہوں۔ افروزہ کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ یہ سب اونچے طبقے کے لوگ تھے۔ آئے دن حویلی کے سامنے قیمتی گاڑیوں کی قطاریں لگ جاتیں۔ شکار' سیر' پکنک' گھریلو فنکشن ہر وقت ہلا گلا رہتا۔ یہ سب کچھ میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں ان حالات کے لئے نہ صرف پہلے سے تیار تھا بلکہ پوری طرح لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ یہ ہنگامے ہی تو مجھے درکار تھے۔ ان مصروفیات میں رابو کا خیال اس طرح آتا تھا جیسے گہرے بادلوں میں کسی وقت اچانک بجلی چمک جائے۔ میں رابو کی جانب سے بے خبر نہیں تھا۔ ایک طرح سے اس کے مسائل میرے ہی پیدا کردہ تھے اور میں اسے ان مسائل کے ساتھ تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ دوبارہ ماماں کے پاس آگئی تھی۔ حویلی کے پچھواڑے پرانے کوارٹروں میں ایک بار پھر خالہ بھانجی اکٹھی رہنے لگی تھیں۔ میں نے ماماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ رابو کو کام پر نہ لایا کرے تاہم بہانے بہانے سے میں ماماں کو چند سو روپے دے دیا کرتا تاکہ اسے رابو کی کفالت میں آسانی رہے۔

نوبیاہتا بیوی کے ساتھ میرے شب و روز خوب گزر رہے تھے۔ وہ لاکھ ماڈرن سہی مگر میرے مزاج کو سمجھتی تھی۔ شادی کے تین چار ماہ بعد ہم میں چھوٹے موٹے اختلافات پیدا ہوئے لیکن ہم نے افہام و تفہیم سے ان پر بہ آسانی قابو پا لیا۔ یہ شروع فروری کی ایک چمکیلی سہ پہر کا ذکر ہے۔ میں اور افروزہ لان میں کرسیاں ڈالے چائے پی

رہے تھے۔ سبز گھاس پر سفید کرسی' سفید کرسی پر گلابی ساڑھی اور گلابی بدن' جو میری ملکیت تھا' جس کے سارے اثاثہ جات میرے تھے۔ میں افروزہ کو محویت سے چائے کی چسکیاں لیتے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی کسی سوچ میں تھی۔ اچانک پلکیں جھپکا کر بولی۔

"جاندار! یہ رابو کیا ماماں کی بیٹی ہے؟"

اس اچانک حملے پر میں اندر سے ہل گیا۔ اچانک یہ رابو کا ذکر کہاں سے آٹپکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرے دل کا چور اچھل کر آنکھوں میں آبیٹھے گا اور وہاں سے چیخ چیخ کر افروزہ کو اپنی طرف متوجہ کر لے گا۔ میں نے نگاہیں پیالی پر مرکوز کر دیں۔ لہجے کو نارمل رکھ کر پوچھا۔ "کس رابو کی بات کر رہی ہو تم؟"

"وہی جو ماماں کے ساتھ کوارٹر میں رہتی ہے۔ سانولے سے رنگ کی اونچی ناک والی۔"

"اچھا وہ.......... وہ بھانجی ہے اس کی لیکن دیکھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ شاید بیٹی ہے۔ کافی صورت ملتی ہے ان کی۔"

"سنا ہے اس کی شادی بھی ہوئی تھی۔"

"ہاں' خاوند دوبئی گیا ہوا ہے۔"

"میں نے تو سنا ہے اسے چھوڑ گیا ہے۔ شاید طلاق بھی ہو چکی ہے۔"

میں افروزہ کی معلومات سے پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کم آمیز ہونے کے باوجود حویلی اور گاؤں کے حالات سے خاصی باخبر رہتی تھی۔ میرا بلڈ پریشر لو ہونے لگا۔ آخر اس تمہید سے کیا مطلب تھا۔ کہیں وہ میرے اور رابو کے تعلق سے آگاہ تو نہیں ہو گئی تھی۔ اگر ایسا ہوا تھا تو یہ میرے ماضی اور میری اعلیٰ ذوقی کے لئے کوئی اچھا سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ میں نے افروزہ کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا "لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

وہ بولی "عشیر خاں نے اشاروں کنایوں میں مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔"

"کیا مطلب۔" میں بری طرح چونکا۔

اس نے چائے کی چسکی لی اور مسکرا کر بولی "شادی وادی کرنا چاہتا ہے اس سے۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "عشیر خاں اس مکروہ چہرہ باڈی گارڈ کا نام تھا جو افروزہ کے جہیز میں دوسرے ملازموں کے ساتھ آیا تھا۔ عجیب بے ڈھنگا شخص تھا۔ قوی ہیکل جسم کے مقابلے میں سر چھوٹا تھا اور بازو بہت لمبے تھے۔ ان لمبے بازوؤں میں شاید لمبی آستینوں

کا بھی دخل تھا۔ جو ہر وقت اس کی نصف ہتھیلی تک لٹکی رہتی تھیں۔ مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں جیسے کسی تن ساز نے بازوؤں کے مسل دکھانے کے لئے کہنیوں کو اوپر اٹھا رکھا ہو۔ رنگ سفید تھا لیکن چہرے پر چھوٹے چھوٹے داغ سے تھے۔ عمر کوئی چالیس سال رہی ہوگی۔ مجھے یہ شخص پہلی نگاہ میں ہی اچھا نہیں لگا تھا اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جب بھی موقع ملا اس شخص کو حویلی سے فارغ کرنے میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ جذبات کو قابو میں رکھ کر میں نے عام لہجے میں پوچھا۔

"عشیر نے کہاں دیکھا تھا اس لڑکی کو؟"

"یہیں حویلی میں دیکھا ہوگا۔" افروزہ نے کہا "تم تو یوں پوچھ رہے ہو جیسے وہ سات پردوں میں چھپی ہوئی کوئی چودھرانی ہے۔"

"نہیں' میرا مطلب ہے کہ کوئی انڈر اسٹینڈنگ وغیرہ بھی ہے ان دونوں میں۔" میں نے مسکرا کر ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"بھئی ہوگی تو وہ کہہ رہا ہے ناں! اور میرے خیال میں ایسی لڑکی کے لئے عشیر خاں ہر طرح مناسب شخص ہے۔ غریب مطلقہ کو پوچھتا کون ہے۔"

میں نے بے ساختہ کہا "وہ مطلقہ نہیں ہے۔"

وہ بولی "جانداد صاحب! اپنے ملازموں کے بارے میں آپ کی معلومات خاصی واجبی سی ہیں۔ میں نے کئی عورتوں سے سنا ہے کہ رابو کا شوہر اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے۔ ابھی تو وہ پھر بھی کسی کے پلے بندھ سکتی ہے۔ تین چار سال گزر گئے تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔"

میں نے کہا "لیکن تم ایک دم اس کے بارے میں اتنی فکر مند کیوں ہو گئی ہو؟"

وہ ہنسی "آخر چودھرانی ہوں میں۔ بچے بچیوں کی شادیاں کرانا' الجھے معاملات سلجھانا' لوگوں میں راضی نامے کرانا' یہ سب میری ذمے داریاں ہیں چودھری صاحب۔"

اس کا خیال تھا کہ میں اس کے بزرگانہ لب و لہجے پر قہقہہ مار کر ہنس دوں گا لیکن میرے سینے کی اتھل پتھل سے وہ آگاہ نہیں تھی۔ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیجئے جو مزاج یار میں آئے۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی "ویسے جانداد اگر سچ مچ یہ رشتہ ہو جائے تو کیا رہے۔ بڑے کام کا بندہ ہے یہ عشیر خاں۔ ہر وقت جاں ہتھیلی پر رکھتا ہے۔ پاپا جانی کو بڑا بھروسا ہے اس پر۔ پچھلے سال ہماری شیخوپورہ والی مل میں جھگڑا ہوا تھا۔ اس اکیلے نے دو

ڈھائی سو ورکروں کو سیدھا کر دیا تھا......... یوسف زئی قبیلے سے ہے۔"

میں نے کہا "لیکن عمر کا خاصا بڑا ہے۔"

"وہ بولی "وہ کون سی ٹین ایجر ہے۔"

میں نے کہا "چالیس سال سے کم تو نہیں ہوگا وہ۔"

"بھئی ایج کو چھوڑ دو۔" افروزہ نے ناک سکوڑی۔ "ڈیل ڈول کا اچھا ہے۔ صحت مند ہے۔ اپنے قبیلے میں اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے لیکن کہتا ہے' نہیں پنجابن سے شادی کروں گا........."

افروزہ اپنے ملازم کی بھرپور وکالت کر رہی تھی۔ میں نے اس بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ "ٹھیک ہے چودھرانی جی۔ آپ جیتیں ہم ہارے۔ ہماری طرف سے بات پکی۔ آپ کل دلہا کو لے کر آجایئے۔ نکاح گیارہ بجے' تناول ماحضر بارہ سے ایک بجے تک' رخصتی باہمی صلاح مشورے سے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت لشکارے مارنے لگے۔ کچھ دیر بعد سنجیدہ ہو کر بولی "بھئی تم تو مذاق میں ٹال رہے ہو۔ میں نے کوئی انہونی بات تو نہیں کہہ دی۔"

میں نے کہا "میں کب کہتا ہوں انہونی کہہ دی ہے لیکن ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ کسی دن میں ماماں سے بات کروں گا۔"

اس رات میں دیر تک کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا۔ رابو میری کچھ نہیں تھی۔ میں اسے دوبار نظرانداز کر چکا تھا۔ لیکن جب اس کا نام کسی کے ساتھ آتا تھا تو میرے دل و دماغ کی چولیں ہل جاتی تھیں۔ یہ کیسا جذبہ تھا۔ کیا نام تھا اس دیوانگی کا؟ میں نے آتش گیر سوچوں کو حقیقت پسندی کے چھینٹے دیے اور غور کرنے لگا۔ افروزہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ایک غریب مطلقہ کو کون پوچھتا ہے۔ کون معقول شخص دہرے گھاٹے کا سودا کرتا ہے۔ عشیر خان کیسا بھی تھا بہرحال ایک توانا مرد تھا۔ برسر روزگار بھی تھا اور افروزہ اسے عرصے سے جانتی تھی۔ مجھے اس بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔ یہ سوچ میری ذمے داری تھی۔ آج سے تین برس پہلے ایک بوڑھی عورت اپنی یتیم بیٹی کو میرے سپرد کر گئی تھی۔ وہ یتیم بیٹی میری "سرپرستی" کے بہت دکھ اٹھا چکی تھی۔ یہاں تک کہ طلاق کا داغ بھی اس کے ماتھے پر لگ چکا تھا۔ اگر اب بھی میں اپنی ذمے داری محسوس نہ کرتا اور اس موج موج بھٹکتی کشتی کو کنارے لگانے کی تگ و دو نہ کرتا تو یہ رذالت کی انتہا تھی۔

اگلے روز میں نے عشیر خاں کو اپنے پاس بلایا۔ وہ پچھلے چار ماہ سے حویلی میں تھا لیکن میں نے شاید ہی کبھی اس سے دو تین فقروں سے زیادہ گفتگو کی ہو۔ اور جب تک کسی سے کھل کر بات نہ کی جائے اس کے اندر کی کیا خبر ہو سکتی ہے۔ میں نے پاس بٹھا کر اسے ٹٹولنا شروع کیا۔ مختلف سوال جواب کئے۔ اس تحقیق کے آخر میں میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ عشیر خاں کے حق میں نہیں جاتا تھا بلکہ یہ کہوں تو زیادہ مناسب ہو گا کہ اس ملاقات کے بعد وہ مجھے پہلے سے بھی بیگانہ لگا۔ وہ ایک کھوکھلا سا باتونی شخص تھا جسے اپنی عقل سے زیادہ جی داری اور وفاداری پر ناز تھا۔ جی داری کا دعویٰ تو شاید آدھا پون درست ہی ہو لیکن وفاداری والی بات میرے حلق سے نہیں اتری۔ اس کے بجائے وہ مجھے خاصا موقع پرست دکھائی دیا۔

میں نے مزید سن گن لینے کے لئے حویلی کے ایک پرانے ملازم شکر الٰہی کو منتخب کیا۔ ملازم پیشہ لوگ ایک دوسرے کے متعلق بخوبی جانتے ہیں اور بعض کو تو ایک دوسرے کی مکمل فیملی ہسٹری ازبر ہوتی ہے۔ شکر الٰہی ریٹائرڈ فوجی تھا، دوسری طرف عشیر خاں کو بھی دعویٰ تھا کہ وہ کچھ عرصہ فوج میں رہا ہے۔ اس حوالے سے وہ دونوں شناسا تھے۔ تنہائی میں، میں نے شکر الٰہی سے پوچھا کہ عشیر خاں کیسا آدمی ہے۔ شکر الٰہی کے چہرے پر جو پہلا تاثر ابھرا وہ میرے لئے خاصا ناقابل فہم تھا۔ اس تاثر میں سب سے نمایاں چیز کراہت تھی۔ شکر الٰہی ادب سے بولا "چھوٹے مالک، آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ گاؤں میں کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر عشیر خاں کا گھر بسا دیا جائے۔"

شکر الٰہی کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا گئے۔ بولا "اس کا مطلب ہے آپ عشیر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

میں واقعی کچھ سمجھ نہیں پایا میں نے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "عشیر خاں سے کسی عورت کو بیاہنے کا مطلب اس بیچاری کو موت کے منہ میں دھکیلنا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو وہ اس سے پہلے دو بیویاں قبر میں اتار چکا ہے۔ تیسری لاہور کے اسپتال میں زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ افروزہ نے مجھ سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی...... ناقابل یقین سا بیان تھا شکر الٰہی کا۔ میں نے کہا "شکورے! پہیلیوں میں بات نہ کرو۔ جو کہنا ہے کھل کر کہو۔"

شکر الٰہی کی آنکھوں میں پراسرار سائے لہرائے۔ وہ آگے کو جھک کر سرگوشی میں بولا۔ "چھوٹے مالک، عشیر خاں کو کوڑھ ہے۔ کبھی آپ نے اس کی بھویں نہیں دیکھیں، کیسی جھڑی جھڑی سی ہیں اور کان بھی نیچے سے سوجے رہتے ہیں۔ کبھی غور نہیں کیا آپ نے؟...... یہ سب کوڑھ کی نشانیاں ہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایک ہی لمحے میں عشیر کا سراپا میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ مجھے اس کی آستینیں یاد آئیں جو آگے تک لٹکی رہتی تھیں اور ہاتھوں کی انگلیاں جن کی رنگت عجیب سی تھی۔ مجھے سوچ میں دیکھ کر شکر الٰہی نے کہا "یہ بات تو اب خاصی مشہور ہو گئی ہے جی لیکن آپ کی وجہ سے لوگ چپ ہیں...... میں نے خود ایک دن عشیر خاں کے بازو دیکھے تھے۔ وہ کھال پر بیٹھا منہ دھو رہا تھا۔ پیچھے کماد کا کھیت تھا۔ میں کماد سے نکلا تو میری نظر سیدھی عشیر پر پڑی۔ اس کے بازو کہنیوں تک عجیب طرح کے ہیں۔ ان پر نہایت مہین خشخاشی دانے سے ہیں۔ عشیر نے مجھے اپنے بازوؤں کی طرف گھورتے پایا تو جلدی سے اٹھ کر آستینیں نیچے گرا لیں۔"

میں نے کہا "تم نے اس سے کچھ پوچھا نہیں؟"

شکر الٰہی بولا "پوچھنا کیا ہے مالک۔ یہ سو فیصد پکی بات ہے۔ اسے کوڑھ ہے۔ بے شک آپ کسی ڈاکٹر حکیم کو بلا کر دکھا لیں۔"

یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی۔ جذام ایک متعدی مرض ہے۔ ایسے مریض کا عام لوگوں میں گھل مل کر رہنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ دوسری طرف عشیر خاں میری بیگم کا چہیتا نوکر تھا۔ یقینی طور پر وہ بھی اس کی بیماری سے آگاہ ہو گی۔ اس کے باوجود وہ اسے گاؤں ساتھ لے آئی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ شکر الٰہی نے جو کچھ بتایا ہے، یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ دیکھنے کے لئے افروزہ سے بات کرنی چاہئے...... ویسے دل ہی دل میں مجھے افروزہ پر بھی طیش آ رہا تھا۔ اگر عشیر واقعی بیمار تھا تو افروزہ کو کیا حق پہنچتا تھا کسی بے سہارا لڑکی کی زندگی برباد کرنے کا۔

اس روز رات کو بیڈ روم میں، میں نے افروزہ سے عشیر خاں کی بات چھیڑی۔ اس کی بیماری کا ذکر کیا تو وہ افسوس سے دائیں بائیں سر ہلانے لگی۔ "جہانداد! تم بھی کمال کرتے ہو۔ پاپا جانی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دیہات میں رہنے والوں کی سوچ بھی دیہاتی ہو جاتی ہے۔ تم تو لیپروسی کا نام ایسے لے رہے ہو جیسے لوگ دو ہزار سال پہلے لیا کرتے

تھے۔ محترم! لیپروسی اب کوئی ایسا خوفناک یا ناقابل علاج مرض نہیں رہا۔ اور ابتدائی اسٹیج پر تو اس پر قابو پانا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتا۔ دو سال پہلے عشیر خاں میں ابتدائی علامتیں نمودار ہوئی تھیں۔ مناسب علاج کے بعد اب وہ بھلا چنگا ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر ہے وہ بھی چند ماہ میں دور ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "لیکن میں نے تو سنا ہے کہ اس سے پہلے وہ دو بیویوں کی زندگی سے کھیل چکا ہے۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ "توبہ......... توبہ......... توبہ......... جمانداد' تم تو نمک کی کان میں بالکل نمک ہو گئے ہو۔ کیسی بچگانہ بات کر رہے ہو۔ تمہارا مطلب ہے کہ عشیر کی دو بیویاں عشیر کی بیماری کا شکار ہو کر مر گئی ہیں۔ لیکن جناب! یہ عشیر ابھی زندہ کیوں ہے......... یہ خود تو مرا نہیں اور دوسروں کو مارتا چلا جا رہا ہے۔"

"تو کیا یہ بیویوں والی بات جھوٹ ہے۔"

"جو بات تم تک پہنچی ہے وہ تو جھوٹ ہی ہے۔ عشیر کی صرف ایک بیوی مری ہے اور وہ بھی لیپروسی سے نہیں' بجلی کا جھٹکا لگنے سے۔ یقین نہیں ہے تو تصدیق کر سکتے ہو۔ دو سال پہلے کی بات ہے۔"

میں نے کہا "اور ایک بیوی اس کی اسپتال میں ہے۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عشیر کی وجہ سے بیمار ہوئی ہے جب عشیر سے اس کی شادی ہوئی تو وہ بھلا چنگا تھا۔ لیپروسی کی شکایت اسے بعد میں ہوئی۔ ڈاکٹر کہتا ہے اور میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی کو لیپروسی تھی جس سے بعد ازاں عشیر بھی متاثر ہوا۔"

میرے فیصلے کی قطعیت محسوس کر کے افروزہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ درحقیقت وہ اپنے طور پر کچھ شرمندہ بھی تھی۔ اس نے نہ صرف مجھ سے عشیر کی بیماری چھپائی تھی بلکہ اس کی سابقہ دو یا تین شادیوں کا ذکر بھی گول کر گئی تھی۔ پھر سب کچھ جاننے کے بعد میں نے عشیر کے متعلق جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی خاصا مصالحانہ تھا۔ میں نے صرف اس کی شادی کا ذکر موخر کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے فوراً حویلی بدر کرنے کا مطالبہ کر دیتا۔ اس واقعے کے بعد ایک تبدیلی ضروری آئی۔ رابو کا گھر بسانے کا خیال میرے دل میں جم گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کوئی مناسب شخص دیکھ کر رابو کا بیاہ کر دیا جائے۔ یہ میرے لئے ایک نہایت ناخوشگوار فریضہ تھا مگر اس سے روگردانی اور

بھی ناخوشگوار تھی۔ میں غیرارادی طور پر اپنے مطلوبہ شخص کی ٹوہ میں رہنے لگا۔ ایک دن میں نے اس سلسلے میں ماماں سے بھی بات کی۔ ماماں کی سوچ میری توقع سے مختلف نکلی۔ وہ کہنے لگی "چھوٹے مالک! آپ ان داتا ہیں۔ ہمارے لئے جو سوچیں گے بھلا ہی سوچیں گے۔ آپ رابو کو کسی پتھر سے بھی بیاہ دیں گے تو وہ ساری جندگی اس سے لگ کر بیٹھی رہے گی۔ پر جہاں تک اس کی اپنی مرجی ہے......... میرا کھیال ہے کہ وہ بیاہ کرنا نہیں چاہتی۔"

میں نے کہا "تم اس کی نہیں اپنی سوچ بتاؤ۔ کیا وہ پہاڑ جیسی زندگی اس طرح کاٹ سکے گی۔"

ماماں بولی۔ "مالک! میں تو چاہتی ہوں کل کے بجائے آج اس کا بیاہ ہو جائے پر......... میرا مطلب ہے......... ایک بار آپ اس سے بھی پوچھ لیں۔"

ماماں کے ساتھ طویل گفتگو سے اندازہ ہوا کہ رابو ابھی ذہنی طور پر اس صورت حال کے لئے تیار نہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ شادی والے باب کو ابھی کچھ عرصے تک نہ کھولا جائے۔ بعض معاملات وقت کے ساتھ ساتھ خود سدھر جاتے ہیں اور اس سدھار میں پائیداری بھی زیادہ ہوتی ہے۔

O-----------☆-----------O

زندگی اپنے راستے پر گامزن رہی۔ وہی حویلی' وہی مہمان نوازیاں' وہی تفریحات وہی افروزہ اور اس کی شاہانہ مصروفیات۔ اس دوران ایک بار افروزہ حاملہ بھی ہوئی لیکن پھر ابارشن کرانا پڑا۔ عشیر خاں بدستور حویلی میں تھا۔ اس سے میری نفرت اور کراہت مزید بڑھ گئی تھی۔ اس نفرت اور کراہیت کا سبب اس کی بیماری نہیں اس کی شخصیت تھی۔ عجب پراسرار سا کردار تھا وہ۔ الگ تھلگ خاموش لیکن بے حد ہوشیار اور ہر چیز پر عقابی نگاہ رکھتا ہوا۔ اہل دیہہ تو الگ رہے' حویلی کے ملازمین بھی اس سے کنی کتراتے تھے۔ آجا کے ایک شکر الٰہی تھا جس کے پاس وہ بیٹھتا تھا۔ دونوں اپنی اپنی رائفلیں گود میں رکھ لیتے۔ اپنی پگڑیوں کو دیہاتی انداز میں کمر اور گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر گرہ لگاتے۔ اس طرح آرام کرسی سی بن جاتی۔ وہ زمین پر بیٹھے آگے پیچھے جھولتے اور باتیں کرتے رہتے۔ اس گفتگو میں زیادہ حصہ شکر الٰہی کا ہی ہوتا تھا۔ عشیر خاں بس کبھی کبھار اپنا چھوٹا سا سر اقرار یا انکار میں ہلا دیتا۔ میں نے شکر الٰہی کو خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ "اسرار کے اس پتھر" میں جونک لگا تا رہے۔ یہ نہ ہو وہ خاموشی سے کوئی کام دکھا جائے اور ہم دیکھتے

ہی رہ جائیں۔ خاص طور پر میں رابو کے بارے میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میری اطلاعات کے مطابق عشیر خاں کی شہرت کسی حوالے سے بھی اچھی نہیں تھی۔ اس کی دوسری بیوی جسے بعض لوگ تیسری بھی کہتے تھی اور جو لاہور کے ایک خیراتی اسپتال میں زیر علاج تھی، زبردستی اٹھا کر لائی گئی تھی اور اٹھانے والا عشیر خاں تھا۔ یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے اس نے ایک شخص کی دونوں ٹانگیں بھی توڑ دی تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں رابو یا کسی دوسری لڑکی کے ساتھ بھی کوئی ایسا معاملہ ہو جائے۔ شکر الٰہی مجھے عشیر کے متعلق وقتاً فوقتاً رپورٹ دیتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے ایک بالکل مختلف بات بتائی، کہنے لگا۔

"چھوٹے مالک! عشیر خاں امریکا جا رہا ہے۔"

عشیر خاں اور امریکا؟ میں حیرت سے شکر الٰہی کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ وہ بولا "آج صبح مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ سرخ رنگ والا صاحب مجھے امریکا لے کر جائے گا۔ انگلیوں کے علاج کے لئے۔"

"سرخ رنگ والے صاحب" کا اشارہ میں سمجھ گیا۔ شکر الٰہی جیکسن کی بات کر رہا تھا۔ جیکسن، افروزہ کے فیملی فرینڈز میں سے تھا۔ نیلی آنکھوں والا اونچا لمبا خوبرو نوجوان تھا۔ میں خود بھی دراز قد ہوں لیکن اس کے روبرو کھڑے ہونے سے کتراتا تھا۔ وہ امریکی ریاست انڈیانا کا رہائشی تھا اور افروزہ کے "پاپا جانی" سے اس کے کاروباری تعلقات تھے۔ افروزہ اور جیکسن کی مشترکہ دلچسپی ٹینس تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا دونوں بیشتر وقت ٹینس کھیلتے رہتے تھے یا پھر لطیفہ گوئی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ افروزہ کے شوہر کی حیثیت سے مجھے یہ شخص اچھا نہیں لگا۔ شاید میری جگہ کوئی شوہر بھی ہوتا، ایسا ہی محسوس کرتا۔ تین ہفتے پہلے افروزہ کا "لارنس" نامی عربی گھوڑا بیمار ہو گیا تھا۔ اس کا کافی علاج معالجہ کیا گیا مگر "محترم" کی طبیعت نہیں سنبھلی۔ جیکسن نے آتے کے ساتھ ہی پہلا کارنامہ یہ انجام دیا کہ اس نیم مردہ گھوڑے میں جان دوڑا دی۔ اس سلسلے میں اس کی خاصی رقم بھی خرچ ہوئی۔ اس نے اسلام آباد میں کسی گورے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا پھر اس کے ذریعے انگلینڈ سے قیمتی دوائیں منگوائیں۔ خاصی تگ و دو کے بعد مثبت نتیجہ نکلا اور گھوڑا "پہلے جیسا" ہو گیا۔ گھوڑے کی تیمارداری میں ولائتی جیکسن کی بے پناہ لگن میرے دیسی سینے میں کھدبد پیدا کرتی رہتی تھی۔ اب میں یہ دوسری خبر سن رہا تھا۔ جیکسن، عشیر خاں کو امریکا لے جا رہا تھا۔ عربی گھوڑے کی طرح یہ عجمی عشیر خاں بھی افروزہ کا چہیتا

تھا۔ یعنی افروزہ کی ہر چہیتی شے پر یہ سفید فام صدقے واری جانے کو تیار تھا۔ پہلے پہل تو میں اپنے ان خیالات کو بے پناہ قوت ارادی سے جھٹکتا رہا تھا مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ایسا نہیں کر سکوں گا۔ وہ شک جو ازل سے مرد کے سینے میں پلتا ہے اور تن بدن میں زہر بھرنے لگتا ہے، میرے سینے میں بھی نمو پا چکا تھا۔ میں نے افروزہ سے بات کی تو اس نے میری اطلاع کی تصدیق کی۔

بولی "آج صبح ہی بات ہوئی تھی۔ میں خود تم سے ذکر کرنے والی تھی۔"

میں نے کہا "لیکن ہمیں کیا ضرورت ہے جیکسن کا اتنا بڑا احسان سر پر لینے کی۔ اگر تم ایسا کرنا ہی چاہتی ہو تو خود کر لو۔ تمہارے پاس کوئی کمی ہے۔ یا میں نے کبھی تمہیں روکا ہے خرچ کرنے سے۔"

وہ بولی "بات خرچ کی نہیں جہانداد، احساس کی ہوتی ہے، اور ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ جیکی ہم سے زیادہ حساس ہے۔ اس میں کراہیت اور نفرت کی بجائے محبت اور جستجو ہے۔ اتنا عرصہ ہو گیا کبھی تم نے عشیر خاں کو چھونے کی ہمت کی ہے۔ جیکی روز اس سے مصافحہ کرتا ہے۔ اس سے باتیں کرتا ہے۔ حوصلہ دیتا ہے۔ اگر وہ اپنے طور پر اس کا درد بانٹنا چاہتا ہے۔ تو ہم اس نیکی سے کیوں روکیں اسے؟"

میں نے دل میں سوچا "نیکی کے کام تو اور بھی بہت ہیں مسز جہانداد.......... اس سفید فام نے سارے صالح اعمال کے لئے میری ہی حویلی کیوں منتخب کی ہے۔" شاید میں یہ بات کہہ بھی دیتا لیکن کروڑوں کا جینز میرے حلق میں پھنس گیا اور ایک وسیع فیکٹری ٹیپ کی طرح ہونٹوں پر چپک گئی۔

O------------☆------------O

وہ ایک تاریک شب تھی۔ کسی بدنصیب کی طرح کالی اور بیوہ کی طرح خاموش۔ نجانے وہ کونسا پہر تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ ایک بار جب میری آنکھ لگ جائے تو بہت گہری نیند سوتا ہوں۔ کئی بار احساس ہوا کہ جس کروٹ سویا تھا اسی کروٹ اٹھ بیٹھا ہوں، لیکن ان دنوں دیگر معمولات کی طرح میرا یہ معمول بھی بدلا ہوا تھا۔ رات میں ایک دو بار آنکھ ضرور کھل جاتی۔ میں جاگا تو خوابگاہ میں مکمل تاریکی تھی۔ منہ میں وہسکی کی ہلکی سی تلخی اور کانوں میں باجے گاجے کا شور تھا۔ اس وہسکی کو پئے اور ان باجوں کو سنے دو تین گھنٹے ہو چکے تھے لیکن بازگشت ابھی باقی تھی۔ حویلی میں ہونے والی گیٹ ٹوگیدر کی یہ تقریب شام پانچ بجے سے رات گیارہ بجے تک جاری رہی تھی اس کے بعد میں اور افروزہ

سونے کے لئے آ گئے تھے......... اور اب آنکھ کھلنے کے باعث میں بیڈ پر اکڑوں بیٹھا تھا......... اچانک مجھے احساس ہوا کہ افروزہ بیڈ پر نہیں ہے۔ میں نے ٹیبل لیمپ آن کیا۔ خالی بیڈ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ باتھ روم میں تاریکی تھی اس کا مطلب تھا وہ وہاں بھی نہیں ہے۔ میرے سینے میں ہر دم سلگنے والا شک اچانک ہی الاؤ بن کر بھڑک اٹھا۔ رات کے تین بجے افروزہ کہاں تھی۔ سلیپر پہن کر اور ٹیبل لیمپ بجھا کر میں بے آہنگی خوابگاہ سے نکلا۔ میرے قدم خود بخود حویلی کے اس حصے کی طرف اٹھ گئے جہاں جیکسن اپنے پالتو کتے کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ اس نایاب کتے کی قیمت پندرہ ہزار روپے اور وزن بمشکل ساڑھے سات سو گرام ہو گا۔ میں دبے پاؤں جیکسن کے کمرے میں پہنچا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ اچانک مجھے کمرے سے ٹیڈی کتے کی مہین آواز سنائی دی۔ وہ دروازے کی زیریں درز سے منہ لگا کر اپنے مالک کو پکار رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا۔ جیکسن کمرے میں نہیں ہے۔ یعنی رات کے تین بجے جیکسن اور افروزہ دونوں اپنے کمروں میں نہیں تھے۔ خود بخود میرا دھیان چھت کی طرف چلا گیا۔ میں محتاط قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آیا لیکن ابھی چھت پر پہنچا بھی نہ تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ جیکسن کی سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔ وہ چھت پر کھلنے والے دروازے کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ وہ کسی کو تھامے ہوا تھا۔ انگریزی میں بولا "میری بات تو سنو، دو سیکنڈ کے لئے رک جاؤ۔ دیکھو یہ ٹھیک نہیں۔"

جواب میں افروزہ کی آواز نے میرے کانوں میں سیسہ پگھلایا۔ "بس جیکی، میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ امریکا اور یہاں کے ماحول میں بہت فرق ہے۔ میں اب شادی شدہ ہوں۔ ہمارے راستے بہت مختلف ہو چکے ہیں۔"

"پلیز فری۔" جیکی روہانسا ہو کر بولا "مجھے اتنا بددل نہ کرو کہ میں خودکشی کر لوں۔ پلیز........."

"جیکی، سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس راستے میں بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ تمہیں نہیں معلوم ہمارے ہاں شادی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے افروزہ کا لہجہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ غالباً جیکی نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ افروزہ چپ ہو گئی اور میرے اندر پرکھوں کا آتش گیر خون جوش مار گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہا میں کہاں اور کیوں کھڑا ہوں۔ ایک آتش فشاں سینے میں پھٹا اور رگ و پے میں لاوا بہہ نکلا۔ میں عالم خود فراموشی میں دروازے سے ٹکرایا اور چھت پر پہنچ گیا۔ میرے تصور میں جیکسن کی سرخ توانا گردن کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اکڑے ہوئے ہاتھ اس لمحے کے انتظار میں تھے

جب وہ گردن ان کے شکنجے میں ہوتی اور وہ اس جسم سے زندگی کی آخری رمق تک نچوڑ لیتے۔ میں نے اپنی جلتی آنکھوں کے سامنے افروزہ اور جیکسن کے ہیولے دیکھے۔ ان کے خدوخال کو پہچانا اور غراتا ہوا جیکسن کی طرف بڑھا۔ مجھے یاد ہے میری غراہٹ سننے کے بعد دونوں ہیولے ایک یا دو قدم پیچھے ہٹے تھے اور شاید افروزہ کی مدھم سی چیخ بھی ابھری تھی۔ میں نے جیکی کا ٹینٹوا دبانے کے لئے ہاتھ بڑھائے لیکن مطلوبہ چیز میرے ہاتھ میں نہیں آئی۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ نہ ہی میرے احسانوں تلے دبا ہوا کوئی مزارعہ یا مزدور تھا۔ وہ ایک صحت مند، حاضر دماغ شخص تھا۔ میری چستی چالاکی اس کے آگے پانی بھرتی تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور میرے جبڑے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ بھرپور مکا کھا کر میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ لڑکھڑایا تو عقب میں دروازے کا خلا تھا اور خلا میں نیچے جاتی سیڑھیاں تھیں۔ دروازے سے گزر کر میں سیڑھیوں پر گرا اور آنکھوں میں چراغاں ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے میں ہوش و حواس سے قطعی بیگانہ ہو گیا۔ ان لمحوں میں کیا ہوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دوبارہ سلسلہ سماعت و بصارت بحال ہوا تو میں نے خود کو تاریک کمرے میں پایا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا جا چکا تھا اور دو بے حد مضبوط اور بے رحم ہاتھ میری کلائیوں کو پشت پر جوڑ کر کھردری رسی سے باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ جیکسن کے ہاتھ تھے۔ باتھ روم سے آنے والی مدھم روشنی میں افروزہ نظر آئی۔ وہ میری طرف پشت کئے کھڑکی سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا وہ کیا کر رہی ہے۔ یہ سارا منظر ہی خواب کا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ میرے سیڑھیوں پر گرنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی اس نے کسی ملازم یا ایک سے زیادہ ملازموں کو جگا دیا تھا اور وہ آواز کی وجہ جاننے کے لئے جیکی کے کمرے کے سامنے گھوم رہے تھے۔ افروزہ انہی کی نقل و حرکت کا اندازہ لگا رہی تھی۔ میں قالین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس لئے جب افروزہ کھڑکی سے ہٹ کر میرے سر پر آن کھڑی ہوئی تو مجھے اس کے پاؤں اور لرزاں شلوار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس کی گھبرائی ہوئی صدا جیسے کہیں بہت دور سے آئی۔

"خون تیزی سے بہہ رہا ہے۔ اوہ مائی گاڈ......... اب کیا ہو گا جیکی؟"

"تم کسی طرح اپنے کمرے میں پہنچو۔ میں اسے سنبھال لیتا ہوں۔"

"کک......... کہیں......... کچھ ہو نہ جائے۔ یہ ٹھیک تو ہو جائے گا ناں؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، زخم کافی گہرا ہے۔"

"ہائے اللہ جیکی.......... اسے.......... کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا۔"

"میں کہتا ہوں، تم وقت ضائع نہ کرو۔ اپنے کمرے میں پہنچو، صبح تک چپ چاپ پڑی رہو۔ اور ہاں، یہ اپنی آستین اچھی طرح دھو لینا۔"

افروزہ کی دور افتادہ آواز سنائی دی۔ اس آواز میں دنیا جہان کا خوف سمٹا ہوا تھا
"دیکھو.......... جیکی.......... کہیں.......... قاتل نہ بن جانا۔"

"نہیں بنوں گا۔ نہیں بنوں گا۔ تم جاؤ" جیکی دانت پیس کر غرایا۔

میرے دائیں رخسار اور گردن پر گرم گرم سیال بہہ رہا تھا۔ یقیناً سر پر کوئی بہت گہرا زخم آیا تھا۔ گہرے زخم کے تصور ہی سے مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ میں نے منہ کے اندر زبان گھما کر حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی لیکن اس قسم کی ساری کوششیں فضول تھیں۔ میرا دائرہ سماعت ایک بار پھر ہر قسم کی آوازوں سے خالی ہونے لگا۔ میں بے ہوش ہو رہا تھا.......... یا مر رہا تھا۔

O------------☆------------O

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو موٹے بان کی بدبودار سی چارپائی پر پایا۔ یہ ایک نیچی چھت والا نیم تاریک کمرا تھا۔ کچی زمین پر ایک صندوق اور صندوق پر دو لحاف رکھے تھے۔ سلاخوں والی ایک کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی لیکن وہ بند تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں اور میں کراہ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ مجھے چارپائی کے ساتھ رسی سے باندھا گیا ہے۔ منہ میں بھی کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ کہیں قریب ہی موٹر چلنے کی مدہم آواز آ رہی تھی۔ یہ کوئی چھوٹا سا واٹر پمپ تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں اور اس وقت کہاں ہوں۔ ہاں یہ بات یقینی تھی کہ اس دفعہ میری بے ہوشی کا دورانیہ خاصا طویل رہا ہے۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے اچھی طرح قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ دفعتاً ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں اس مقام کو تقریباً پہچان گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری حیرت میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ اگر میرا قیافہ درست تھا تو میں اپنے گاؤں اور حویلی سے قریباً تیس کلو میٹر دور سرگودھا جانے والی سڑک کے نواحی علاقے میں موجود تھا۔ میں اس جگہ ایک دفعہ پہلے بھی آ چکا تھا۔ اس وقت افروزہ اور اس کے پاپا جانی میرے ساتھ تھے۔ وہ مجھے "جہیز کا سامان" دکھانے نکلے ہوئے تھے۔ سرگودھا روڈ سے ملحقہ یہ چار کینال کا پلاٹ بھی افروزہ کے جہیز میں شامل تھا۔ چار دیواری بن چکی تھی۔ گیٹ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف

نیچی چھت والے دو کمرے بنے تھے۔ یہاں انوار ملز کے کسی غریب ورکر نے بمع اہل و عیال رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ڈیڑھ دو کینال میں سبزیاں کاشت کی گئی تھیں۔ سبزیوں کی آبپاشی کے لئے واٹر پمپ چل رہا تھا۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ میں اسی جگہ پہنچایا گیا ہوں۔

میں قریباً ایک گھنٹا اسی طرح چارپائی پر بندھا پڑا رہا۔ دھیرے دھیرے کمرے کی تیرگی کم ہو گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ صبح ہو رہی ہے۔ آخر دروازے سے باہر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی نے تالا کھولا اور اندر آ گیا۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ عشیر خان تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی، جس میں چند توس اور فرائی انڈا رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ بارہ بور کی طاقتور رائفل حسب معمول عشیر کے کندھے پر تھی۔ وہ بڑی بے باکی اور ڈھٹائی سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہی شخص جو کل تک مجھے چھوٹے مالک کہتا تھا اور سر جھکائے مودب کھڑا رہتا تھا بلا تکلف مجھ سے ایک قیدی کا سلوک کر رہا تھا۔ اس نے میرے بالائی دھڑ سے رسی کے چند بل ڈھیلے کر کے میرے ہاتھ آزاد کر دیے اور ناشتے کی پلیٹ میرے سینے پر سجا دی۔ پھر میرا منہ کھولنے کے بعد بولا۔

"کھالو.......... لیکن آواز وغیرہ نہ نکالنا ورنہ وقت سے پہلے ہی مارے جاؤ گے۔"

میں نے کراہتے ہوئے پوچھا "تمہاری مالکن کہاں ہے؟"

وہ غرایا "میں نے کہا نہیں کہ آواز مت نکالو۔ خاموشی سے کھالو ورنہ ابھی تھوبڑا باندھ دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "عشیر خان، تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔"

اس نے تڑپ کر رائفل ہاتھ میں لی اور بلا دریغ میرے زخمی سر سے لگا کر بولا "مجھے گولی مارنے کی اجازت ہے اور میرے اندر کلیجا بھی ہے گولی چلانے کا۔ سنی ہے میری بات.........." پھر وہ غصے سے لرزتا ہوا باہر چلا گیا۔ میرے سینے پر گرم پلیٹ تھی اور کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو براہ راست نتھنوں میں گھس رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی عشیر خان کے جذام زدہ ہاتھ بھی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ خواہش کے باوجود میں پلیٹ سے کچھ نہیں لے سکا.......... میرا چیخنا چلانا نہ صرف عشیر خان کو مشتعل کر سکتا تھا بلکہ بے سود بھی تھا۔ میری یادداشت کے مطابق اس پلاٹ کے گرد دور دور تک جگہ خالی پڑی تھی۔ بے ہوشی سے پہلے کے واقعات ڈراؤنی فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے

گزرنے لگے۔ افروزہ اور جیکسن کے چہرے تصور میں آئے اور سینے سے درد کی ایک شدید ٹیس ابھر کر پورے بدن میں پھیل گئی۔ افروزہ کا آخری فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ اس فقرے میں اس نے جیکسن سے کہا تھا کہ کہیں وہ مجھے مار کر قاتل نہ بن جائے۔ لیکن مجھے زندہ چھوڑنا اب ان دونوں کے لئے اتنا آسان نہیں تھا۔ غالباً سوچ بچار کے لئے کچھ وقت حاصل کرنے کے لئے ہی مجھے حویلی سے اٹھا کر یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ میں جانتا تھا افروزہ اور جیکسن کی سوچ بچار کتنی بھی طویل ہو اس کا نتیجہ میرے حق میں نہیں نکلے گا۔ وہ آخر کار اس فیصلے پر پہنچیں گے کہ مجھے بار زندگی سے آزاد کر دینا بہترین حل ہے۔ میں سوچنے لگا حویلی میں کیا صورت حال ہوگی۔ یقیناً وہاں میری گمشدگی کا ڈراما رچایا گیا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ اس حویلی میں پولیس بھری ہو اور غور کیا جا رہا ہو کہ میرے اغوا کے شبہے میں کس کس زمین دار پر ہاتھ ڈالا جائے۔ میرے بعد حویلی میں کرتا دھرتا میرے چچا آصف جاہ تھے۔ وہ ایک سیدھے سادے درویش منش شخص تھے۔ انہیں بہکانے میں افروزہ جیسی عورت کو زیادہ دشواری نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں منشی خادم حسین کو دال میں کالا نظر آسکتا تھا۔ مگر یہاں تک تو اس کی سوچ بھی نہ پہنچ سکتی تھی کہ میرے "غم میں نڈھال" میری بیوی ہی میری قاتلہ ہے۔ اور اس کا ساتھی وہ ہمدرد اور غم گسار جیکسن ہے جو انسان تو کیا کسی جانور کو بھی آزردہ نہیں دیکھ سکتا۔ کوڑھی سے ہاتھ ملاتا ہے اور اس سے باتیں کرتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ خود بھی کوڑھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ کوڑھ اوپر سے نظر نہیں آتا۔

جیکسن کے متعلق سوچتے سوچتے میرا دھیان اپنی طرف چلا گیا۔ جیکسن کی طرح میں بھی تو کوڑھے اخلاق کا مالک تھا۔ میرے فکر و عمل میں بھی یہی مرض پھیلا ہوا تھا۔ میں نے رابو سے جو زیادتیاں کی تھیں وہ آج میرے سامنے تھیں اور بعین اسی شکل میں۔ جس حال کو میں پہنچا تھا۔ یہ مکافات عمل کا پرتو تھا۔ کل میرے ہاتھوں رابو کا گھر برباد ہوا تھا۔ آج جیکسن نے میرا آشیانہ بکھیر دیا تھا اور جیکسن کی معاون وہ اعلیٰ خاندانی عورت تھی جسے غریب رابو پر ترجیح دے کر میں بڑے چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لایا تھا۔ جس کی دلکشی، رعنائی اور فضیلت کے میں نے قصیدے پڑھے تھے اور جس کی امارت میری جہاندیدہ آنکھوں کا تارا تھی۔ آج نہ وہ امارت رہی تھی، نہ وہ دلکشی و رعنائی اور نہ ہی ان نعمتوں سے مستفیض ہونے والی زندگی بچتی نظر آتی تھی۔ ایسے میں رابو کا مانوس چہرہ پوری شدت سے ابھر کر میرے تصور میں آگیا۔ کشادہ پیشانی، جھکی جھکی پلکیں اور ان کے

نیچے دو خوبصورت ترین ہونٹ، میں نے سوچا، رابو کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی، میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟

O------------☆------------O

اس تنگ و تاریک جگہ میری اسیری توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوئی۔ قریباً بیس روز میں نے اسی چھت کے نیچے سنگین اندیشوں کے چنگل میں گزار دیئے۔ میرا مستقل پہریدار عشیر خان تھا۔ تاہم خالص دیہاتی خدوخال والا ایک منحنی سا شخص بھی اکثر نظر آجاتا تھا۔ اس کا نام نذیر تھا اور وہ عشیر خان کو "خان صیب" کہہ کر بلاتا تھا۔ مجھے دو وقت کا کھانا عشیر خان پہنچاتا تھا۔ رات نو اور دس بجے کے درمیان آدھ گھنٹے کے لئے مجھے کمرے سے نکال کر احاطے میں چہل قدمی کے لئے لاتا تھا۔ اس دوران وہ بندوق گود میں رکھے مجھے عقابی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ مجھے چارپائی سے باندھنا ترک کر دیا گیا تھا بلکہ چار پانچ روز پہلے تک تو میرے ہاتھ پاؤں بھی نہیں باندھے جاتے تھے۔ بس عشیر خان کمرے کو باہر سے قفل لگا کر دروازے کے سامنے چارپائی ڈال لیتا تھا، لیکن اب پھر رات کے وقت میری مشکیں کسی جانے لگی تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پانچ روز پہلے میں نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ کمرے کی چھت بالکل عارضی قسم کی تھی۔ کیکر کے بالے ڈال کر اوپر "سرکیاں" اور مٹی وغیرہ ڈال دی گئی تھی۔ ایک رات دس بجے کے بعد میں نے چارپائی پر کھڑے ہو کر چھت تک رسائی حاصل کی اور ایک آہنی پتری سے سرکیاں کاٹنا شروع کر دیں۔ اس مقام پر دو کڑیوں کے درمیان اتنی جگہ ضرور تھی کہ میں باہر نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ سرکیاں کٹ گئیں تو میں نے مٹی ہٹانا شروع کی۔ ابھی بمشکل چھت میں چھوٹا سا سوراخ ہی ہوا تھا کہ عشیر خان قفل کھول کر دندناتا ہوا اندر آگیا اور اپنی واہیات زبان میں مجھ پر برسنے لگا۔ پھر اس نے نذیر کو ہدایت کی۔ وہ کہیں سے ایک زنگ آلود زنجیر لے آیا۔ اس زنجیر سے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور یہی سلوک میرے پاؤں سے کیا گیا۔ اس واقعے کے بعد میرے لئے فرار کا ہر امکان معدوم ہو گیا تھا۔ اب میں تھا، یہ منحوس چار دیواری تھی اور موت کا انتظار تھا۔ موت جو ہر لمحے ننگی تلوار کی طرح میرے سر پر لٹکی ہوئی تھی۔ میں کچھ نہیں جانتا تھا اس چار دیواری سے باہر کیا ہو رہا ہے اور کس رات سونے کے بعد مجھے جاگنا نصیب نہیں ہوگا۔ ہر بار جب دروازہ کھلتا یہی لگتا کہ افروزہ اور جیکسن کی طرف سے میرا بلیک وارنٹ جاری ہو گیا ہے اور کریہہ المنظر عشیر خان اپنی رائفل کی گولی میرے سینے میں اتارنے آیا ہے۔ میں نے اس چار

دیواری سے باہر کے حالات جاننے کے لئے عشیر خان سے بہت سر کھپایا۔ لیکن اس نے ایک بات کر کے نہیں دی۔ وہ ایک ایسے مجسمے کے طرح تھا جس کے منہ میں پتھر کی زبان بھی نہیں تھی۔

وہ میری اسیری کا آٹھواں نواں ہفتہ تھا۔ رات ہو چکی تھی لیکن نجانے کیوں عشیر خان نے آج مجھے نہ احاطے میں گھمایا تھا اور نہ ہی پابند سلاسل کیا تھا۔ قرب و جوار میں ایک نامانوس سی خاموشی طاری تھی۔ شاید آج پھر عشیر نے زیادہ مقدار میں دیسی شراب چڑھالی تھی اور انٹا غفیل پڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک روز اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ نشے میں دھت ہو کر وہ پتا نہیں کون سے راگ الاپتا رہا تھا۔ اس روز میں نے عشیر کی زبان سے اور بہت سی خرافات کے علاوہ رابو کا نام بھی سنا تھا۔ وہ غالباً نذیر سے رابو کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کی جوانی کو کچی گری سے تشبیہ دے کر کچر کچر کھانے کی خواہش بیان کر رہا تھا۔ اس کی ساری باتیں میرے پلے نہیں پڑی تھیں لیکن جو کچھ بھی میں نے سنا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ رابو اس کے دل میں گہری اتری ہوئی ہے۔

کافی دیر میں اپنی کوٹھڑی میں بوسیدہ کھاٹ پر پڑا اس غیر معمولی خاموشی پر غور کرتا رہا۔ پھر کھاٹ سے اتر کر دروازہ پر پہنچا، اسے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ اگر کمرے کا فرش پھٹ جاتا اور اندر سے کوئی نامعلوم مخلوق برآمد ہو جاتی تو مجھے اتنی حیرانی نہ ہوتی جتنی دروازہ کھل جانے پر ہوئی تھی۔ میں دلہیز پار کر کے تیزی سے باہر نکلا۔ مختصر برآمدہ تاریک تھا اور وسیع احاطے میں مکمل خاموشی تھی۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ اس وقت چار دیواری میں کوئی متنفس نہیں ہے۔ میں دو رویہ کاشت کی ہوئی سبزیوں کے درمیان چلتا بیرونی دروازے تک پہنچا۔ بیرونی دروازے کا قفل کنڈی میں جھول رہا تھا لیکن کنڈی کھلی تھی۔ آزادی کی خواہش برق بن کر میرے سراپے میں دوڑ گئی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ آج کئی ہفتے بعد میں باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ سیکڑوں سوالات ذہن میں کلبلا رہے تھے لیکن ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے سے زیادہ اہم کام یہ تھا کہ میں جلد از جلد یہاں سے دور نکل جاؤں۔ میں نے ایک رخ متعین کیا اور بھاگتا چلا گیا۔

ٹھیک تین گھنٹے بعد رات کے ایک بجے میں لاہور کے بند روڈ پر اپنے ایک دیرینہ دوست بشیر ناطق کے گھر رکشے سے اتر رہا تھا۔ یہ شخص فرنیچر کا کام کرتا ہے، اس کے علاوہ شعرو شاعری سے بھی شغف ہے۔ رات کے ایک بجے مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر

وہ ششدر رہ گیا۔ حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلا تو بغل گیر ہو کر مجھے اندر لے گیا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی، سر پر میلی کچیلی پٹی تھی اور لباس پر ابھی تک دو مہینے پہلے کے خونی دھبے تھے۔ ناطق کے گھر والے بھی جاگ گئے اور بے پناہ حیرت سے میرا جائزہ لینے لگے۔ ناطق کی زبانی پتا چلا کہ میری گمشدگی کی خبر دور دور تک پھیل چکی ہے۔ اس نے پندرہ بیس روز پہلے کے کئی اخبارات مجھے دکھائے۔ ایک روزنامے میں میری تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ منشی خادم حسین کی تصویر دیکھ کر میں چونک گیا۔ بے پناہ تجسس کے ساتھ جلدی جلدی میں نے تمام خبریں پڑھ ڈالیں۔ یہ خبریں میرے لئے غیر متوقع نہیں تھیں لیکن انہیں پڑھ کر سینے میں آگ بھڑکنے لگی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری گمشدگی کا سبب افروزہ اور جیکسن ہیں۔ افروزہ نے اپنے "پارٹنر" کے ساتھ مل کر اس سارے معاملے کو بڑی ہوشیاری سے ہینڈل کیا تھا۔ اس نے اپنے سوچے سمجھے بیانات سے تفتیش کا رخ باآسانی میرے قریبی ملازمین کی طرف موڑ دیا تھا۔ خاص طور پر منشی خادم حسین نشانہ بنا تھا، اور دو ہفتے پہلے پولیس نے اسے میرے سیف سے بیس ہزار روپے نقد اڑانے اور بعد ازاں مجھے اغوا کرانے کے الزامات میں گرفتار کر لیا تھا۔ افروزہ کے بیانات کے مطابق وقوعہ سے اڑتالیس گھنٹے پہلے کسی ملازم نے میرے سیف سے رقم نکال لی تھی۔ منشی خادم کے علاوہ سیف تک کوئی رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ "مجھے" بھی منشی پر شک تھا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی کاروائی عمل میں لائی جاتی میں حویلی سے اٹھوا لیا گیا۔ ناطق اور اس کے اہل خانہ بھی ان خبروں کو درست تسلیم کر رہے تھے لہٰذا ناطق نے مجھ سے پہلا سوال یہی کیا کہ میں خادم حسین کے چنگل سے کیسے نکلا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ سب کچھ میں اسے بعد میں بتاؤں گا فی الحال وہ فوراً کسی آدمی کو خوشاب بھیجے اور گاؤں سے تازہ ترین صورت حال معلوم کرائے۔ ناطق نے میری ہدایت پر عمل کیا اور اسی وقت اپنے ایک بااعتماد بندے کو گاؤں دوڑا دیا۔

یہ شخص اگلے روز شام کے وقت لاہور واپس پہنچا۔ اس وقت تک میں نہا دھو کر اپنی ہیئت بدل چکا تھا اور آئندہ اقدامات کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ اس شخص نے بتایا کہ میری بیوی افروزہ حویلی میں ہی ہے۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں اور پولیس بھی تندہی سے کیس کی تفتیش کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں پرسوں میرے دو زمین دار دوستوں کو بھی شامل تفتیش کیا گیا ہے۔ منشی خادم حسین کا دوسری بار جسمانی ریمانڈ لیا گیا ہے اور وہ مقامی تھانے میں ہے۔ اس شخص کی باتوں سے مجھے یہ بھی پتا چلا کہ جیکسن ابھی

تک حویلی میں ہے اور اتبلا کے ان دنوں میں افروزہ کی "ڈھارس" بندھا رہا ہے۔
جیکسن اور افروزہ بڑے اطمینان سے حویلی میں موجود تھے۔ اس کا مطلب تھا وہ میری طرف سے قطعی بے فکر ہیں' ان کا خیال ہے کہ میں جہاں پہنچا دیا گیا ہوں وہاں سے اپنی دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ ایسا سوچتے ہوئے دو سوال خود بخود ذہن میں ابھرتے تھے۔ پہلا یہ کہ مجھے قتل کیوں نہیں کیا گیا' اور دوسرا یہ کہ ان حالات میں میری رہائی کیسے عمل میں آگئی۔ پہلے سوال کا جواب زیادہ دشوار نہیں تھا۔ افروزہ اور جیکسن کا مقصد اپنے گناہ کا اخفا تھا اور وہ مجھے منظر سے ہٹا کر اس مقصد میں کامیاب رہے تھے ممکن تھا کہ کچھ دنوں تک وہ خود میں اتنا حوصلہ پیدا کر لیتے کہ میرا قتل انہیں آسان محسوس ہونے لگتا۔ دوسرا سوال خاصا توجہ طلب تھا۔ آخر ایکا ایکی ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ عشیر خان میرے پنجرے کا دروازہ کھول کر غائب ہو گیا تھا۔ کیا وہ کسی پولیس چھاپے سے خوف زدہ ہو کر بھاگا تھا یا کوئی تیسری پارٹی اسے اٹھا کر لے گئی تھی۔ یا پھر؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بہرحال یہ بات ظاہر تھی کہ جو کچھ بھی ہوا ہے میری بے وفا بیوی اور اس کے آشنا کے حق میں اچھا نہیں ہوا اور عنقریب میرے ہاتھ ان کی گردن پر ہوں گے۔ میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ افروزہ اور اس کے آشنا کا کچا چٹھا کھول کر قانون کے سامنے رکھ دوں اور انہیں عدالت سے قرار واقعی سزا دلوانے کی کوشش کروں لیکن اس میں دونوں گھرانوں کی زبردست بدنامی تھی اور میں ایک عورت کے جرم کی سزا درجنوں بے گناہوں کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ خاموشی سے حویلی واپس چلا جاؤں۔ جیکسن کو ذلیل کر کے وہاں سے نکال دوں اور بعد میں افروزہ کو بھی طلاق تھما دوں۔ میں نے دوسرا راستہ ہی اختیار کیا اور اگلے روز صبح دس بجے حویلی واپس پہنچ گیا۔

میں پختہ سڑک سے ایک کلو میٹر پیدل چل کر گاؤں پہنچا۔ میں بشیر ناطق کے لباس میں تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ منہ' سر چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ جب تک میں حویلی میں داخل نہیں ہو گیا' کسی کو میری آمد کا پتا نہیں چلا۔ میں سیدھا حویلی کے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ یہاں افروزہ' اس کے والد اور جیکسن کے علاوہ میرے چند عزیز بھی موجود تھے۔ مجھے یوں اندر آتے دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ زیادہ بری حالت افروزہ اور جیکسن کی ہوئی۔ میرے چچا آصف جاہ اور دوسرے عزیز دھاڑیں مارتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے کن انکھیوں سے جیکسن کی طرف دیکھا۔ وہ مٹی کا بت بنا کھڑا تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ زمین پھٹ جائے یا آسمان اسے نگل لے۔ غالباً اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا

کہ میں اس بندی خانے سے رہائی حاصل کر سکوں گا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کمرے سے نکل بھاگے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا اور اس کی خوفزدہ آنکھوں میں جھانک کر کہا "تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی مسٹر جیکسن۔"
"وائے ناٹ.......... وائے ناٹ" وہ بے حد کھسیانے انداز میں بولا۔ اس کا لمبا چوڑا بدن دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ اسی شام جیکسن نہایت خاموشی کے ساتھ حویلی سے غائب ہو گیا۔ افروزہ سے ابھی تک سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھنے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ بعد ازاں مجھے ملاقاتیوں نے گھیر لیا۔ میری واپسی کا سن کر سیکڑوں افراد حویلی میں امڈ آئے تھے۔ سو پچاس مجھ تک پہنچ گئے تھے اور کئی گنا باہر دروازوں پر کھڑے تھے۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ کبھی کبھی لوگوں کا خلوص اور پیار بھی وراثت میں ملتا ہے۔ ورنہ مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ میری واپسی کو اس طرح سراہا جاتا۔ احباب کو سنانے کے لئے میں نے ایک مبہم سی کہانی گھڑ لی تھی۔ یہ کہانی میری زبان سے بار بار "ری پیٹ" ہو رہی تھی۔ میں نے سارا الزام چند ایسے فرضی افراد پر دھر دیا تھا' جن سے میرا لین دین کا تنازعہ تھا اور وہ مجھے زبردستی ساتھ لے گئے تھے معلوم نہیں میرے اس بیان پر یقین کیا گیا یا نہیں اور اگر کیا گیا تو کس حد تک' بہرحال میں اصل معاملے کو چھپانے میں کامیاب رہا۔ شام کے کھانے کے بعد جب میں حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچا تو وہاں میری نگاہ ماماں پر پڑی۔ میں ایک عرصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی افسردگی مجھے کبھی نظر نہیں آئی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ معلوم نہیں اس پر کیا زیادتی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پاس بلایا۔ وہ حسب معمول سر جھکا کر اور سلام کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ وہ سینے میں کوئی زلزلہ چھپائے ہوئے تھی۔ دفعتاً میرا دھیان رابو کی طرف چلا گیا۔ میں نے نرمی سے پوچھا "رابو تو ٹھیک ہے۔"

یہ مختصر سا فقرہ بارودی فلیتے کے لئے چنگاری ثابت ہوا۔ ماماں کی آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے۔ اشکوں کا طوفانی ریلا بہہ نکلا۔ وہ اتنی شدت سے اور ایسے ٹوٹ کر روئی کہ دیواریں لرز اٹھیں۔ میں ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے چہرہ چادر کے دامن میں چھپا لیا تھا اور دلدوز گریہ کر رہی تھی۔

"کیا ہوا ماماں.......... کیا ہوا؟" میں بار بار پوچھتا چلا گیا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چاہتی بھی تو اپنے آنسوؤں اور ہچکیوں کو روک نہیں سکتی تھی۔ میرا دل ہول

کر رہ گیا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ دو تین ملازمائیں سر جھکائے خاموش کھڑی تھیں۔ چہروں پر کوئی دکھ بھری تحریر تھی۔ میں نے ملازمہ شکورن کو اپنے پاس بلایا "شکورن! کیا بات ہوئی ہے۔ رابو تو ٹھیک ہے؟"

شکورن کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ سب کے سامنے کچھ نہ بتا سکے۔ میں اسے لے کر کمرے میں آگیا' اور کہا کہ وہ میرے سامنے بیٹھ کر تسلی سے سب کچھ بتائے۔ کچھ دیر گڑبڑانے کے بعد شکورن نے کہا "مالک! لوگوں نے رابو کو گاؤں سے نکال دیا ہے............"

میں سناٹے میں رہ گیا "کیوں نکال دیا ہے؟"

"پیرو جی نے کہا تھا۔"

پیرو جی اس علاقے کا جھاڑ پھونک والا تھا۔ اس کے علاوہ حکمت بھی کرتا تھا۔ لوگ اسے بڑا دانا سمجھتے تھے۔ میں نے بھڑک کر پوچھا۔ "پوری بات بتاؤ۔ پیرو جی نے ایسا کیوں کہا تھا؟"

شکورن کے چہرے پر ایک بار پھر زبردست کشمکش کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ رک رک کر بولی "پیرو جی کا خیال تھا کہ رابو کا گاؤں میں رہنا ٹھیک نہیں ورنہ دوجے لوگ بھی بیمار ہو جائیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ رابو کو............ کک............ کوڑھ ہو گیا ہے۔"

میرے کان شائیں شائیں کرنے لگے۔ جی چاہا' ایک زوردار تھپڑ سامنے کھڑی شکورن کو مار دوں اور اس سے پوچھوں کہ دو مہینے پہلے تو وہ اچھی بھلی تھی اب کوڑھی کیسے ہو گئی ہے لیکن پھر خود پر ضبط کیا۔ شکورن بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ کوئی ڈھنگ کی بات مجھے بتا ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے اسے جھڑک کر باہر بھیج دیا' اور اپنے معتمد چوکیدار شکر الٰہی کو بلایا۔ شکر الٰہی گھبرایا ہوا اندر آگیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ میرے پوچھنے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ کیا پوچھا جائے گا۔ میں نے کمرے کو اندر سے کنڈی لگائی اور شکر الٰہی نے جو کچھ جانتا تھا' میرے سامنے اگل دیا۔ میں حیرت اور کرب میں غلطاں سنتا رہا۔ شکر الٰہی سے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

میری گمشدگی کے دو ہی روز بعد عشیر خان نے سر راہ رابو سے چھیڑ خانی کی اور دھمکی دی کہ وہ اسے اٹھا کر قبائلی علاقے میں لے جائے گا۔ رابو نے اس بات کی شکایت گھر آکر ماماں سے کی۔ آناً فاناً یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ پہلے ہی عشیر خان سے بے

حد متنفر تھے۔ ان کی نفرت دو چند ہو گئی اور وہ اس زیادتی کے خلاف متحد ہو گئے۔ حویلی میں میرے چاچا آصف جاہ سے شکایت کی گئی۔ انہوں نے حسب مقدور عشیر خان کو ڈانٹا ڈپٹا اور افروزہ سے بھی کہا کہ وہ اس شخص کو لگام دے کر رکھے۔ تاہم گاؤں کے لوگ اس رسمی کاروائی سے مطمئن نہیں ہوئے۔ انہیں خدشہ تھا کہ بدقماش عشیر خان پھر رابو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ گاؤں کا ایک خوش حال زمین دار حاجی نثار جو کاروباری حد تک میرا حریف بھی تھا' رابو اور ماماں کو عارضی طور پر اپنے گھر لے گیا۔ گاؤں کے دیگر افراد نے بھی اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ عشیر کی کوئی مجرمانہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ دو ہی ہفتے بعد یہ اڑی اڑی سی خبر ملی کہ رابو' عشیر خان سے ملنے چودھری کے پرانے ڈیرے پر جاتی ہے۔ باخبر لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ چند روز بعد اس خبر کی تصدیق اس طرح ہوئی کہ شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ گاؤں کے کچھ مہم جو لڑکوں نے رابو اور عشیر کو پرانے ڈیرے سے رنگے ہاتھوں جا پکڑا۔ عشیر تو چکمہ دے کر نکل گیا مگر رابو کی بہت درگت بنی۔ لوگ اسے مارتے پیٹتے گاؤں لائے اور معززین کے سامنے پیش کیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ رابو' عشیر کے جال میں کیسے پھنس گئی۔ پیرو جی کو بلایا گیا۔ انہوں نے فیصلہ صادر کیا کہ کوڑھی سے جسمانی تعلق رکھنے والی عورت لازماً کوڑھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا رابو کو فوراً اپنے گاؤں سے نکال دیا جائے۔ جسم کے تین کپڑوں میں رابو کو دھکے دے کر اور پتھر مار مار کر گاؤں سے نکال دیا گیا۔ لوگوں کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ماماں کے گھر کا سارا سامان اور ہر وہ شے جلا کر راکھ کر دی جس کا تعلق رابو سے تھا۔ ایک طرح سے یہ عشیر خان کے خلاف لوگوں کی دبی ہوئی نفرت کا اظہار بھی تھا۔ رابو کی بدقسمتی گاؤں سے نکل کر بھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ سر چھپانے کے لئے ایک نزدیکی قصبے "رنگوالی" میں پہنچی۔ یہاں اس کا ایک دور کا رشتے دار رہتا تھا۔ جونہی وہ قصبے میں پہنچی' اس کی رسوائی اور بدبختی کا اشتہار لگانے والے بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے سارا واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور اہل قصبہ کو بتایا کہ اس کوڑھی کو اپنے درمیان رکھنا ان کے لئے کتنا خطرناک ہو گا۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ پیرو جی کے حوالے نے پوری کر دی۔ لوگوں نے رابو کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا اور اسے مار بھگانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کسی موذی جانور کو ہانکا جاتا ہے وہ اسے ہانکتے ہوئے قصبے سے باہر لے آئے۔ جب یہ خبر قصبے سے باہر پہنچی تو کچھ "دانش مندوں" نے مشورہ دیا کہ ایسی منحوس عورت کو آبادی سے نکالنا ہی اس

"سنگین" مسئلے کا حل نہیں ہے۔ یہاں سے نکل کر وہ کسی اور بستی کے لئے خطرہ بن جائے گی۔ احسن یہ ہے کہ اسے مار دیا جائے یا مروجہ طریقے کے مطابق کہیں محصور کر دیا جائے۔ چند شرپسندوں نے شدید خوف کی جو فضا پیدا کر دی تھی اس نے سیدھے سادے دیہاتیوں کو ڈھنگ سے سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ ڈری سہمی اور لڑکھڑاتی ہوئی رابو کو گھیر کر قصبے کی حدود سے باہر ایک قدیم قبرستان میں پہنچا دیا گیا۔ اس قبرستان کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کھنڈر اور نامعلوم مقبرہ تھا۔ علاقے کے لوگ اس جگہ کو "بیگم کا مقبرہ" کہتے تھے۔ رابو کو قرنطینہ کے لئے اسی مقام پر کسی جگہ محصور کر دیا گیا۔ اس واقعے کو اب سات آٹھ روز ہونے کو آئے تھے اور قرب و جوار میں اس کی خاصی مشہوری ہو چکی تھی۔ شکر الٰہی خود وہاں نہیں گیا تھا اور اسے تازہ ترین صورت حال کا علم نہیں تھا۔

میں جو کچھ سن چکا تھا اس کے بعد میرے سر پر آسمان بھی ٹوٹ پڑتا تو مطلق حیرت نہ ہوتی۔ مجھے لگا جیسے میں پندرھویں صدی کا انسان نہیں، قبل مسیح کی کسی تاریک بستی کا باشندہ ہوں جہاں دکھ کے بجائے دکھی کو اور مرض کے بجائے مریض کو ختم کیا جاتا ہے، جہاں اشرف المخلوقات کی کھوپڑی میں جہالت خوف بن کر سمائی ہوئی ہے اور کالے علوم کی تیرگی میں توہمات کے دیو ناچ رہے ہیں.......... کتنے صدمے کی بات تھی۔ جہاں رابو کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا تھا وہ کوئی ایسا دور دراز یا تہذیب نا آشنا علاقہ نہیں تھا۔ پختہ سڑک صرف ایک میل کے فاصلے سے گزرتی تھی۔ بہت سے لوگ خود کو پڑھا لکھا بھی سمجھتے تھے۔ ان سب پڑھے لکھوں کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہوا تھا اور کسی کو توفیق مزاحمت نہیں ہوئی تھی۔

رابو پر گزرنے والی قیامت ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہی تھی۔ اس بارے میں سوچ کر میرا سینہ پھٹ رہا تھا۔ میرا دھیان فوراً رابو کی قریب ترین سہیلی کی طرف چلا گیا۔ جو کچھ وہ مجھے بتا سکتی تھی کوئی اور نہیں بتا سکتا تھا۔ خود رابو بھی نہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور راہداری میں آکر پاگلوں کی طرح چمپا کو آوازیں دینے لگا۔ میرے تیور دیکھ کر نوکر سہم گئے تھے اور حویلی میں سکوت مرگ طاری تھا۔ میری آوزیں سن کر چمپا بھاگتی ہوئی آئی اور میرے روبرو کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھا کر بولا۔

"دیکھو چمپا! جو کچھ پوچھوں ٹھیک ٹھیک بتا دینا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں

ہوگا۔"

وہ ایک دم رونے لگی۔ میں نے رونے دیا تاکہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا اور خوف بھی کم ہو جائے۔ کچھ دیر بعد جب وہ نسبتاً پرسکون ہوئی تو اس نے میرے استفسار پر ایک لرزہ خیز انکشاف کیا۔ اس نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان رک رک کر بتایا۔

"مالک! جب گاؤں والوں نے حویلی میں عشیر خان کی شکایت کی تو حاجی نثار، رابو کو اپنے گھر لے گیا۔ ایک روز رابو کو عشیر خان کا رقعہ ملا۔ اس رقعے میں عشیر خان کا نام کہیں نہیں تھا لیکن رقعہ دینے والے نے بتایا تھا کہ یہ عشیر خان کی طرف سے ہے۔ اس رقعے میں عشیر خان نے رابو کو لکھا تھا کہ آپ کی (میری) زندگی سخت خطرے میں ہے اور صرف عشیر خان ہی آپ کو بچا سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ بڑے سے بڑے آدمی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اس کا بھی اصول ہے کہ وہ وعدہ نہیں توڑتا۔ اس نے رابو سے کہا تھا کہ وہ اس سے ایک سودا کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ کسی کو بتائے بغیر پرانے ڈیرے پر اس سے ملے۔ یہ رقعہ پڑھ کر رابو کا برا حال ہو گیا تھا۔ وہ آپ کے لئے سخت پریشان تھی۔ پہلے اس نے یہ رقعہ بڑے مالک (میرے چچا) تک پہنچانے کا ارادہ کیا، لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ اس رات وہ خاموشی سے پرانے ڈیرے پہنچی.........." یہاں تک کہہ کر چمپا چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں پھر موسلا دھار برسنے لگیں اور زبان پر تالا لگ گیا۔ اس کے بتائے بغیر ہی میں سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ میرے پردہ سماعت پر ان الفاظ کے بم پھٹ رہے تھے جو چمپا نے کہے تھے اور نہ وہ کہہ سکتی تھی۔ صدقے اور واری جانے کے الفاظ میں نے بہت دفعہ کہے اور سنے تھے لیکن ان کا حقیقی مفہوم مجھ پر آج واضح ہو رہا تھا۔ چمپا نے اپنی ہچکیاں روکتے ہوئے کہا "اس کے بعد رابو روز رات کو پرانے ڈیرے پر جانے لگی۔ وہ گھر آکر سارا دن روتی رہتی تھی اور شام ہوتے ہی جانے کے لئے تیار ہو جاتی تھی۔ دس پندرہ روز تک کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی پھر ایک رات خوشیے ارائیں کے پتر اسلم اور اس کے یاروں نے ان دنوں کو.......... دیکھ لیا۔"

اپنا بیان ختم کر کے چمپا ایک بار پھر منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ اب مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو رہی تھی کہ دو روز پہلے میرے قفس کا دروازہ اچانک کیوں کھل گیا تھا۔ وہ یوں ہی نہیں کھلا تھا۔ اسے کھولنے کے لئے قربانی دی گئی تھی۔ اسے کھولنے کے لئے ایک عورت ہوس کی سیج پر لیٹی تھی اور موت کی دہشت ناک پرچھائیوں سے بغل گیر ہوئی تھی........ ہاں.......... میری آزادی کی قیمت چکانے کے لئے کوئی گلیوں میں رسوا ہوا

تھا۔ دھکے جھیلے تھے، پتھر کھائے تھے اور خاک و خون میں لتھڑا تھا۔ یہ سب کچھ اس عورت نے کیا تھا جسے میں نے قدم قدم پر ٹھکرایا تھا اور جو ہر ہر گھڑی میرے قدموں میں اپنے جوبن اور اپنی محبت کے پھول نچھاور کرتی رہی تھی۔ اب اس خاموش پجارن نے اپنا جسم و جاں بھی میرے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا اور دنیا بھر کی ملامتیں اپنے سر لے کر، دھتکاری پھٹکاری ہوئی کسی تاریک گڑھے میں اتر گئی تھی۔ رابو کا سادہ معصوم چہرہ میرے تصور میں ابھرا اور جسم کا رواں رواں رابو پکار اٹھا۔ وہ کہا کرتی تھی "آپ ہی تو میرے سب کچھ ہیں مالک" آج وہ اس فقرے کی عملی تفسیر بن کر میرے سامنے آئی تھی۔ اس نے ثابت کیا تھا کہ مجھ سے جدا اس کی کوئی ہستی نہیں۔ وہ سرتاپا میری تھی۔ میرے سپرد تھی۔ اس کے پیدا کرنے والوں نے ہی نہیں خود اس کے دل نے بھی اسے میرے سپرد کر رکھا تھا۔ میں اس کا مالک تھا، سرپرست تھا، محافظ تھا، میرے ہوتے ہوئے وہ بربادیوں کا لقمہ کیسے بن سکتی تھی۔ "نہیں رابو.......... نہیں میری جان میں تجھے مرنے نہیں دوں گا" میرے جسم کا ہر رواں پکار اٹھا۔ میں بھیگی آنکھوں اور دہکتے سینے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور حویلی کے صدر دروازے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

O------------☆------------O

رات تاریک اور سرد تھی۔ درختوں کے سائے تیز ہوا میں بھوتوں کی طرح رقصاں تھے۔ میں نے جیپ کو کچے راستے پر اتار کر انجن بند کیا۔ لائٹس آف کیں، اور گرم چادر جسم کے گرد لپیٹتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اعشاریہ اٹھائیس کا لوڈڈ ریوالور بمع گولیوں والی پٹی کے میری کمر سے بندھا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھ کر سمت کا اندازہ کیا اور تھوڑی بلندی پر واقع درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھا۔ اس جھنڈ کے ایک طرف رنگوالی قصبہ تھا جہاں رابو گاؤں بدر ہونے کے بعد پناہ لینے گئی تھی اور دوسری طرف پیرو جی کا گاؤں کھن پورہ تھا۔ چہار سو آہنی خاموشی کا راج تھا۔ اس خاموشی کو وقفے وقفے سے کتوں اور گیدڑوں کی دور افتادہ آوازیں توڑتی تھیں۔ لیکن یہ اتنی مدھم تھیں کہ خاموشی ہی کا حصہ محسوس ہوتی تھیں۔ جیسے آئینے پر نرم شاخ کی ضرب لگائی جائے یا سفید سطح پر سفید چاک سے لکھا جائے۔ میں نے اونچے اونچے سرکنڈوں کے درمیان چل کر ایک خشک برساتی نالا پار کیا اور اس ٹیلہ نما جگہ پر آ گیا جہاں درختوں کا جھنڈ دکھائی دے رہا تھا۔ ٹیلے کے دامن میں ایک جگہ روشنی کی کرن نظر آئی۔ میرے قدم خود بخود اس کرن کی طرف اٹھ گئے۔ ابھی پندرہ بیس گز ہی آگے گیا تھا کہ ایک بھاری بھرکم آواز نے مجھے چونکا

دیا "کون ہے اوئے؟"

میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ بائیں طرف سرکنڈوں اور گھاس پھونس میں گھری ہوئی مقبرہ نما جگہ تھی۔ بہت شکستہ عمارت تھی۔ میں دن کی روشنی میں سیکڑوں بار یہاں آچکا تھا۔ میرے بچپن کی کئی سہانی یادیں انہی نشیب و فراز سے وابستہ تھیں لیکن آج یہ سب کچھ بہت بدلا بدلا سا نظر آیا۔ سنا تھا کہ محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے پچھلے دنوں مقبرے میں کوئی چوکیدار متعین کیا گیا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس پر پھینکی۔ اندازہ درست نکلا۔ ملیشیا کی شلوار قمیص اور ٹوپی میں وہ چوکیدار ہی تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اندر سے ایک شخص اور نکل آیا۔ چوکیدار نے پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا کر رہا ہوں؟ میں نے اس کے دونوں سوالوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "یہاں کسی بیمار لڑکی کو رکھا گیا ہے؟"

چوکیدار نے پوچھا "لیکن تم کون ہو؟"

میں نے بے انتہا سرد لہجے میں کہا "تم میرے سوال کا جواب دو۔ کیا پیرو جی کے کہنے پر یہاں کسی لڑکی کو رکھا گیا ہے؟"

چوکیدار کا ساتھی اکڑ کر بولا "میں پیرو جی کا مرید ہوں۔ مجھ سے بات کرو۔ تم تھانیدار ہو یہاں کے جو ایسے پوچھ رہے ہو؟"

میرے صبر کا پیمانہ پہلے ہی لبریز ہو رہا تھا۔ میرا زور دار تھپڑ چیلے کے گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ادھیڑ عمر چوکیدار نے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی میں نے قمیض کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں ریوالور تھا۔ اپنی جانب اٹھے ریوالور کو دیکھ کر دونوں افراد ٹھٹک گئے۔ وہ جان گئے تھے کہ ان کا واسطہ کسی عام شخص سے نہیں پڑا۔ میں نے ایک قدم چوکیدار کی طرف بڑھایا اور زور دے کر پوچھا "کہاں ہے وہ لڑکی؟"

چوکیدار نے بیس تیس گز دور روشنی کی کرن کی طرف اشارہ کیا اور بولا "اس کوٹھری میں ہے.......... لیکن تم وہاں نہیں جا سکتے۔" وہ خاصا نڈر شخص تھا اور ریوالور سامنے دیکھ کر بھی خود اعتمادی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"تمہارا باپ بھی مجھے نہیں روک سکتا۔ آزمانا چاہتے ہو تو قصبے سے پندرہ بیس آدمی اور منگوا لو، اور اپنے پیرو جی کو بھی بلا لو۔ میں تم سب کی لاشوں سے گزر کر وہاں تک پہنچ جاؤں گا" چوکیدار اور اس کے تنومند ساتھی کے عقب میں ایک قد آور پالتو کتا

پورے زور و شور سے بھونک رہا تھا۔ بھونکنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زنجیر کو جھٹکے بھی دے رہا تھا۔ پتا نہیں یہ زنجیر کس وقت کھل گئی یا ٹوٹ گئی۔ کتا کمان سے نکلے تیر کی مانند میری طرف آیا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو موذی جانور میرا گلا دبوچ لیتا۔ میں نے تڑپ کر خود کو بچایا اور گھوم کر بے دریغ دو گولیاں کتے کے جسم میں اتار دیں۔ پرشور دھماکوں کے ساتھ ہی کتا اچھل کر جھاڑیوں میں جا گرا۔ یہ سب کچھ ایک ساعت کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ میرے خوفناک تیور دیکھ کر دونوں افراد بری طرح سہم گئے۔ میں نے اوپر تلے ٹرائیگر دبایا اور ان دونوں کے قدموں میں چنگاریاں بکھر گئیں۔ خود کو گولیوں کی زد میں پاکر وہ بدکے اور سرپٹ بھاگتے چلے گئے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ دونوں افراد مقبرے کے اندر آگ جلائے بیٹھے تھے اور تاش وغیرہ کھیل رہے تھے.......... ریوالور دوبارہ بھرنے کے بعد میں نے ہولسٹر میں لگایا اور اس کوٹھری کی طرف بڑھا جس کے دروازے سے مدھم سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ تانک چندی اینٹوں کی بنی ہوئی گول سی کوٹھڑی تھی۔ جیسے کسی مینار کا زیریں حصہ ہو۔ نہ کوئی کھڑکی' نہ روشن دان' دروازے کے باہر سے وزنی کنڈی چڑھی ہوئی تھی لیکن تالا نہیں تھا۔ میں نے کنڈی اتار کر دروازہ کھول دیا۔ اندر دیے کی مدھم روشنی تھی۔ کچے فرش پر بستر کے نام پر بوسیدہ چیتھڑے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایلومینیم کے چند مڑے تڑے ہوئے برتن دکھائی دیے۔ کوٹھری میں کوئی ذی حس نہیں تھا۔ بس ایک کونے میں بوسیدہ کپڑوں کی گٹھری سی رکھی تھی۔ میں نے اس گٹھری پر غور کیا اور سرتاپا کانپ گیا۔ خدا کی پناہ! اس گٹھری میں دو سہمی ہوئی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں' میں ان آنکھوں کو بمشکل پہچان سکا۔ یہ رابو تھی۔ اس کے چہرے کا جو حصہ مجھے نظر آرہا تھا وہ اس عمارت ہی کا جزو دکھائی دیتا تھا۔ کھنڈر' ویران اور آسیب زدہ' مجھے دیکھ کر رابو کی آنکھیں دہشت سے پھٹتی اور چیتھڑوں میں دھنستی چلی جارہی تھیں۔ میں نے ٹارچ اس کے چہرے سے ہٹائی اور خود کو دیے کی روشنی میں لے آیا۔ اب گٹھری میں دھنسی ہوئی آنکھوں نے مجھے پہچان لیا تھا.......... رابو مجھے دیکھتی چلی گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے وہ چیخ مارے گی اور "چھوٹے مالک" کہہ کر مجھ سے لپٹ جائے گی لیکن پھر ایک دم وہ آنکھیں بجھ گئیں۔ کھلتی ہوئی گٹھری ایک بار پھر بندھ گئی۔ بندھ کر گوشے میں سمٹ گئی' سمٹ کر بے جان ہو گئی۔

"رابو" میں نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا اور زخموں سے چور شخص کے مانند اس

کے سامنے ڈھیر ہو گیا۔ اب اس کا چہرہ میرے مقابل تھا۔ زرد' اترا ہوا چہرہ جس پر آویزاں دو خوب صورت ہونٹ مرجھائے مرجھائے تھے لیکن اس کے باوجود یہ سب کچھ دلکش تھا۔ میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھائے تو وہ اور سمٹ گئی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں نے اسے چھونا چاہا تھا اور اس نے بدن چرایا تھا۔ ورنہ وہ تو میری آنکھ کے اشارے پر ریشمی تھان کے مانند کھلتی چلی جاتی تھی۔ "نہ چھوٹے مالک" اس نے لہجے میں قرنوں کا دکھ اور خوف سمیٹ کر کہا "مجھے ہاتھ نہ لگانا.......... میں کوڑھی ہوں.......... مجھے نہ چھونا۔"

"بکواس بند کر" میں نے بے پناہ دکھ سے کہا "کون کہتا ہے تو کوڑھی ہے۔ کہاں ہے تیرا کوڑھ۔ دکھا مجھے.......... دکھا مجھے اپنا کوڑھ" میں نے چیتھڑوں کی گٹھری میں سے اس کے دونوں ہاتھ نکالے' دونوں پاؤں دیکھے' کہیں کوئی علامت نہیں تھی۔ صرف وہ لرز رہی تھی۔ یہ لرزہ مرض کے سبب نہیں' خوف کے سبب تھا۔

وہ ہاتھ جوڑنے لگی' "نہیں مالک' میرے قریب نہ آؤ مجھ پر رحم کرو۔ یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے ٹارچ ایک جانب پھینکی اور دونوں ہاتھوں سے اس سکڑی سمٹی گٹھری پر پل پڑا نجانے وہ کس انوکھے جذبے کی لہر تھی جو میرے پورے وجود میں پھیل گئی تھی۔ میں بے پناہ وارفتگی سے اسے چومنے لگا' سہلانے لگا' میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے۔ ان گولوں کی گونج میں رابو کی منت سماجت بیکار تھی۔ دفعتاً اس کوٹھری سے باہر شور سنائی دیا۔ لگا جیسے بہت سے افراد باتیں کرتے ہوئے آرہے ہوں۔ چوکیدار اور اس کے ساتھی نے میری توقع سے زیادہ تیزی دکھائی تھی۔ وہ گاؤں سے حمایتوں کو لے کر پہنچ گئے تھے میں نے رابو کو چھوڑا اور قمیص کے نیچے سے ریوالور نکالتا ہوا کوٹھری کے دروازے پر پہنچا۔ سامنے کھنڈر میں کئی لالٹینیں چمک رہی تھیں اور لاٹھیوں اور لاٹھی برداروں کے ہیولے نظر آرہے تھے پھر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔

"اوئے' کون ہو تم۔ باہر نکلو۔"

اس کے ساتھ ہی کسی نے اوپر تلے کئی ہوائی فائر کر دیے۔ صورت حال نازک تھی لیکن نجانے کیا بات تھی' میرے ذہن میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور ریوالور تانے باہر آگیا۔ دو تین ٹارچوں کی روشنی مجھ پر پڑی۔ پھر چوکیدار کی آواز آئی "ہاں.......... یہی کتا ہے.......... یہی ہے وہ۔"

"ٹھہرو" ایک دوسری آواز نے چوکیدار کو بدکلامی سے روکا۔ اس کے بعد ایک دراز قد شخص ہجوم سے نکل کر آگے آیا۔ اس کی ٹارچ کا روشن دائرہ میرے چہرے پر تھا "اوہ! یہ آپ ہیں چوہدری صاحب" ٹارچ والے کی متحیر آواز ابھری۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی میرے طرف بڑھے ان میں سے کئی ایک نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی تنی ہوئی لاٹھیاں جھک گئیں اور لہجے نرم پڑ گئے۔ مجھے سب سے پہلے شناخت کرنے والا قصبے کے پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا "یہ مراد پور کے چوہدری جہانداد صاحب ہیں۔ آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔" مجمع میں سرگوشیاں ابھریں اور وہ کائی کی طرح پھٹنے لگا۔ گھنی مونچھوں والا چوکیدار سٹپٹایا ہوا کبھی میری طرف دیکھتا تھا اور کبھی اپنے مردہ کتے کی طرف ماسٹر فیض محمد نے کہا۔

"چودھری صاحب! آپ نے ہمیں عزت بخشا ہی تھی تو پہلے بتا دیا ہوتا۔"

دوسرے افراد بھی معذرت کے کلمات ادا کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ چوکیدار کو لعنت ملامت کر رہے تھے۔ اچانک میرا دھیان رابو کی طرف چلا گیا۔ میں نے ریوالور ہولسٹر میں لگا کر ماسٹر فیض کے ہاتھ سے ٹارچ لی اور واپس کوٹھری کی طرف آیا۔ کوٹھری میں آتے ہی میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔ رابو اب وہاں نہیں تھی۔ میں یہاں سے نکلا تو دروازہ کھلا تھا۔ وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر نکل گئی تھی۔ میں تیزی سے باہر آیا "رابو!" میری آواز کھنڈر میں دور تک گونجی۔ میرے انداز نے موقعے پر موجود لوگوں کو چونکا دیا۔ وہ سب متجسس ہو کر میری طرف بڑھے۔ میں نے ماسٹر فیض سے کہا۔

"لڑکی کوٹھری میں نہیں ہے۔ اسے تلاش کرو۔"

لوگ لالٹینیں اور ٹارچیں لے کر چاروں طرف لپکے.......... یخ بستہ ہوا کھنڈر سے سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھی۔ بلند و بالا درختوں کے ہیولے ان سیٹیوں کی دھن پر دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ رابو کے نکل جانے پر اظہار مسرت کر رہے ہوں۔ یکایک میرے سینے کے اندر کوئی شے چھناکے سے ٹوٹی اور ایک انتہائی سرد سیال بہہ کر میرے پورے جسم میں پھیل گیا۔ میں بے دم ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ کسی آواز نے میری اندر سے پکار کر کہا۔ "چودھری جہانداد! رابو اب تجھے نہیں ملے گی۔"

O------------☆------------O

اس طوفانی شب اور اس شب کے بعد ان گنت شب و روز تک رابو کو مسلسل تلاش کیا گیا لیکن اسے نہ ملنا تھا' نہ ملی۔ رابو کی گمشدگی کا صدمہ۔ جان لیوا تھا لیکن "

صدمے نے میری جان نہیں لی۔ مجھے زندہ رکھا اور لمحہ لمحہ میرے جسم سے زندگی کشید کرتا رہا۔ یہ عمل ایسا کرب ناک تھا کہ میں زمین پر پچھاڑیں کھاتا تھا اور دیواروں سے سر ٹکراتا تھا لیکن رابو کی پہنائی ہوئی زنجیروں کو توڑنا میرے بس میں میں نہیں تھا۔

یہ سارا عذاب میری تنہائیوں سے وابستہ تھا۔ عام لوگوں کے سامنے میں خود کو بالکل نارمل رکھے ہوئے تھا اور اپنے اردگر پھیلے ہوئے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عشیر خان' افروزہ کو اپنی وفاداری کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرنے کے بعد غائب ہو گیا تھا۔ میرا رقیب رو سیاہ جیکسن بھی میری واپسی کے روز ہی گاؤں سے رفو چکر ہو گیا تھا۔ بعد ازاں پتا چلا' وہ یہاں سے بھاگا تو امریکا جا کر سانس لی تھی۔ منشی خادم حسین پر کیس ختم ہو گیا تھا اور اب ایک بار پھر وہ میرا دست راست تھا۔ میرے اغوا کے معاملے میں تو وہ بے قصور تھا ہی' سیف سے رقم غائب ہونے میں بھی اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ سارا ناٹک افروزہ ہی کا رچایا ہوا تھا۔ افروزہ میری آمد کے بعد فقط دو روز حویلی میں رہی' اس کے بعد میکے جا بیٹھی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اب میرے پاس اس کے لئے "طلاق" کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس معاملے میں پہل کرتے ہوئے اس نے خود مجھ پر خلع کا کیس کر دیا۔ میں ایسے بھی خوش تھا۔ جہیز میں جو کچھ آیا تھا سب اسی کے نام تھا۔ عدالت میں فیصلہ ہوتے دیر نہیں لگی اور اس بیش قیمت اور خوب صورت وبال سے ہمیشہ کے لئے میری جان چھوٹ گئی۔

دھیرے دھیرے سب کچھ معمول پر آنے لگا۔ لوگ بھولنے لگے کہ اس گاؤں میں کچھ انہونے واقعات ہوئے تھے۔ خاموش طبع رابو' منکسر المزاج دارا' خوف ناک عشیر خان اور بارعب و خوش جمال افروزہ کی صورتیں ذہن میں دھندلانے لگیں.......... صرف ماماں تھی اور میں تھا' جنہیں سب کچھ روز اول کی طرح یاد تھا۔ جن کے تصورات میں ہمہ وقت انگارے بھرے رہتے تھے۔ تنہائی میں رابو کی یاد میرے دل و دماغ پر آتشیں کوڑے برساتی اور میں تڑپ تڑپ جاتا۔ کچھ معلوم نہیں تھا' وہ کہاں ہے' ہے بھی یا نہیں..........
لیکن کبھی کبھی امید کے پانیوں سے یقین کی ایک بلند و بالا لہر اٹھتی اور میرے سینے کے ریگستان میں جل تھل کر دیتی۔ مجھے لگتا ایک نہ ایک دن رابو ضرور آئے گی۔ کسی سنسان دوپہر' اداس شام یا اندھیری رات میں اس کا ہاتھ میرے دروازے پر دستک دے گا اور درد کا لامتناہی موسم ایک ہچکی سے دم توڑ دے گا' لیکن یہ جان بخش واقعہ کیوں رونما ہو گا' مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ نہ ہی یہ معلوم تھا کہ کب رونما ہو گا۔ شاید ابھی' شاید دو تین

برس بعد یا شاید اس وقت جب زندگی کی بساط لپیٹنے کے لئے موت کے ہاتھ حرکت میں آچکے ہوں گے۔ مرنے والے اپنے لواحقین کو آنسو اور آنسوؤں کے بعد چین دے جاتے ہیں۔ لیکن جو کھو جاتے ہیں وہ آنسو دے کر چین اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ میرے پاس بھی آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کبھی کبھی یہ بھیگی ہوئی آنکھیں خود بخود دروازے کی طرف اٹھ جاتیں اور لگتا وہ ابھی دروازہ کھولے گی اور سر جھکا کر کہے گی "جی چھوٹے مالک۔"

اسی طرح دو برس گزر گئے۔ وہ گرمیوں کی ایک حبس زدہ شام تھی۔ میں فارم سے تھکا ماندہ لوٹا تھا اور حویلی کے تالاب میں اترنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک ملازم بھاگا ہوا آیا تھا۔ اس نے لرزاں لہجے میں بتایا کہ حویلی کے دروازے پر رابو آئی ہے۔ وہ سخت بیمار ہے۔ اس کے ساتھ ایک باریش شخص بھی ہے۔ چند لمحوں کے لئے میں سکتے میں رہ گیا۔ کانوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر تولیے کا گاؤن پہن کر بھاگتا ہوا حویلی کے دروازے پر پہنچا۔ سب سے پہلے میری نگاہ ایک چارپائی پر پڑی جس پر ہڈیوں کا ایک ناقابل شناخت ڈھانچا رکھا تھا۔ چند اجنبی چہروں کے علاوہ ایک باریش شخص بھی یہاں موجود تھا۔ میں نے چارپائی پر پڑے ہوئے ڈھانچے کو پہچان لیا' وہ رابو ہی تھی۔ آنکھیں سفید' چہرہ زرد اور سانس سینے میں اٹکی ہوئی۔ اس حالت میں بھی اس کے سر پر اوڑھنی تھی جس نے اس کا نصف چہرا چھپا رکھا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید رابو کے اندیشے درست تھے' وہ اس مرض میں مبتلا ہو چکی ہے جس کا شکار عشیر خان تھا۔ تاہم جب میں نے غور سے اس کا سراپا دیکھا تو یہ خیال غلط محسوس ہوا۔ ہڈیوں پر منڈھی ہوئی اس کی جلد صاف و شفاف تھی۔ میری نگاہ میں چند برس پہلے کا وہی منظر گھوم گیا جب اسی طرح رابو کی ماں حویلی کے دروازے پر آئی تھی۔ مجھ سے مرنے کی "اجاجت" لینے کے لئے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا "آج رابو بھی یہی درخواست لے کر آئی ہے۔" دل سینے میں پھٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا۔ میں لڑکھڑا کر بے اختیار رابو پر جھکا۔ وہ بڑے سکون سے لیٹی تھی۔ آنکھیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ "رابو........... رابو" میں نے اس مشت استخواں کو جنجھوڑ ڈالا۔ وہ خاموش رہی۔ شاید بول ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی التجا تھی جو چند برس پہلے اس کی ماں کی آنکھوں میں تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ ذہن میں رابو کے متعلق سیکڑوں سوالات تھے لیکن جواب ایک ہی تھا...........وہ قریب المرگ ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں کہا "مجھ سے اجازت لینے

آئی ہو نا۔ مرنے کی اجازت لینے آئی ہو نا........... نہیں اجازت میری طرف سے کوئی اجازت نہیں ہے..........."

میں نے باریش شخص سے پوچھا "بابا جی! کہاں سے لائے ہو اسے؟" باریش شخص نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بہ آہستگی چلتا مجھے ایک طرف لے گیا۔ اس شخص نے مختصر وقت میں جو کچھ بتایا اور اس کی باتوں سے میں نے جو نتائج اخذ کئے ان سے پتا چلا کہ دو برس پہلے "بیگم کے مقبرے" سے روپوش ہونے کے بعد رابو نے خود کشی کی کوشش کی تھی (رابو کی یہ کوشش اس بے پناہ خوف کے سبب تھی جو کوڑھ کے حوالے سے اس کے ذہن میں پیدا کیا جا چکا تھا) رنگوالی سے دس میل دور پختہ سڑک پر رابو اینٹوں سے بھرے ہوئے ایک ٹرک کے سامنے کود گئی تھی۔ ڈرائیور نے حاضر دماغی سے کام لیا۔ وہ مرنے سے بچ گئی لیکن شدید زخمی ہوئی۔ اس کی پچھلی پسلیوں میں سخت چوٹ آئی تھی۔ ڈرائیور جو ڈرا ہوا بھی تھا' اسے ٹرک میں ڈال کر فیصل آباد کے اسپتال لے گیا۔ یہاں رابو کی کمر کا ایک آپریشن ہوا اور وہ تین ماہ زیر علاج رہی۔ وہ نیم تندرست ہو گئی تو ٹرک ڈرائیور اسے اپنے گھر لے گیا۔ وجہ یہ تھی کہ رابو نے ہزار کوشش کے باوجود اپنا پتا ٹھکانا بتانے سے انکار کیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور یہی باریش شخص تھا جو میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی بیٹیوں کی طرح رابو کی نگہداشت کی۔ چار پانچ ماہ بعد رابو کی تکلیف پھر بڑھ گئی اور وہ بستر سے ہلنے جلنے کے قابل نہ رہی۔ اسے پھر اسپتال پہنچایا گیا جہاں سے بغیر کسی افاقے کے وہ دو ماہ بعد پھر گھر آگئی۔ غریب ڈرائیور جو کر سکتا تھا وہ کر چکا تھا۔ اب اس نے گھر ہی میں دیہاتی طرز کا علاج معالجہ شروع کیا۔ رابو کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی اور اب وہ قریب المرگ تھی۔ چند روز پیشتر رابو نے پہلی مرتبہ ڈرائیور ابراہیم کو بتایا کہ اس کا تعلق خوشاب کے مضافاتی گاؤں مراد آباد سے ہے۔ اس نے ابراہیم سے درخواست کی کہ وہ اسے ایک بار گاؤں لے جائے۔ جب تک وہ اس گاؤں نہیں جائے گی اس کی مشکل آسان نہیں ہوگی۔ نتیجے میں ابراہیم اسے اپنے ٹرک پر خوشاب لایا تھا اور وہاں سے گاؤں لے آیا تھا۔

O------------☆------------O

قارئین! یہاں میں اپنی کہانی ختم کرتا ہوں۔ رابو........... زندہ ہے اور تیزی سے صحت یاب ہو رہی ہے۔ پیسے میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ میں اسی رات رابو کے ساتھ لاہور آگیا تھا۔ اور دو روز بعد ہم ایک پاکستانی ڈاکٹر کے ہمراہ آسٹریا روانہ ہو گئے تھے۔

"ویانا" مسیحا صفت ڈاکٹروں کی بے حد مہنگی مارکیٹ ہے۔ دنیائے طب کے قابل ترین افراد ہاتھوں میں ترازو لئے کھڑے ہیں۔ آپ اس ترازو کے ایک پلڑے میں دولت رکھتے جائیں وہ دوسرے پلڑے میں اپنا ہنر رکھتے جائیں گے۔ میں نے اس مارکیٹ میں پیسے کے زور پر ایک بے حد مہنگے آرتھوپیڈک سرجن سے رابطہ قائم کیا اور روتے ہوئے اس سے کہا "اے مسیحا صفت! یہ ڈھانچا جو تیرے سامنے پڑا ہے اس میں ایک نہیں دو انسانوں کی جان ہے۔ مجھے آسمان پر خدا کا اور زمین پر تیرا سہارا ہے۔ یہ سادے چیک ہیں' جو چاہو ان پر بھرلینا۔ اس کے بعد میں مصلا بچھا کر سجدے میں گر گیا تھا۔

مجھے ویانا میں اب سولہ ہفتے ہو چکے ہیں اور اس دوران مراد آباد میں میری بیس مربع زمین فروخت ہو چکی ہے۔ جو باقی رہ گئی ہے وہ بھی میں رابو کی ایک مسکراہٹ پر قربان کر سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مسکراہٹ میرے نصیب میں ضرور ہو گی۔ اس لئے کہ میں نے سچے دل سے اس مسکراہٹ کی تمنا کی ہے۔ پتا نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب سے میں نے ذہن پر دل کو فوقیت دینا شروع کر دی ہے۔ وہ کوڑھ جس نے میری جمالیاتی حس کو "بے حس" کر رکھا تھا' خود ہی دور ہو گیا ہے۔ ہر دم اعداد و شمار کے چکر میں رہنے والا شخص اب پھولوں سے پیار کرتا ہے۔ اسے نیلے آسمان پر تیرتی سفید بدلیاں اچھی لگتی ہیں' اور بارش' جب وہ مسلسل کھڑکیوں پر برستی ہے' اور بچے جب وہ قلقاریاں مارتے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ماضی کے اس ہوشیار کاروباری شخص کو اب چھوٹے چھوٹے دھوکے کھانا بھی اچھا لگتا ہے۔

رابو کا علاج وقت طلب ہے لیکن بہتری کے آثار مسلسل نمودار ہو رہے ہیں۔ وہ کبھی کبھی تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہے' میں اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا ہوں۔ کل جب ہم اکیلے تھے' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "رابعہ' مجھے چھوٹے مالک مت کہا کرو۔"

وہ لرز کر بولی "نہیں چھوٹے مالک! مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں بے ساختہ مسکرا دیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولا "میں تم سے یہ لفظ چھین لوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھ تم سے شادی ہی کیوں نہ کرنی پڑ جائے۔"

وہ شرما گئی تھی اور میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جو عورت بستر علالت پر شرما جائے وہ بہت جلد اچھی ہو جاتی ہے۔

انوکھا لاڈلا

اسے بہت کم عمری میں پیار ہو گیا تھا۔ جوں جوں وہ جوان ہوا اس کی محبت بھی جوان ہوتی گئی۔ ایک چہرہ ایسا اس کی آنکھوں میں بسا کہ باقی سب کچھ بھول گیا۔ کہانیاں سنانے والی ایک ایسی آواز اس کے کانوں میں سمائی کہ باقی ہر آواز دب کر رہ گئی۔ وہ اپنی محبت کو حرف آخر سمجھتا تھا' لیکن حرف آخر تو کوئی نہیں ہوتا۔ وہ چند لمحوں کے لئے بھٹک گیا اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو منزل اوجھل نظر آئی..... منزل' جو ایک عورت تھی..... عورت جس کے دل کی گہرائی کوئی نہیں جان سکا۔

یہ جاوید عرف جیدی کی کہانی ہے۔ اسی کی زبانی مجھ تک پہنچی۔ ہاں اس کہانی کے چند گوشوں سے ایک دوسرے کردار نے بھی پردہ اٹھایا۔ میں اس کہانی کو جیدی کے حوالے سے ہی پیش کر رہا ہوں۔

جاوید عرف جیدی نے شمیم کو سب سے پہلے اپنے ساتھ والی چارپائی پر لیٹے دیکھا تھا۔ وہ صبح سو کر اٹھا تھا۔ اٹھا کیا تھا' اٹھایا گیا تھا۔ ماں نے دھیرے دھیرے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر اور بال سہلا سہلا کر اسے بیدار کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس کے ابا بیٹھک میں جا چکے ہیں۔ وہ جلدی جلدی نماز پڑھ کر سپارہ پڑھنے پہنچ جائے۔ جیدی برے برے منہ بناتا چارپائی سے اترا اور اس وقت اس کی نگاہ شمیم پر پڑی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے بالوں کی کچھ لٹیں اس کے سپید رخسار پر کنڈلی مارے بیٹھی تھیں۔ پہلی نظر ہی میں وہ جیدی کو بھلی لگی۔

اس نے ماں سے پوچھا "امی' یہ کون ہے؟"

ماں نے لاڈ سے جیدی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی "تیری آپی ہے' ڈسکہ سے آئی ہے۔ رات کو جب تو سو گیا تھا تو تیرے چچا صدیق اسے یہاں چھوڑ گئے تھے۔"

"کون سے چچا صدیق؟" جیدی نے سراپا سوال بن کر پوچھا۔

"وہی ڈسکے والے چچا جو پچھلی سردیوں میں تیرے لئے گاؤں سے باداموں والا گڑ لے کر آئے تھے اور پھر تو میلہ دیکھنے ان کے ساتھ گاؤں بھی گیا تھا۔"

جیدی کے ذہن میں ایک دراز قامت مونچھوں والے شخص کا ہیولا ابھر آیا۔ یہ شخص ان کے دور کے عزیزوں میں سے تھا۔ چونکہ لاہور میں کام کرتا تھا اس لئے کبھی کبھی ان کے ہاں آتا تھا' اتنے میں بیٹھک کی طرف سے جیدی کے ابا کی گرجدار آواز آئی۔

"شفقت! ابھی جیدی نہیں اٹھا" جیدی چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آگیا۔ غسل خانے کی طرف جاتے جاتے اس نے ایک نظر پھر محو خواب لڑکی پر ڈالی اور دروازے کی دہلیز سے ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔

جیدی کے لیے تفریح کے مواقع بہت کم مہیا ہوتے تھے۔ وہ والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اور اکلوتی اولاد کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ہوتا ہے کہ اسے ہروقت نگاہ میں رکھا جاتا ہے۔ دو گھڑی کے لئے وہ نظروں سے اوجھل ہوتا تو ماں کی جان پر بن جاتی تھی۔ اوپر نیچے نوکر دوڑائے جاتے تھے' گلی محلے میں تلاش شروع ہو جاتی تھی.......... یہی وجہ تھی کہ جیدی کی زیادہ تر مصروفیات گھر کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ اسکول جانا ابھی اس نے شروع ہی نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اسکول کی عمر کو نہیں پہنچا تھا۔ ابا کی ڈائری میں لکھی ہوئی تاریخ پیدائش کے مطابق دسمبر میں اسے آٹھ سال کا ہوجانا تھا۔ اسکول نہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ جیدی کے والدین اسے کم از کم پانچویں تک گھر ہی میں پڑھانا چاہتے تھے۔ ان کا متفقہ خیال تھا کہ جیدی کو چھٹی کلاس میں داخل کرایا جائے۔

جیدی کے والد نثار صاحب سیکرٹریٹ میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ معقول تنخواہ تھی اس کے علاوہ گاؤں میں بھی چار پانچ ایکڑ زمین تھی۔ اس زمین سے نہ صرف سال بھر کا اناج آجاتا تھا بلکہ اضافی آمدنی بھی ہوتی تھی۔ لاہور کی ایک شمالی بستی میں نثار صاحب نے ایک خوب صورت مکان تعمیر کیا تھا۔ اس مکان کو "گھر" بنانے والوں میں جیدی کے والدین کے علاوہ اس کے دادا دادی' دو چچا اور چچی شامل تھیں۔ ہنسی خوشی زندگی گزر رہی تھی۔

گھر میں آنے والے نئے مہمان کا نام شمیم تھا۔ امی کی ہدایت کے مطابق اسے اس مہمان کو آپی شمیم کہنا تھا۔ یہ بات جیدی کو تین چار سالوں بعد معلوم ہوئی کہ آپی شمیم ان کے ہاں اس وجہ سے آئی تھی کہ جیدی کی چچی جان ماں بننے والی تھیں اور آپی شمیم کو گھر کے کام کاج کے لئے بلایا گیا تھا۔

دو چار دن میں ہی آپی شمیم کے ساتھ جیدی کی گہری دوستی ہو گئی۔ وہ سر شام جیدی اور پڑوسیوں کے ایک لڑکے کو انگلی سے پکڑ کر بڑی سڑک کی طرف چلی جاتی۔ علاقے میں ان دنوں آبادی بہت کم تھی۔ بڑی سڑک ان کے گھر کے قریب سے گزرتی تھی۔ وہ تینوں ایک چھوٹی سی پلی پر بیٹھ کر دیر تک بھاری گاڑیوں کو گزرتے دیکھتے۔ شام کو واپس آکر آپی شمیم اسے کوئی نہ کوئی کہانی سناتی' یہ کہانیاں زیادہ تر دیہی ماحول کی ہوتی

تھیں۔ وجہ ظاہر تھی' آپی نے اپنی زندگی کی سولہ بہاریں گاؤں میں دیکھی تھیں۔
دھیرے دھیرے جیدی کو آپی شیمم سے عجیب طرح کا انس ہو گیا۔ جونہی فرصت ملتی وہ آپی شیمم کے پاس جا بیٹھتا۔ اسے کپڑے دھوتے' آٹا گوندھتے یا برتن مانجھتے دیکھتا رہتا۔ پھر جب وہ فارغ ہو جاتی تو دونوں کوئی کھیل کھیلنے لگتے یا پارک میں سیر کے لئے نکل جاتے۔ جیدی کا سب سے دل پسند مشغلہ آپی سے کہانیاں سننا تھا۔ وہ جب آپی شیمم کے پہلو میں لیٹ کر اپنی ٹانگ اس کی ٹانگوں پر رکھ دیتا تو اسے آپی شیمم کے بدن سے عجیب سی مہک آنے لگتی۔ کہانی سنتے سنتے وہ اس مہک مین اتنا کھو جاتا کہ پتا ہی نہ چلتا' آپی نے کیا سنایا ہے۔ وہ چونک کر پوچھتا "لیکن آپی.......... سوداگر نے فقیر کو قتل کیوں کیا؟"

آپی ذرا سا پیچھے ہٹتی' اسے گھور کر دیکھتی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹاتی اور کہتی "جیدی! تو سن کیا رہا تھا.......... بول بول کر میرا گلا دکھنے لگا ہے' جامیں نہیں سناتی۔"

وہ اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیتا "سوری.......... سوری۔ میں اب غور سے سنوں گا' پلیز۔"

وہ ناراض نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہتی۔ ایسے میں اس کی گرم سانسیں جیدی کے چہرے اور گردن سے ٹکراتیں۔ اسے گدگدی سی ہونے لگتی "پلیز آپی.........." وہ بے حد التجائیہ لہجے میں کہتا۔

آپی شیمم اپنی گردن اس کے بازوؤں کے حصار سے چھڑاتی اور کہتی "اچھا اب غور سے سنو۔"

وہ ہمہ تن متوجہ ہو جاتا۔ کہانی ری وائنڈ ہو کر پھر "پلے" ہو جاتی۔ جیدی خوب غور سے کہانی سنتا۔ کہانی بھی دلچسپ ہوتی تھی لیکن آپی شیمم کے بدن سے پھوٹنے والی مہک اس سے زیادہ دلچسپ ہوتی تھی۔ دھیرے دھیرے جیدی کی توجہ پھر کہانی سے ہٹنے لگتی۔ وہ آپی شیمم کی سوتی قمیص کے پھولوں میں الجھ جاتا پھولوں کی پنکھڑیاں' ان کے رنگ اور دائرے دیکھنے لگتا' ایسے میں کہانی بھی کسی دور افتادہ بازگشت کی طرح اس کے کانوں میں پڑتی رہتی۔

آپی شیمم کوئی تین ماہ اس کے گھر رہی۔ اس عرصے میں جیدی اس سے بے حد مانوس ہو گیا۔ تاہم اسے اپنے انس کی شدت کا احساس نہیں تھا۔ یہ احساس اس وقت ہوا' جب آپی واپس گاؤں روانہ ہوئی۔ یکایک جیدی بے حد اداس ہو گیا۔ وقت رخصت

آپی شیمم نے اسے گلے سے لگا کر بار بار چوما پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دل لگا کر پڑھنے کی ہدایتیں کیں۔

آپی شیمم کے جانے کے بعد جیدی کمرا بند کر کے دیر تک روتا رہا۔ معلوم نہیں اسے کیوں رونا آرہا تھا۔ آٹھ دس روز وہ خوب اداس رہا۔ اپنے ہی گھر میں کسی گمشدہ بچے کی طرح گھومتا رہا۔ چھت پر چلا جاتا اور دیر تک اس چارپائی پر لیٹا رہتا جہاں وہ آپی سے کہانیاں سنتا تھا۔ ہروہ چیز جس کا تعلق آپی سے تھا' جیدی کو اداس کر دیتی تھی۔ امی ابو اس کے بارے میں فکر مند تھے۔ اسے زبردستی کھانا کھلایا جاتا زبردستی پڑھایا جاتا اور زبردستی سلایا جاتا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ جیدی کی اداسی کی وجہ شیمم کا چلے جانا ہے۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ چند روز تک جیدی کوئی نہ کوئی نئی دلچسپی ڈھونڈ لے گا اور نارمل ہو جائے گا۔

ان کا خیال درست تھا۔ اس سے پیشتر بھی کسی دل پسند مہمان کے چلے جانے پر جیدی کئی کئی روز اداس رہتا تھا۔ آپی شیمم کے حوالے سے یہ اداسی دیرپا ثابت ہوئی مگر مستقل نہیں رہی۔ تین چار ہفتے بعد ان کے ساتھ والے گھر میں نئے کرایہ دار آئے اور جیدی ان کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ گھل مل گیا.......... وہ لوگ گھر کے سامنے پارک نما میدان میں کرکٹ اور فٹ بال وغیرہ کھیلنے لگے۔ چھ ستمبر کی یاد میں مصنوعی جنگیں کرنے لگے۔ کبھی کبھی جیدی کے ابا میاں بھی خوشگوار موڈ میں ہوتے اور ان کے ساتھ بیڈ مشن سے شغل کرتے۔ زندگی ایک بار پھر معمول پر آگئی تھی' تاہم آپی شیمم کی یاد کا کانٹا جیدی کے دل میں چبھا رہتا تھا۔ پڑھتے ہوئے' کھیلتے ہوئے یا کسی سے کہانی سنتے ہوئے یہ کانٹا بار بار اس کے ننھے دل کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتا۔ وہ بار بار امی سے پوچھتا۔ آپی شیمم کہاں ہوں گی؟ اس وقت وہ کیا کر رہی ہوں گی' وہ پھر کب آئیں گی.......... وغیرہ وغیرہ' کبھی بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہوں میں آپی شیمم کی شبیہہ گھومتی۔ وہ اپنے اردگرد وہی مانوس مہک محسوس کرتا۔ سوتی قمیص کے پھول اور ان کے دائرے جیدی کی نگاہوں میں رقصاں ہو جاتے۔ اس کے ننھے دل سے آہ نکلتی۔ آپی شیمم کی کھنکتی آواز اس کے کانوں سے ٹکراتی "تو بڑا شریر ہے جیدی' دوپہر جب میں سوئی ہوئی تھی' تو نے میرے پراندے کے ساتھ جھاڑو باندھ دیا تھا نا۔ بہت تنگ کرتا ہے تو۔ بس میں چلی جاؤں گی' پھر کبھی نہیں آؤں گی۔"

وہ گھبرا کر سوچتا' کیا آپی شیمم سچ مچ واپس نہیں آئے گی۔ پانچ چھ ماہ اسی طرح گزر

گئے........ یا شاید آٹھ دس ماہ گزرے ہوں گے۔ جیدی کو ان دنوں وقت کا کچھ زیادہ حساب نہیں تھا۔ ایک روز ماں نے جیدی کو بتایا "ہم ڈسکے جا رہے ہیں' تیری آپی شمیم کے گاؤں میں" یکبارگی جیدی کا دل دھڑک اٹھا' وہ جلدی سے بولا۔

"کب جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟"

ماں نے بتایا "آپی شمیم کی شادی ہو رہی ہے۔"

جیدی اس خبر پر بڑا خوش ہوا۔ وہ جانتا تھا شادی پر خوب دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ پھر یہ تو آپی شمیم کی شادی تھی۔ اس نے تصور میں آپی شمیم کو گوٹے کناری والے سرخ کپڑے پہنے دیکھا اور جی ہی جی میں کھل اٹھا۔ لیکن یہ خوشی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ جلد ہی عجیب طرح کی اداسی جیدی کے جسم و جاں پر چھانے لگی۔ معلوم نہیں اس اداسی کی کیا وجہ تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ علم رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا' شادی کے بعد دلہن کا سب سے قریبی عزیز وہ شخص ہوتا ہے جو سہرا باندھ کر اسے بیاہنے آتا ہے۔ پھر دلہن ہر وقت اسی کے ساتھ رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہنستی بولتی ہے۔ اسی کی خاطریں کرتی ہے۔ اسی کی اجازت سے ہر کام کرتی ہے۔ ایک طرح وہ شخص دلہن کا مالک ہوتا ہے........ جیدی کو آپی شمیم کے حوالے سے ملکیت کا یہ تصور ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر رنجیدہ ہونے لگا کہ کوئی اجنبی شخص آپی شمیم کو اپنی مرضی سے چلائے گا۔ اپنی مرضی سے اٹھائے اور بٹھائے گا۔ آپی شمیم اس کے ساتھ اجنبی گھر میں چلی جائے گی۔

شادی میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا لیکن آپی شمیم کا گاؤں چونکہ امی کا میکا اور ابا کا آبائی گاؤں بھی تھا لہٰذا پہلے سے ہی شادی میں جانے کی تیاری ہونے لگی۔ امی اور چچی نے فیصلہ کیا کہ وہ شادی سے پندرہ روز پہلے گاؤں روانہ ہو جائیں گی........ روانگی سے پہلے کے دو ہفتے جیدی نے بڑی مشکل سے کاٹے۔ اس کے جذبات ملے جلے تھے۔ آپی شمیم کی شادی کا افسوس بھی تھا اور اس کے دلہن بننے کی مسرت بھی۔ بہرحال مسرت کا پلڑا بھاری تھا کیونکہ اتنے عرصے بعد آپی شمیم کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا........ خدا خدا کر کے وہ دن آیا جب وہ اپنی امی اور چچی کے ساتھ ابا میاں کی گاڑی سے اترا اور ڈسکہ جانے والی لاری پر سوار ہوا۔

☆-----------☆-----------☆

اس خوبصورت گاؤں میں چچا صدیق کا گھر کچھ بلندی پر واقع تھا۔ مٹی سے لیپا پوتا

رنگین نقش و نگار والا بڑا پیارا سا آنگن تھا۔ آپی شمیم کی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ روز رات کو گاؤں کی لڑکیاں آنگن میں جمع ہو کر ڈھولک بجانے لگتیں۔ جیدی بھی عورتوں میں گھس گھسا کر بیٹھ جاتا' اس کی نگاہیں ہر گھڑی آپی شمیم کے چہرے کا طواف کرتیں۔ آپی شمیم اب کافی بدلی بدلی نظر آتی تھیں۔ کچھ خاموش خاموش' کچھ شرمائی ہوئی' کسی وقت جب جیدی پوچھتا کہ آپی تم ایسی کیوں ہو گئی ہو تو وہ کن انکھیوں سے ارد گرد دیکھ کر مسکرا دیتی اور کبھی کبھی جیدی کے ایک آدھ چٹکی بھی کاٹ دیتی' جیدی پوچھتا۔

"آج! رات جب لڑکیاں گا رہی تھیں تو تم رونے کیوں لگی تھیں؟"

وہ انجان بن کر کہتی "؟میں کب روئی تھی!"

جیدی جانتا تھا' آپی جھوٹ بول رہی ہے۔ نہ صرف وہ اداس ہے بلکہ آپی شمیم کے ابا امی اور دوسرے گھر والے بھی کبھی کبھی اچانک اداس ہو جاتے ہیں۔ اداسی کی یہ لہر جیدی نے اکثر شادی والے گھروں میں محسوس کی تھی۔ یہ وہ گھر ہوتے تھے جہاں سے لڑکی کو جانا ہوتا تھا۔ اس اداسی کو محسوس کر کے جیدی خود بھی اداس ہو جاتا تھا۔

درحقیقت وہ ایک مختلف بچہ تھا۔ بے حد حساس اور زود رنج' یہ صفات اسے اپنے والد نثار نظامی صاحب سے ملی تھیں۔ سول سرونٹ ہونے کے علاوہ نثار صاحب خوب صورت لب و لہجے کے دلنواز شاعر بھی تھے۔ نوجوانی میں ان کا ایک شعری مجموعہ کافی مقبول ہوا تھا۔ غالباً اسی نوع کے جراثیم جیدی میں بھی پائے جاتے تھے۔ اوائل عمر ہی میں اس کے اندر حسن و رومان کے لئے ایک وسیع و عریض خلا موجود تھا۔ آپی شمیم کے گھر میں اداسی کی لہر جیدی کو خاص طور پر متاثر کر رہی تھی۔ شادی کے ہنگامے اور فراغت کی مسرت پر ایک بے نام سا دکھ غالب آتا جا رہا تھا۔ رات سونے سے پہلے دیر تک اس کے کانوں میں ڈھولک کی تھاپ اور لڑکیوں کے گیت گونجتے رہتے۔ ان گیتوں میں جدائی اور بچھڑنے کی باتیں سن کر جیدی آہیں بھرنے لگتا۔ پھر وہ دن آیا جب آپی شمیم کو مایوں بٹھایا گیا۔ یہ رسم شادی سے چھ سات روز پہلے ادا کی گئی۔ آپی شمیم کو میلا سا لباس پہنا کر ایک چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کی جھول میں ابلی ہوئی ثابت گندم ڈالی گئی اور لڑکیوں نے گیت گائے۔ یہ رسم جیدی کو بہت بھلی لگی اور اس رسم میں سب سے زیادہ بھلی آپی شمیم لگی۔ گندم کے دانوں جیسی زرد رنگت والی آپی شمیم سر جھکائے کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ جیدی کا دل چاہا کہ وہ ابھی آپی شمیم کو لے کر کسی کمرے میں چلا جائے اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جائے اور اسے حکم دے کہ مجھے کہانی سناؤ' ایک طویل کہانی

جو کم از کم دس بارہ روز تک دن رات چلے۔ گھر والے آوازیں دے دے کر تھک جائیں لیکن وہ اسے اپنی جگہ سے اٹھنے نہ دے۔ صرف وہ ہو' آپی شمیم ہو اور کہانی ہو—— لیکن اب تو کہانی سننے کی باتیں خیال کی باتیں ہو گئی تھیں۔ آپی شمیم کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی۔ رات دن کام تھے۔ کبھی سلائی کڑھائی ہو رہی ہے' کبھی گھر کی لیپا پوتی' کبھی چاول چنے جا رہے ہیں۔ کبھی جوڑے ٹانکے جا رہے ہیں' اگر کبھی کوئی وقت فارغ ہوتا تھا تو آپی کی سہیلیاں اس کی ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ تو اس سے بات کرنے کو ترس گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ جیدی کے اندر ایک طرح کا احساس محرومی پرورش پا رہا تھا۔

مایوں کی رسم کے بعد آپی شمیم پر گھر سے نکلنے کی پابندی تھی۔ اگر باہر جانا ہی ہوتا تو اس کے ساتھ چار پانچ سہیلیوں کا گروپ ہوتا۔ اس پابندی سے آپی شمیم تو نہ جانے کیا محسوس کرتی تھی لیکن جیدی کا دم خواہ مخواہ گھٹ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے آپی شمیم ایک قیدی ہے' جسے کوئی کڑی سزا دینے سے پہلے سخت نگرانی میں رکھا جا رہا ہے۔ جوں جوں شادی کے دن نزدیک آ رہے تھے' جیدی کا رنج و الم بڑھ رہا تھا۔ شادی سے دو روز پہلے وہ رات کو اپنی امی کے قریب چارپائی پر لیٹا دیر تک جاگتا رہا۔ اسکا دل بھرا ہوا تھا۔ جب سب سو گئے تو وہ تکیے میں سر چھپا کر سسکیوں سے رونے لگا۔ وہ بہت رویا۔ اس کا سارا جسم آگ کی طرح پھنکنے لگا۔ پہلے تو اسے یہی سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ پھر اسے اندازہ ہوا کہ آپی شمیم کی بے رخی اور بے پروائی اس کے جسم پر چھڑیاں برسا رہی ہے—— وہ کیوں اس سے باتیں نہیں کرتی' کیوں اسے اہمیت نہیں دیتی—— وہ سسکیاں لیتا رہا اور سوچتا رہا۔ آخر اس نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ اسے معلوم تھا صبح سویرے آپی گھر کی صفائی کرتی ہے۔ صفائی کا یہ کام وہ گھر کی پچھلی کوٹھری سے شروع کرتی تھی۔ اس کوٹھری میں آپی سے بات کرنے کا بہترین موقع مل سکتا تھا۔ جیدی نے سوچا جب وہ صفائی کر رہی ہوگی' میں بے باکی سے اندر چلا جاؤں گا۔ وہ مڑ کر دیکھے گی۔ میں خاموشی سے کھڑا رہوں گا۔ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتا جاؤں گا' وہ کہے گی 'کیا بات ہے جیدو؟ میں کہوں گا' آپی...... آپی میں تم سے پیار کرتا ہوں' رات دن تم کو یاد کرتا ہوں' میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا' میرے دل میں بہت درد ہوتا ہے۔

جیدی نے سوچا پھر اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہ کیا کہے گی' کیا کرے گی؟ وہ کافی دیر ان سوالوں کے جواب سوچتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ان سوالوں کو ذہن سے جھٹک

دیا اور صبح تک کے لئے نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔

دن چڑھنے سے بھی کافی دیر پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں ابھی لالٹین روشن تھی۔ اس کی امی' چچی اور دوسری عورتیں لحافوں میں دبکی ہوئی بھاری آوازوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ سردیوں کی طویل راتوں میں دیہات کے لوگ جلدی جاگ جاتے ہیں اور پھر سویرے تک ایسے ہی لحافوں میں پڑے وقت گزارتے ہیں' جیدی بھی خاموشی سے اپنے لحاف میں دبکا رہا۔ دھیرے دھیرے لالٹین کی روشنی میں سویرے کی روشنی گھلنے لگی۔ جیدی نے رات میں جو منصوبہ بنایا تھا وہ دن کے اجالے میں عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دھڑکتے دل سے سوچنے لگا کہ کیا وہ واقعی پچھلی کوٹھری میں جا کر آپی شمیم سے یہ باتیں کہہ سکے گا۔ کافی دیر کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ایک بار پھر اس کا ارادہ قوت پکڑنے لگا۔ جب اسکی امی نماز پڑھنے کے لئے اٹھ گئیں اور چچی بچے کے جانگئے دھونے کے لئے نیچے نلکے پر چلی گئیں تو جیدی بہ آہستگی لحاف سے نکل آیا' آپی شمیم کی بڑی بہن نے پوچھا۔

"پتر جیدی' کہاں جا رہے ہو؟"

"پیشاب کرنے" جیدی نے مختصر جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

ٹھنڈی ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ صحن خالی تھا' اس نے آپی شمیم کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ اچانک اسے گھر کی پچھلی جانب سے زمین پر جھاڑو دینے کی آواز آئی۔ آپی شمیم کوٹھری میں جھاڑو دے رہی تھیں۔ وہ بڑے وقت پر پہنچا تھا۔ یکبارگی اس کا دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ دل کی دھڑکن محسوس کر کے پہلے تو اس نے سوچا کہ واپس لحاف میں جا گھسے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا' وہ کانپتی ٹانگوں سے کوٹھری کی طرف بڑھ گیا۔ ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ آپی شمیم جھک کر پلنگ کے نیچے سے مٹی نکال رہی تھی۔ اس کے بالوں کی ایک لمبی لٹ زمین سے چھو رہی تھی۔ جیدی نے ایک لمحے کے لئے مبہوت ہو کر یہ خوب صورت منظر دیکھا پھر دل کڑا کر کے اندر آگیا

"آپی!" اس نے جیسے خواب میں آواز دی۔ وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے جیدو؟" اس نے پیار سے کہا۔

ایک گولا سا جیدی کے حلق میں پھنس گیا۔ اس نے اس گولے کو نگلنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایکا ایکی اس کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا' اس نے خود کو بے حد بیوقوف اور گدھا محسوس کیا "کیا بات ہے جیدو؟" آپی شمیم نے آنکھیں پٹ پٹا

کر سوال دہرایا۔

"میں وہ......... میں وہ......... اپنی جوتی ڈھونڈنے آیا تھا۔"

"جوتی؟" آپی شمیم نے حیرت سے کہا اور اس کی کھنک دار ہنسی کمرے میں گونج گئی "جوتی تو تم نے پہن رکھی ہے۔"

جیدی نے لرز کر اپنے پاؤں دیکھے "اوہ" اس کے ہونٹوں سے کراہ نکلی' آپی شمیم نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"بڑے خبطی ہو تم" اس نے اس کی سر پر ہاتھ پھیرا۔ "ہر وقت پریشان رہتے ہو۔"

جیدی کا دل چاہا وہ آپی کو دھکا دے کر کمرے سے نکل بھاگے لیکن دوسرے خیالوں کی طرح وہ اس سوچ کو بھی عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ آپی شمیم نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "جیدو اپنی آپی کو یاد کرو گے نا.........؟"

"ہاں" جیدی نے جلدی سے کہا۔

وہ بے حد اداس لہجے میں بولی "بھول تو نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں" جیدی نے نفی میں سر ہلایا اور تیزی سے باہر آگیا۔

☆------------☆------------☆

شادی کا ہنگامہ بڑا زور دار تھا۔ چچا صدیق خود تو مشکل سے گزر بسر کرتا تھا لیکن بیٹی کے لئے اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اس سلسلے میں جیدی کے ابا نے بھی کھل کر مالی معاونت کی تھی۔ گاؤں میں ویسے بھی بیٹی کی رخصتی کو پورے گاؤں کی ذمے داری سمجھا جاتا ہے۔ سب لوگوں نے انتظامات میں حصہ لیا تھا۔ برات خانیوال سے پہنچی تھی۔ اس کی شب بسری کا انتظام بھی تھا۔ پورے آٹھ پہر اس شادی کا ہنگامہ خوب گرم رہا' آخر دلہن کی رخصتی کا وقت آیا۔ جیدی نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر رکھی تھیں۔ اس کی ضد تھی کہ وہ بھی دلہن کے ساتھ خانیوال جائے گا۔ خانیوال میں جیدی کی پھوپی رہتی تھی۔ ویسے بھی ایک دن بعد جیدی کے گھر والوں کو ولیمے میں شرکت کے لئے خانیوال جانا تھا۔ جیدی کا برات کے ساتھ جانے کا چانس بن سکتا تھا بشرطیکہ اس کی امی راضی ہو جاتیں۔ وہ امی کا گھٹنا پکڑ کر بیٹھ گیا اور مسلسل تکرار شروع کر دی۔ عورتوں میں سے بھی ایک دو نے اس کی حمایت کی۔ شمیم کی ایک سہیلی بولی "بھیج دو تایاجی' شمیم کا دل لگا رہے گا اور پھر ہم نے بھی پرسوں جانا ہے" شمیم کے ساتھ خانیوال جانے والی سہیلی نے

اٹھا کر جیدی کی گردن میں بازو حمائل کر دیا "ٹھیک ہے' ہم دونوں سہیلیاں جائیں گی شمیم کے ساتھ۔" بنتے بنتے جیدی کی بات بن ہی گئی۔ آہوں اور سسکیوں کے درمیان برات گاؤں سے خانیوال کے لئے رخصت ہوئی تو دلہا کی گاڑی میں جیدی بھی موجود تھا۔

وہ شام کو خانیوال پہنچے۔ آپی شمیم کا حجلہ عروسی جیدی کی آنکھوں کو بہت بھلا لگا لیکن آپی شمیم کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ وہ دلہن کے سنگھار میں کوئی آسمانی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ جیدی بار بار گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن عورتوں کی موجودگی سے جھجک رہا تھا۔ رات دیر تک وہ دوسری عورتوں کے ساتھ حجلہ عروسی میں موجود رہا۔ آخر عورتیں ایک ایک کر کے باہر جانے لگیں۔ ایک عورت نے جیدی کو دبوچتے ہوئے کہا۔

"چلو جناب' اب اصلی دلہا صاحب کے لئے راستہ صاف کرو۔"

عورتیں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ جیدی شرمندہ شرمندہ سا بستر کے نرم فوم سے اٹھا اور باہر آگیا۔

.... اگلی صبح وہ پھر آپی شمیم کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔ آپی کا دلہا جیدی کو پہلی نظر میں کوئی خاص اچھا نہیں لگا۔ چھوٹے چھوٹے بال' گھنی اور سخت مونچھیں' تھوڑے سے موٹے ہونٹ۔ بہرحال جب آپی نے جیدی کو بتایا کہ اس کے بھائی جان بہت اچھے ہیں اور بھائی جان نے بھی جیدی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں تو جیدی کے خیالات بدل گئے۔ وہ بے تکلفی سے ان دونوں کے درمیان بیٹھ کر اپنی باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑنے لگا۔ دو روز خوب ہنسی خوشی گزرے پھر جیدی اپنے ابا میاں کے ساتھ لاہور روانہ ہو گیا جبکہ آپی شمیم اپنے دلہا کے ساتھ واپس گاؤں چلی گئی۔

لاہور پہنچ کر جیدی چند دن تو مطمئن رہا لیکن پھر اس کے دل میں دوبارہ کھد بد شروع ہو گئی۔ وہ بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتا۔ کتاب پڑھتے پڑھتے دو دو ورق الٹ جاتا۔ کبھی کاپی پر خواہ مخواہ لکیریں کھینچنے لگتا۔ عجیب و غریب تصویریں بناتا اور انہیں پھاڑ دیتا۔ سونے کے لئے تکئے پر سر رکھتا تو کانوں میں کسی کی کہی ہوئی کہانیاں گونجنے لگتیں۔ کبھی آنکھوں میں سوتی قمیص کے پھول رقصاں ہو جاتے یا پھر ایک عجیب مانوس خوشبو نتھنوں میں گھسنے لگتی۔ امی کہتی "میرا بیٹا سو گیا؟" وہ ہاں میں جواب دیتا یعنی خاموش رہتا۔ ایک دو دفعہ اسے اپنی بے پروائیوں پر سخت ڈانٹ بھی پڑی لیکن کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔

قریباً تین چار ہفتے اسی کیفیت میں گزرے۔ پھر ایک دن وہ ماسٹر صاحب سے

ٹیوشن پڑھ کر فارغ ہوا تو ایک خوش خبری اس کی منتظر تھی۔ امی نے بتایا کہ شمیم اور سجاد (شمیم کا دلہا) لاہور آرہے ہیں۔ جیدی یہ اطلاع سن کر کھل اٹھا۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر اوندھا گر کر تادیر اس خبر کا لطف لیتا رہا۔ اس رات وہ ایک پل کے لئے نہیں سویا۔ کمرے کا ٹیبل لیمپ جلا کر ہوم ورک کرتا رہا۔ دو تین چھٹیاں تھیں۔ وہ ان چھٹیوں کا ہوم ورک ایک ہی دفعہ کر لینا چاہتا تھا تاکہ آپی شمیم کے ہوتے ہوئے وہ سارا وقت اس کے ساتھ گزار سکے۔ اس نے پکا پروگرام بنا رکھا تھا کہ اس دفعہ آپی شمیم کو جوائے لینڈ میں بھی لے جائے گا اور اس بڑے آسمانی جھولے پر بٹھائے گا جس میں بیٹھ کر پیٹ میں گدگدی ہوتی ہے اور لوگ چلا چلا کر اور ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ آپی شمیم کو بھی ہنستے اور سرخ ہوتے دیکھے۔ اس کے علاوہ اس نے جناح گارڈن میں پکنک کا پروگرام بھی بنا لیا۔

اگلے روز دوپہر کو جب آپی شمیم اور بھائی سجاد کی آمد ہوئی تو جیدی جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا۔ وہ جو تنکا دہرا کرنا باعث زحمت سمجھتا تھا، بھاگ بھاگ کام کر رہا تھا۔ بوتلیں لا رہا تھا، کرسیاں گھسیٹ رہا تھا، میز بچھا رہا تھا۔ اسکی امی مسکراتے ہوئے بولیں "یہ تو دیوانہ ہے شمیم کا" شمیم ہنسنے لگی۔ جیدی پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سجاد نے مسکرا کر جیدی کو دیکھا پھر شرارت کے لہجے میں شمیم سے سرگوشی کی "صاحبزادے لیٹ ہو گئے آٹھ دس سال" اس سرگوشی کا مفہوم جیدی کی سمجھ میں دو تین سال بعد آیا۔

ٹھنڈا پی کر شمیم کے شوہر سجاد نے ایک طویل ڈکار لی۔ جیدی مسکرانے لگا۔ شمیم نے اسے اپنے پاس بلایا اور پہلو سے لگا کر بٹھا لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور اس میں سے دو کتابیں نکالیں، یہ سندر بن میں شکار کی کہانیاں تھیں۔ اس تحفے نے جیدی کو نہال کر دیا۔ اسے خوشی ہوئی تھی کہ آپی شمیم نے اسے کوئی بچوں والا تحفہ نہیں دیا۔ اسے بچوں والے تحفے پسند ہی نہیں تھے۔ اور پھر آپی شمیم کے ہاتھ سے تو وہ کوئی ایسا تحفہ لینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

"کیسی کتابیں ہیں؟" آپی شمیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ آپی شمیم کی طلائی چوڑیاں اس کے کان میں جلترنگ بجانے لگیں۔ ریشمی دوپٹے کا سخت جھالر دار کنارا اس کی گردن میں چبھنے لگا۔

"بہت اچھی ہیں" اس نے شرما کر جواب دیا اور دور ہٹ کر بیٹھ گیا.......... پھر ایکا ایکی اسکی تمام خوشی غارت ہو گئی۔ یوں لگا جیسے چراغاں کی رات میں اچانک گھٹا ٹوپ

اندھیرا چھا گیا ہو۔ آپی شمیم اس کی امی سے کہہ رہی تھی۔ "خالہ جان، کوئی تکلف نہ کرنا، ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔" خوب صورت کتابیں ردی کے پلندے کی طرح جیدی کی گود میں ڈھیر ہو گئیں۔ وہ حیرت سے آپی شمیم کی طرف دیکھنے لگا۔ آپی اس کی امی کو بتا رہی تھی کہ سجاد کو بہت کام ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اتنی دیر رکنے پر راضی ہوئے ہیں۔

جیدی کی امی نے کہا "بھئی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کل اور پرسوں تو ویسے ہی چھٹی ہے، ہم تو چاہتے تھے ایک آدھ چھٹی اور ساتھ ملا کر تم لوگ تین چار روز یہاں رہ جاتے۔"

"توبہ کریں جی" سجاد نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا "یہ پرائیویٹ اداروں کی ملازمت تو جان کا عذاب ہوتی ہے۔ ایک دن چھٹی کر لو تو مالک کی آنکھیں بدل جاتی ہیں۔"

جیدی نے التجائیہ انداز میں آپی شمیم کی طرف دیکھا جیسے بے زبان خاموشی یہاں رکنے کی استدعا کر رہا ہو۔ جیدی کی امی بھی زور دینے لگیں۔ سجاد مسلسل انکار کئے جا رہا تھا۔ آپی شمیم نے سجاد کی طرف جھک کر کچھ کھسر پھسر کی۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کم از کم ایک رات رکنے کے لئے کہہ رہی ہیں۔ بھائی سجاد کے ماتھے پر بل نظر آئے۔ انہوں نے تیزی سے ایک دو لفظ کہے۔ آپی شمیم نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔ جیدی کا دل جیسے اس کے سینے میں کٹ گیا۔ آپی شمیم کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ سمجھ چکا تھا کہ انہوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔

شام کا کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد آپی شمیم اور سجاد نے گھر والوں سے رخصت طلب کی۔ ان کی عزت افزائی کے لئے جیدی کے ابا میاں نے کہا کہ وہ خود انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے جائیں گے۔ انہوں نے جیدی سے بھی کہا کہ وہ ساتھ چلے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کے اندر جیسے کوئی آتش فشاں دہک رہا تھا۔ رہ رہ کر اسے آپی شمیم اور بھائی سجاد پر غصہ آرہا تھا۔ وہ بھنایا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ اس کی امی اس کی کیفیت تاڑ کر پیچھے پیچھے آئیں۔

"کیا بات ہے جیدی؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ انہیں روک نہیں سکتیں" وہ بے حد غصے سے بولا۔

"کس کو؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپی شمیم کو۔ کیا ہو جائے گا اگر وہ ایک آدھ دن یہاں رہ جائے گی، کون سی

قیامت ٹوٹ پڑے گی!"

امی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹا! اب وہ پہلے والی لڑکی نہیں ہے۔ بیوی کو شوہر کی مرضی کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ سجاد کی مرضی کی بغیر وہ کیسے رہ سکتی ہے یہاں!"

"تو کیوں نہیں رک جاتے سجاد بھائی؟"

"اسے ضروری کام ہے گھر میں۔"

اتنے میں ابا میاں باہر سے آوازیں دینے لگے۔ امی اسے منہ بسورتا چھوڑ کر باہر چلی گئیں۔ چند ہی لمحے بعد وہ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سن رہا تھا۔

وہ ساری رات جیدی نے جاگتے اور کروٹیں بدلتے گزار دی۔ آپی شمیم کی تصویر رہ رہ کر اس کے ذہن کے فریم میں فٹ ہو جاتی تھی۔ کبھی اسے آپی پر بے پناہ غصہ آتا اور کبھی اس کی بے بسی پر ترس۔ وہ سجاد بھائی کی عزت کرتا تھا لیکن اس رات دل ہی دل میں اس نے سجاد بھائی کو بہت سی بددعائیں دے ڈالیں.......... صبح اسے تیز بخار ہو چکا تھا۔

تین چار روز دوا کھانے کے بعد بخار میں کچھ افاقہ ہوا اور اس نے روزمرہ کے معمولات شروع کئے۔ ابا اور امی نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا تھا کہ جیدی کو اسکول میں داخل کرا ہی دیا جائے۔ وہ اب تقریباً نو برس کا ہو چکا تھا۔ اس کی ذہانت اور استعداد کے پیش نظر اسے ایک اچھے اسکول نے بخوشی چھٹی کلاس میں داخل کر لیا۔ تاہم جیدی کی اسکول جانے کی حسرت دل ہی میں رہی۔ ان دنوں موسم سرما کی چھٹیاں تھیں۔ اسکول کھلنے سے پہلے پہلے جیدی ایک بار پھر بیمار پڑ گیا۔ اس دفعہ بیماری کا حملہ زیادہ شدید تھا۔ مختلف ٹیسٹ لینے کے بعد ڈاکٹروں نے معیادی بخار تشخیص کیا۔ پہلے گھر میں علاج ہوتا رہا پھر اسے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ ایک روز وہ مختلف دواؤں کے زیر اثر نیم غنودگی کی حالت میں پڑا تھا کہ کسی نے اس کا شانہ جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں، سامنے ہی آپی شمیم کا چہرہ نظر آیا۔ وہ کتنی ہی دیر بے حس و حرکت دیکھتا رہا۔ اسے یہ سب کچھ خواب لگ رہا تھا۔ لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ آپی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ امی امی مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جیدی نے پہلا سوال یہی پوچھا۔

"آپی! تم کب جاؤ گی؟" اس سوال میں بہت سے اندیشے پوشیدہ تھے۔

آپی شمیم مسکرائی "اب بہت دن تمہارے پاس رہوں گی۔ تمہیں ٹھیک کر کے جاؤں گی۔"

"سجاد بھائی کہاں ہیں؟"

"وہ خانیوال میں ہیں۔ یہ دیکھو، انہوں نے تمہارے لئے کتنی پیاری پیاری کتابیں بھیجی ہیں"

کتابیں خوب صورت تھیں لیکن یہ گھڑیاں ان کتابوں سے کہیں بڑھ کر خوب صورت تھیں۔ آپی شمیم اس کے پاس تھی۔ وہ صرف اس کے لئے یہاں آئی تھی۔ یہ احساس اس کے لئے دنیا کے قیمتی ترین تحفے سے بھی زیادہ مسرت بخش تھا۔ شمیم نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ امی نے دوا کی شیشی اس کی طرف بڑھائی۔

"بھئی! میں تو بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم آگئی ہو اب میرا کام آدھا رہ گیا ہے۔ یہ لو سنبھالو دوا اور اسے پلاؤ۔"

کڑوی کسیلی دوا جیدی نے بخوشی حلق سے اتار لی۔ لمحوں میں بیماری جیسے اس کے جسم سے اڑن چھو ہو گئی تھی۔ وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگا کہ وہ چاہے تو ابھی اسپتال کے لان میں کرکٹ کھیل سکتا ہے لیکن وہ اپنی اس کیفیت سے خوف زدہ تھا۔ اگر وہ سچ مچ اتنی جلدی صحت یاب ہو گیا تو آپی شمیم واپس چلی جائے گی۔ اس نے پکا فیصلہ کر لیا کہ کم از کم ایک مہینہ اور اسپتال میں رہے گا اور پھر گھر میں دو ڈھائی ماہ تک چارپائی سے پاؤں نہیں اتارے گا۔

وہ بڑے حسین دن تھے جیدی کے لئے۔ وہ سارا سارا دن آپی شمیم کو اپنے پاس رکھتا، کہانیاں سنتا، لوڈو کھیلتا، کیرم بورڈ کھیلتا، پہیلیاں بوجھتا۔ اگر کسی روز آپی کو نہانے دھونے یا کپڑے بدلنے اسپتال سے گھر جانا ہوتا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا تیمار دار مقرر ہوتا تو جیدی اداس ہو جاتا۔ جیدی کے ایک چچا نے اس کے لئے دوبئی سے ایک ننھا سا ریڈیو بھیجا تھا۔ یہ ریڈیو اسپتال میں بھی اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک شب جب کمرے کی کھڑکی سے چاند جھانک رہا تھا، جیدی ریڈیو کان سے لگائے لیٹا تھا۔ گانا بج رہا تھا۔ "انوکھا لاڈلا، کھیلن کو مانگے چاند رے.........." جیدی نے آپی شمیم کو بھی یہ گانا سنایا۔ جب گانا ختم ہو گیا تو وہ آپی سے پوچھنے لگا کہ انوکھا لاڈلا کیا ہوتا ہے اور کھیلن کو چاند مانگنے سے کیا مطلب ہے، اور چاند سے کھیلا کیسے جاتا ہے وغیرہ وغیرہ.......... آپی شمیم اس کے سوالوں پر ہنسنے لگی۔ اس کے کلیوں جیسے دانت روشنی میں چمکنے لگے۔ وہ بولی۔ "انوکھا لاڈلا بس تیرے جیسا ہوتا ہے۔ وہ کھیلنے کے لئے ایسی چیز مانگتا ہے جو اس کی ماں اسے نہیں دے

سکتی۔ بھلا چاند بھی کوئی کسی کو دے سکتا ہے۔........." آپی شمیم دیر تک گانے کی تشریح
کرتی رہی اور جیدی مزے سے سنتا رہا۔ جیدی کے وہ شب و روز ایسی ہی خوشگوار
مصروفیات سے مزین تھے......... جلدی ہی اسے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ قریباً ڈیڑھ مہینے
میں وہ بالکل تندرست ہو گیا تاہم اس نے اصرار کر کے آپی کو دو ہفتے مزید اپنے پاس ٹھہرا
لیا۔

آنے والے کو جانا بھی ہوتا ہے۔ آپی شمیم بھی چلی گئی۔ جیدی ایک بار پھر
اداسیوں کے جنگل میں گھر گیا۔ اس دفعہ یہ جنگل زیادہ گھنا تھا۔ اسمیں یادوں کے
پھڑپھڑاتے پنچھی بھی بے شمار تھے۔ وہ بمشکل ایک ماہ ہی اسکول گیا تھا کہ ایک بار پھر بستر پر
پڑ گیا۔ گھر والوں کے لئے یہ سانحہ بڑا جانکاہ تھا۔ اس کے والدین کو خود پر پڑنے والی اس
افتاد کا یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ بہرحال چند روز بعد اسے دوبارہ اسپتال داخل کرانا
پڑا......... اب پھر وہی دوائیں تھیں' وہی نرسیں تھیں۔ وہی پرہیزی کھانے اور وہی گھٹا
ہوا ماحول......... لیکن اس دفعہ کوئی آپی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے نہیں
آئی......... ایک دن اس نے امی سے پوچھ ہی لیا۔

"امی! آپی شمیم کب آئے گی؟"

وہ آزردہ لہجے میں بولیں "وہ اب نہیں آئے گی۔"

"کیوں؟"

"اس کے شوہر نے منع کر دیا ہے" امی نے عجیب انداز سے کہا۔

"کیوں منع کر دیا ہے؟"

"وہ اس کا میاں ہے' ایسا کر سکتا ہے۔"

"لیکن......... لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟"

امی نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں خود اسے لینے گئی تھی۔"

جیدی کو یہ خبر سن کر بہت دکھ ہوا۔ امی اتنا لمبا سفر کر کے خود اسے لینے گئی تھیں
اور وہ پھر بھی نہیں آئی تھی۔ اس نے کہا

"آپ خود لینے گئی تھیں؟ آپ نے خط بھیج دیا ہوتا۔"

"بھیجے تھے خط" اس کی امی نے کہا "ایک ٹیلیگرام بھی بھیجا تھا۔"

جیدی کے دل میں گھونسا لگا' وہ چپ سادھ کر لیٹ گیا۔ اس کی امی اسے دلاسا
دینے لگیں "وہ آئے گی بیٹا' ضرور آئے گی' وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ شاید.........

ان دونوں کی کوئی گھریلو مجبوری ہو۔"

امی صاف طور پر بات بدلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی آواز کا کھوکھلا پن
واضح تھا۔ جیدی کو لگا کہ وہ اب کبھی بستر سے نہ اٹھ سکے گا۔ جب اٹھانے والے ہاتھ ہی
نہیں بڑھیں گے تو وہ کیسے اٹھے گا۔ شاید وہ اسی بستر پر پڑا مرجائے گا۔ پھر اسے کفن پہنا کر
قبرستان میں دفنا دیا جائے گا۔ وہی قبرستان جس کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے خوف
آتا تھا۔ اسکا دل ہولنے لگا' اسے لگا کہ جان اس کے جسم سے نکلنا شروع ہو گئی ہے۔ اس
کے زرد چہرے نے اس کی ماں کو بوکھلا دیا۔ وہ بھاگی ہوئی ڈاکٹر کی طرف گئی......... لیکن
ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی "جیدی کا ڈاکٹر" آگیا۔ وہ یوں نمودار ہوئی جیسے بادلوں کی اوٹ
سے سورج نکلتا ہے اور بڑی آہستگی کے ساتھ ہر طرف اجالا بکھیر دیتا ہے۔ یا حبس زدہ
رات میں ساون رت کا پہلا جھونکا دبے پاؤں آتا ہے اور خشک زمینوں کو روئیدگی کی نوید
دیتا ہے۔ وہ سیاہ برقعے میں تھی' نقاب نے اس کی ٹھوڑی اور ہونٹ چھپا رکھے تھے' باقی
چہرہ عیاں نہ ہوتا تو بھی وہ صرف پاؤں کی چاپ سن کر بتا سکتا تھا کہ کون آرہا ہے۔ وہ لپک
کر اس کے پاس آئی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔"

"کیا بات ہے جیدو' کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہا ہے رے' اب میں آئی ہوں' اب
کیوں روتا ہے۔"

اسی دوران جیدی کی ماں اندر آگئی اور وہ ڈاکٹر بھی جس کے پاس صرف ڈگریاں
تھیں' جیدی کا علاج نہیں تھا۔ جیدی کی ماں شمیم کو بیٹے کے سرہانے دیکھ کر حیران رہ گئی۔
اس کی آنکھوں میں مسرت کے ساتھ ساتھ تشویش کے سائے بھی تھے۔ ڈاکٹر جیدی کا بلڈ
پریشر دیکھنے کے بعد چلا گیا۔ جیدی کا ہاتھ شمیم کے ہاتھ میں تھا اب اسے کسی معالج کی
ضرورت نہیں تھی۔

شمیم نے ایک بار پھر دلجمعی سے جیدی کی تیمارداری شروع کر دی۔ پہلی رات وہ
صبح تک جاگتا رہا اور اس سے باتیں کرتا رہا۔ دن کو بھی اس نے سونے کا نام نہیں لیا' اسے
خوف سا ہو گیا تھا کہ وہ سو گیا تو آپی شمیم واپس چلی جائے گی۔ نہ جانے کیا بات تھی' اس
دفعہ وہ آپی شمیم کے رویے میں عجیب سی جھجک محسوس کر رہا تھا۔ نہ وہ بے تکلفی سے
اس کا سر اپنے زانو پر رکھتی تھی نہ اس کا منہ چومتی تھی۔ نہ اسے پہلو سے لگا کر بٹھاتی
تھی۔ وہ اپنا کوئی گہرا دکھ جیدی سے چھپا رہی تھی۔ جیدی کو لگا جیسے وہ اپنے گھر میں خوش
نہیں ہے۔ تیسرے روز سہ پہر کے وقت آپی شمیم کا شوہر طوفانی بگولے کی طرح اسپتال

کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی ناک ہمیشہ سے زیادہ پھولی ہوئی تھی اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ آتے ہی شمیم سے مخاطب ہوا اور پھنکارتے لہجے میں بولا۔

"کیوں آئی ہو تم یہاں' کیوں آئی ہو میری مرضی کے بغیر؟"

اسے دیکھ کر آپی شمیم سہم گئی۔ ہکلا کر بولی "آپ تو...... آپ تو دو ہفتے کے لئے گئے تھے کراچی۔"

"تو تم اسی لئے یہاں چلی آئیں!"

"وہ...... وہ خالہ جان لینے آئی تھیں مجھے' میں نے انکار کر دیا لیکن...... لیکن۔"

"لیکن پھر تم سے رہا نہ گیا" بھائی سجاد کے لہجے میں بے پناہ زہر تھا۔ اس گھڑی وہ جیدی کو بالکل اجنبی شخص لگا۔

جیدی کی ماں نے غصے سے کہا "سجاد! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔ ایسی بھی کیا انہونی ہو گئی ہے۔"

سجاد نے یکدم بھڑک کر انتہائی فیصلے لہجے میں کہا "آپ بیچ میں مت بولیں جی' میں پوچھتا ہوں یہ بیوی میری ہے یا آپ کے بیٹے کی ہے۔ کیوں دو دو مہینے آکر پڑی رہتی ہے یہ یہاں' آپ مجھے بچہ نہ سمجھیں جی۔"

جیدی کی والدہ نے تیز لہجے میں کہا "سجاد تم ہوش میں تو ہو۔"

"ہاں...... ہاں' ہوش میں ہوں" وہ ہیجانی انداز میں غرایا "اور یہ جو نھا ہے نا آپ کا' کوئی ایسا نھا بھی نہیں ہے۔ یہ اتنا ہی لاڈ کرتی ہے نا اس سے تو نکاح پڑھوا لے' مجھے نہیں چاہئے ایسی نافرمان بیوی۔"

سجاد کے آخری الفاظ کمرے میں بم کے دھماکے کی طرح گونجے۔ جیدی کی ماں' آپی شمیم اور وہاں موجود ایک رشتے دار عورت کے منہ کھلے رہ گئے۔ سجاد پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ آپی شمیم میکانکی انداز میں اس کے پیچھے گئی "سجاد!" اس کے لہجے میں دنیا بھر کی التجائیں سمٹی ہوئی تھیں۔ لیکن سجاد کے قدم نہیں رکے۔ آپی شمیم وہیں ایک کرسی پر ڈھیر ہو کر سسکیوں سے رونے لگی۔

"چپ کر شمیم...... چپ کر میری بیٹی" جیدی کی ماں نے اسے دلاسا دیا "وہ پاگل ہو رہا ہے۔ بھلا یہ کوئی باتیں ہیں کرنے کی۔"

تھوڑی دیر میں جیدی کے والد بھی آگئے۔ وہ صورت حال دیکھ کر حیران ہوئے۔

جیدی کی ماں نے ایک طرف لے جا کر ان سے کچھ باتیں کیں۔ ان کے چہرے پر بھی گہری تشویش نظر آنے لگی۔ جیدی کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا۔ جیدی کے والد آپی شمیم کے پاس آئے' اس کے سر پر پیار دیا' کندھا تھپتھپایا' بولے۔

"حوصلہ رکھو بیٹی...... میں تمہیں خود لے کر جاتا ہوں خانیوال۔ اس سے بات بھی کرتا ہوں۔ اس نے سمجھ کیا رکھا ہے ہمیں۔"

آپی شمیم کے جانے کا سن کر جیدی کے دل پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ جیسے سکتے میں آچکا تھا۔ آپی کے مشتعل شوہر کا فقرہ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ "یہ اتنا ہی لاڈ کرتی ہے نا اس سے تو نکاح پڑھوا لے۔" یہ کیا بات کہہ دی تھی اس شخص نے۔ کتنی عجیب بات تھی یہ...... لیکن کتنی اچھی لگتی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے جیدی کے ابا میاں سسکیاں بھرتی ہوئی آپی شمیم کو لے کر خانیوال روانہ ہو گئے۔ ان کی واپسی پورے تین روز بعد ہوئی۔ ان کی واپسی کا پتا جیدی کو اپنی امی کی زبانی چلا۔ وہ یہ جان کر ششدر رہ گیا کہ ابا میاں کے ساتھ آپی شمیم بھی واپس آگئی ہے۔ بعد میں جیدی کے بستر کے گرد دو تین روز تک جو باتیں ہوئیں ان سے جیدی کو تمام صورت حال معلوم ہو گئی۔ ابا میاں آپی کو لے کر خانیوال پہنچے تو سجاد کے مکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ خانیوال میں سجاد کا کوئی رشتہ دار تو تھا نہیں۔ اڑوس پڑوس والوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کچھ بتا کر نہیں گیا۔ مجبوراً ابا میاں کو آپی شمیم کے ساتھ ایک واقف کار کے گھر قیام کرنا پڑا۔ ان کا خیال تھا کہ کل تک سجاد کہیں سے لوٹ آئے گا۔ لیکن...... دو دن گزرنے کے باوجود وہ نہیں آیا تو ابا میاں آپی کو لے کر ملتان سجاد کے ماں باپ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ سجاد کے گھر والوں نے ابا میاں کے ساتھ بے رخی کا برتاؤ کیا اور کچھ نازیبا باتیں بھی کیں۔ ابا میاں پہلے تو بے حد تحمل سے کام لیتے رہے پھر ان کی رگوں کا راجپوت خون اچھل پڑا۔ انہوں نے آپی کے سسرال والوں کو دھواں دھار جواب دیے اور آپی کو لے کر لاہور واپس آگئے۔ اب آپی ان کے گھر میں تھیں۔ آپی اور دوسرے گھر والوں کی پریشانی کا سوچ کر جیدی کو دکھ ہو رہا تھا لیکن اندر ہی اندر کہیں بہت گہرائی میں ایک طرح کا اطمینان بھی تھا اطمینان یہ تھا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس کی کوئی اہمیت ہے۔ وہ بالکل بچہ نہیں ہے۔ وہ کسی کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

اس واقعے کے بعد آپی شمیم تین چار دفعہ اسکی خبر گیری کے لئے آئی تاہم جیدی نے محسوس کیا کہ اس کے رویے میں وہ پہلے جیسی بے تکلفی نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں سوچی رہتی تھیں اور وہ بہت کم بولتی تھی۔ جس روز جیدی اسپتال سے فارغ ہو کر گھر گیا اس روز گھر میں ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ یہ واقعہ سچ مچ کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ ابا میاں کو ایک رجسٹری لفافہ موصول ہوا۔ اس لفافے میں آپی کے لیے طلاق کے کاغذات تھے۔ سجاد نے آپی کو طلاق بھیج دی تھی۔ ان کاغذات کو پڑھ کر ابا میاں خوب گرجے برسے۔ پوری کوٹھی میں کسی آبلہ پا کی طرح دندناتے رہے۔ انہوں نے آپی کے شوہر کو غائبانہ بے نقط سنائیں۔ اس شام گاؤں سے آپی کے والد اور والدہ بھی پہنچ گئے۔ ابا میاں نے پہلے تو انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر علی الاعلان کہا کہ آپی شمیم ان کی بیٹی ہے۔ اگر یہ طلاق موثر ہو گئی تو وہ اپنی بیٹی کی شادی خود کریں گے اور دھوم دھام سے کریں گے۔

جیدی کو کچھ پتا نہیں تھا، آپی شمیم پر اس طرح کی باتوں کا کیا اثر ہو رہا ہے تاہم اتنا اسے بھی پتا چل چکا تھا کہ آپی کا شوہر کسی طرح بھی اس کے لائق ثابت نہیں ہوا تھا۔ اسکا کسی بری عورت سے ملنا جلنا تھا وہ جو تھوڑا بہت کماتا تھا اپنے اللوں تللوں میں اڑا دیتا تھا۔ اس نے آپی کو کئی بار مارا پیٹا بھی تھا۔ یہ تمام باتیں سن کر جیدی کو آپی کے سابقہ شوہر سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی۔ اس نے تصور میں آپی کو اپنے شوہر کے تھپڑ کھاتے اور سسکیاں بھرتے دیکھا۔ اس کا دل چاہا، وہ شخص اس وقت اس کے سامنے ہو اور وہ اس سے اپنی آپی کی توہین کا یادگار بدلہ لے۔

اس کے بعد کے واقعات کا علم جیدی کو تفصیل سے نہیں ہوا۔ تاہم وہ اتنا جان گیا کہ آپی کی شوہر سے علیحدگی ہو گئی ہے اور اب وہ چند روز میں لاہور سے اپنے گاؤں واپس جانے والی ہے۔ اس کے دل میں ایک بار پھر اداسی گھر کرنے لگی۔ وہ چوری چوری دروازوں کھڑکیوں کے پیچھے سے آپی کو تکنے لگا۔ ایک بار وہ آپی کو دیکھتا تو پھر دیکھتا ہی چلا جاتا۔ جیسے آنکھوں کے راستے اس کی صورت دل میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ اس کا تصور اتنا اجاگر کر لینا چاہتا ہو کہ اس کے جانے کے بعد بھی جب چاہے اسے دیکھ سکے......... اور پھر آپی واپس اپنے گاؤں چلی گئی۔

☆-----------☆-----------☆

تین برس گزر گئے۔ جیدی اب دسویں کلاس میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے

پڑھائی کے میدان میں بھی اپنی موروثی ذہانت کا ثبوت دیا تھا......... وہ اسکول میں بزم ادب کا جنرل سیکرٹری تھا۔ مختلف رسالوں میں بھی اس کی لکھی ہوئی کہانیاں اور مضامین چھپتے تھے۔ کلاس میں وہ ہمیشہ اول آیا تھا۔ قوی امکان تھا کہ وہ میٹرک میں بھی امتیازی نمبروں سے پاس ہوگا۔ ان تین برسوں میں جیدی کے لئے سب کچھ بدل چکا تھا۔ ہم جولی بدل گئے تھے، کتابیں بدل گئی تھیں، مشاغل بدل گئے تھے لیکن اگر کچھ نہیں بدلا تھا تو وہ آپی شمیم کی یاد تھی۔ ہر ہر گھڑی، ہر ہر پل جیدی نے اس چہرے کو یاد رکھا تھا جو اس کے سفید دل پر انمٹ روشنائی سے تصویر ہو چکا تھا۔ سوتے جاگتے، پڑھتے کھیلتے، ہنستے روتے وہ ایک ہی سحر میں گرفتار رہا تھا۔ ایک ہی تصور تھا جس نے اس کی سوچوں کو گھیرے رکھا تھا۔ چاندنی راتوں میں، ساون کی پھواروں میں، گرما کی تپتی سنسان دوپہروں میں، سرما کی سرمئی شاموں میں، کہاں اور کب وہ چہرہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ ہر جگہ اس کے ساتھ تھا۔ اس نے بارہا ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک شفاف کمرا ہے۔ وہ کسی کے نرم زانو پر سر رکھے کوئی ان کہی کہانی سن رہا ہے۔ کہانی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں، وہ ان لفظوں کو سن تو رہا ہے لیکن سمجھ نہیں رہا۔ اس کی تمام تر توجہ کہانی سنانے والے کے لباس پر ہے۔ ایک سوتی قمیض پر سرخ پھول ہیں۔ وہ پھولوں کے پیچ خم میں الجھا ہوا ہے۔ پھولوں کے دائرے اور خطوط دیکھ رہا ہے۔ پھر یہ پھول قمیص سے جدا ہوتے ہیں اور پورے کمرے میں بھر جاتے ہیں۔ اب اوپر نیچے ہر طرف پھول ہی پھول ہیں......... وہ ان پھولوں کے گداز میں غرق ہو جاتا ہے۔

اس خواب کے بعد جب بھی جیدی کی آنکھ کھلی، اس کے دل میں اس دور دراز گاؤں میں جانے کی خواہش پیدا ہوئی جہاں آپی شمیم رہتی تھی۔ آپی شمیم کے والد دو برس پہلے فوت ہو چکے تھے اور جیدی نے سنا تھا کہ آپی شمیم جس نے پہلے میٹرک کیا ہوا تھا اب پرائیویٹ طور پر ایف اے کی تیاری کر رہی ہے۔ بزرگوں کی طرف سے اس کی دوسری شادی کا تذکرہ بھی ایک آدھ بار سننے میں آیا تھا۔ اتفاق یہ تھا کہ ابھی تک جیدی کی گاؤں جانے کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی وہاں سے کوئی آیا تھا۔ ایک دو بار جیدی نے امی سے تذکرہ کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی گولا سا حلق میں پھنس کر رہ گیا۔ آخر کار اس نے یہ کوشش ترک کر دی۔ ایک روز جیدی اسکول سے گھر آیا تو امی کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ جیدی کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ گاؤں جا رہی ہیں، ایک مدت ہو گئی ہے گاؤں کی شکل دیکھے ہوئے، سوچا ہے، ذرا ہوا بدل جائے گی۔ ایکا ایکی جیدی کا جی مچل

گیا۔ اس نے کہا "امی' مجھے بھی لے چلیں۔" امی نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولیں "اور اسکول تیری جگہ تیرے ابا میاں جائیں گے۔"

جیدی اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ امی نے اسے آزردہ دیکھا تو کہنے لگیں "ایسا کرنا جب تیرے ابا میاں مجھے لینے آئیں تو ان کے ساتھ آجانا۔"

"کب؟" جیدی نے بے تابی سے پوچھا۔

"ایک مہینے سے پہلے نہ آنا' میں نے تیرے ابا کو بھی سمجھا دیا ہے۔"

"ایک مہینہ!" جیدی نے زیر لب دہرایا۔ ایک دم ہی یہ ایک مہینے کا فاصلہ اسے لامتناہی لگنے لگا.........

ایک طویل اور کٹھن انتظار کے بعد وہ دن آیا جب جیدی اپنی امی کو لینے ابا میاں کے ساتھ گاؤں روانہ ہوا۔ جیدی کا ایک ہم عمر چچا زاد انور بھی سیر کے شوق میں ان کے ہمراہ چل پڑا۔ گھی کے دو بڑے بڑے ڈبے بھی ان کے ساتھ تھے۔ رمضان شروع ہونے والا تھا اور یہ جیدی کے ابا میاں کا دستور تھا کہ رمضان سے پہلے گاؤں کا ایک چکر لگاتے تھے۔ اس چکر کا مقصد سیر سپاٹے کے علاوہ گاؤں سے گھی لانا بھی ہوتا تھا۔ گاؤں میں اب آپی شمیم اور چچی شریفاں (آپی شمیم کی والدہ) کے علاوہ ان کا کوئی رشتہ دار نہیں رہ گیا تھا۔ بزرگ راہی عدم ہو چکے تھے۔ نئی نسلیں شہر میں منتقل ہو چکی تھیں۔ وہ گاؤں جاتے تھے تو چچی شریفاں کے مہمان ہی ٹھہرتے تھے۔

جب گاڑی گاؤں میں داخل ہوئی' جیدی کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ گاؤں میں لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ خاص طور پر پرانے لوگ تو قدموں میں بچھ بچھ جاتے تھے۔ بڑی نوابی شان کے ساتھ انہیں گاؤں کے دائرے میں پہنچایا گیا۔ وہاں دودھ' مکھن اور لسی وغیرہ سے تواضع کرانے کے بعد وہ مرحوم چچا صدیق کے گھر روانہ ہوئے۔ چچی شریفاں کچھ بیمار رہتی تھیں۔ تاہم انہوں نے گھر کی سیڑھیاں اتر کر گرم جوشی سے ابا میاں اور جیدی کو خوش آمدید کہا۔ گاؤں کی بوڑھی عورتیں ایک ہی سانس میں ابا میاں اور جیدی کی بلائیں لینے لگیں۔ وہیں پر جیدی کی نگاہ اس چہرے پر پڑی جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ نیلی اوڑھنی لئے ایک عورت کے پیچھے کھڑی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کا اجالا تھا اور آنکھوں میں مسرت کی چمک' پھر وہ آگے بڑھی اور اس نے جیدی کے ابا کو سلام تایا جی' کہا۔ ابا میاں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کندھے سے لگایا۔ اس وقت جیدی کی نظر اس کی نظر سے ٹکرائی ایک لمحے کے لئے برق سی کوند گئی۔ ایک ساعت کے

ہزارویں حصے کے لئے وہ ٹھٹکی پھر آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جیدی کے سر پر پھیرے۔

"ماشاء اللہ جیدی تو کتنا بڑا ہو گیا ہے۔"

مخصوص خوشبو جیدی کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ نیم جان سا ہو گیا۔

☆-----------☆-----------☆

اگلے روز شب برات تھی۔ شام ہوتے ہی گاؤں کی منڈیروں پر موم بتیاں جھلملانے لگیں۔ قریبی قصبے سے بہت سے لوگ آتش بازی کا سامان بھی لے کر آئے تھے۔ گلیوں میں بچے پھلجھڑیاں لے کر بھاگے اور ہوائیاں فضا میں چھوٹیں تو جشن کا سماں نظر آنے لگا۔ جیدی بھی آتش بازی لے کر آیا تھا۔ وہ اپنے دوست انور اور گاؤں کے دو دوسرے لڑکوں کے ساتھ گھر کی چھت پر چڑھ گیا۔ ان کے پاس کم از کم ڈھائی سو روپے کی آتش بازی تھی۔ انہوں نے خوب ہلا گلا کیا۔ امی اور چچی کی مسلسل آوازیں سن کر بھی جب یہ لڑکے نیچے نہیں اترے تو چچی نے ان کے لئے حلوہ اور میٹھے چاول کی پلیٹیں اوپر چھت پر بھیج دیں۔ یہ پلیٹیں لے کر شمیم اوپر آئی۔ اسے دیکھ کر جیدی کو لگا جیسے ایک چاند مغرب سے بھی طلوع ہو گیا ہے۔ رنگین کپڑوں میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ بالکل اس فلم کے مرکزی کردار کی طرح جو جیدی نے پچھلے برس کسی تہوار پر دیکھی تھی اور جو بری طرح اس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکی تھی۔ اس فلم میں ایک عورت کو اپنے سے کئی برس چھوٹے مرد سے شادی کرنا پڑتی ہے۔ یہ مرد اس کا دیور ہے۔ شوہر کی موت کے بعد ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے دیور سے بیاہی جاتی ہے۔ یہ فلم جیدی نے تین مرتبہ دیکھی تھی اور ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ پسند کی تھی۔ اس کہانی کے بارے میں سوچتے ہوئے جیدی کے کانوں میں وہ بھولا بسرا فقرہ گونجنے لگتا تھا جو آپی شمیم کے شوہر نے اسپتال کے کمرے میں کہا تھا۔ کتنا زہر اور طنز تھا اس فقرے میں' "یہ اتنا ہی لاڈ کرتی ہے تا اس سے تو نکاح پڑھوالے" اس فقرے کی بازگشت جیدی کے اندر ایک عجیب سی ہلچل پیدا کر دیتی تھی۔

اس رات آتش بازی سے فارغ ہو کر انور اور جیدی کھیتوں میں چہل قدمی کے لئے نکل گئے۔ چوہدریوں کا ایک مسلح کارندہ حفاظت کے پیش نظر ان کے ساتھ تھا لیکن وہ کافی فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا۔ وہ دونوں ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پوری رات کا چاند ان کے سر پر چمک رہا تھا۔ انور' جیدی سے ایک سال بڑا تھا۔ یوں بھی

اس نے نسبتاً آزادانہ ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہ ناولوں' فلموں' کھلاڑیوں اور عورتوں کے بارے میں اس سے زیادہ جانتا تھا۔ وہ جیدی سے بولا۔

"میں شرط لگا سکتا ہوں' وہ برا نہیں مانے گی۔ پیارے ہم ایک جھلک دیکھ کر لڑکی کا اندر پہچان لیتے ہیں۔ یہ نظر نہیں ہے' ایکسرے ہے ایکسرے۔"

جیدی بولا "یار کچھ خدا کا خوف کر' تو اسے لڑکی کہہ رہا ہے تیری بڑی باجی سے بھی ایک دو سال زیادہ عمر ہے اس کی۔"

انور نے کہا "پاگل خانے' یہی تو وہ عمر ہوتی ہے جس میں کہانیاں بنتی ہیں اور دھماکے ہوتے ہیں۔ ہم تم کیا جانیں اس عمر کے بارے میں' بائیس سال سے زیادہ عمر نہیں ہے اس کی' تیری چودہ سے کیا کم ہوگی۔ الزبتھ ٹیلر کا کچھ پتا ہے تجھے.......... کتنی عمر ہے اس کی.......... اور اس کے پانچویں شوہر کی عمر بھلا کتنی تھی..........؟"

جیدی نے کہا "میں تیری بات سمجھ گیا ہوں یار' لیکن کیا کہوں اس سے' کس طرح کہوں؟"

انور نے کہا "پہلی بات تو یہ ہے کہ آج سے قسم کھالے کہ اسے آپی نہیں کہنا۔"

"وہ تو میں پہلے ہی کھا چکا ہوں۔"

"گڈ' اب ایسا کرو کہ ایک خط جو نہ زیادہ سنجیدہ ہو اور نہ واہیات' اس کے نام لکھو' بالکل سیدھا سادہ خط ہو۔ کچھ بنانے سنوارنے کی ضرورت نہیں۔ ایک بات یاد رکھو' جو بات دل سے نکلتی ہے وہ سیدھی دل پر اثر کرتی ہے۔"

جیدی نے کہا "یار' سچ پوچھو تو میں نے ایک چھوٹا سا خط لکھ بھی رکھا ہے' مگر اب اگلا قدم کیا اٹھاؤں؟"""

انور نے اسے گھور کر دیکھا "بڑا چھپا رستم ہے جیدی تو.......... دکھا ذرا مجھے خط۔"

☆--------------☆--------------☆

اگلے روز دوپہر کے وقت جب ابا میاں' امی جان' جیدی اور انور وغیرہ چوہدریوں کی حویلی میں دعوت کھا رہے تھے' جیدی جلدی سے فارغ ہو کر گھر پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے شمیم برآمدے میں اکیلی مل گئی۔ وہ کوئی سویٹر قسم کی چیز بن رہی تھی۔ یوں تو گھر میں چچی بھی موجود تھیں۔ لیکن وہ اندر لیٹی ہوئی تھیں اور جیدی جانتا تھا' بیماری کی وجہ سے وہ کم ہی بستر سے اٹھتی ہیں۔ شمیم کے سامنے پہنچ کر جیدی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا۔ پھر ایک لہری اس کے اندر سے اٹھی اور اس نے جیب سے کاغذ نکال کر شمیم کی گود میں پھینک دیا۔ شمیم نے چونک کر کاغذ کی طرف دیکھا' ایک نگاہ جیدی کے چہرے پر ڈالی۔ یہ بڑی عجیب نگاہ تھی۔ اندر تک اترتی ہوئی اور ایک ساعت میں سب کچھ سمجھتی ہوئی۔ اس نے سر جھکا کر گود سے کاغذ اٹھایا اور اس کی تہیں کھول کر پڑھنے لگی۔ جیدی چند لمحے تو اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھتا رہا' پھر تاب نہ لا سکا اور واپس صحن کی طرف مڑا۔

"جیدو!" عقب سے شمیم نے آواز دی۔ اس کی آواز میں تحکم تھا۔ جیدی کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے گھوم کر دیکھا "ادھر آؤ جیدو" شمیم نے ایسے انداز میں کہا کہ وہ خود بخود چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اون کے گولے ایک طرف ہٹائے اور بولی "ادھر بیٹھو میرے پاس" جیدی کسی معمول کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کا دیا ہوا خط ابھی تک شمیم کی سپید مٹھی میں تھا۔

"جیدو" شمیم کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی "بڑوں سے ایسی باتیں کرتے ہیں؟"

جیدی کے ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکا۔ ان لمحوں میں اس نے خود کو مجرم محسوس کیا۔ شمیم نے پہلے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا پھر ناصحانہ انداز میں بولی "جیدو! تایا جان یا خالہ کو اس بات کا پتا چل جائے تو پتا ہے کیا طوفان اٹھ جائے' بہت بری بات ہے یہ۔ باجیوں سے بھلا کوئی ایسی باتیں کرتا ہے۔"

وہ جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی.......... جیدی پر گھڑوں پانی پڑ رہا تھا۔ اس کے لئے وہاں بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ ایک جھٹکے سے وہ اٹھا اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

کمرے میں بند ہو کر وہ شام تک روتا رہا۔ شام کو اس کی ماں چوہدریوں کی حویلی سے واپس آئی تو جیدی کو لحاف میں گھسے پایا۔ لالٹین روشن کر کے اس نے جیدی کو اٹھانے کی کوشش کی۔ جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ جیدی رو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور تکیہ بھیگا ہوا تھا۔ ممتا تڑپ اٹھی' وہ پکار کر بولیں۔

"ہائے وے جیدی! کیا ہوا تجھے' کیوں رو رہا ہے؟"

جیدی نے اپنا چہرہ ایک جھٹکے کے ساتھ ماں کے ہاتھوں سے آزاد کیا اور دوبارہ کروٹ بدل کر رونے لگا۔ اسکی آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جسم کا سارا پانی آنکھوں کے راستے نچڑ جائے گا۔ جیدی کی امی نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور بیٹے کے سرہانے بیٹھ کر اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ جیدی کی ہچکیوں میں شدت آتی چلی گئی۔ وہ ماں کو دھکیل دھکیل کر خود سے دور ہٹا رہا تھا۔ اکلوتے لاڈلے کی حالت ماں سے دیکھی نہیں گئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگیں۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھیں "کیا ہوا ہے جیدی؟ کچھ بتا تو سہی۔"

یہ ایک بہت مشکل سوال تھا لیکن روتے روتے اچانک اس سوال کا جواب جیدی کی نوک زبان پر آگیا۔ وہ تکئے میں منہ گھسیڑے گھسیڑے عجیب ضدی لہجے میں بولا "میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

کمرے میں جیسے کوئی شے چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ چند لمحے گھمبیر خاموشی طاری رہی پھر ماں کی آواز ابھری "کس سے؟"

"اس سے" جیدی نے مبہم جواب دیا۔ تاہم ماں یہ جواب سمجھ گئی۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک ماں تھی.......... ایک خطرناک اور پراندیش وقفے کے بعد ماں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"شمیم سے؟"

"ہاں" جیدی نے جواب دیا "میں شادی کروں گا تو.......... اس سے کروں گا۔"

"جیدی' یہ کیسی باتیں کر رہا ہے تو؟"

"بس' میں نے کہہ دیا جو کہنا تھا" جیدی نے بدستور چہرہ تکئے میں چھپائے ہوئے

جواب دیا۔ ہچکیوں سے اس کا پورا جسم دہل رہا تھا۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے پتر" اس کی ماں نے لرز کر کہا۔

وہ دلیری سے بولا "کروں گا' کروں گا۔ اگر میری بات نہ مانی تو وہ سب کچھ کروں گا جو میرے دل میں آئے گا۔"

اس کے دو ٹوک لہجے میں خوف ناک دھمکیاں پوشیدہ تھیں۔ بیٹے کی جان کے خوف سے ماں دہل گئی۔ وہ اس کا سر گود میں لے کر بال سہلانے لگی۔ پیشانی پر ہاتھ لگایا تو وہ تپ رہی تھی "ہائے وے.......... تجھے تو بخار ہو رہا ہے۔"

کہیں جیدی کو پھر وہی موذی بخار تو نہیں آگیا تھا۔ اس سوچ نے ماں کو دہشت زدہ کر دیا۔ وہ جھک کر جلدی جلدی اس کی پیشانی چومنے لگی۔ "اچھا.......... اچھا تو چپ کر' جو تو کہے گا وہی کرلیں گے۔"

"مجھے بہلائیں مت' اب میں بچہ نہیں ہوں" اس نے مچل کر اپنا سر ماں کی گود سے نکال لیا "مجھ سے بالکل ٹھیک ٹھیک بات کریں۔ ابا میاں کو بھی بتا دیں' سب کو بتا دیں' مجھے کسی سے خوف نہیں۔ میں کچھ چھپانا نہیں چاہتا" ایکا ایکی جیدی میں نہ جانے کہاں سے اتنا حوصلہ آگیا تھا۔

"اچھا' اچھا سب کچھ ہو جائے گا' سب ٹھیک ہو جائے گا' تو چپ کر" ماں نے اس کا چہرہ گود میں دبا لیا۔ جیسے اس کی آواز کو کمرے کے اندر روکنا چاہتی ہو۔

جیدی نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "بس کریں' مجھے آپ کی جھوٹی تسلیاں نہیں چاہئیں' اکیلا چھوڑ دیں مجھے۔"

ماں نے پرسوچ لہجے میں کہا "کیا.......... اس نے .... میرا مطلب ہے شمیم نے کوئی بات کہہ دی ہے۔"

جیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں رونے میں تھوڑی سی شدت ضرور آگئی۔ ماں نے سرگوشی میں کہا "اچھا چپ کر' میں جا کر اس سے پوچھتی ہوں۔ رونا نہیں اب' دیکھ بدن آگ کی طرح تپنے لگا ہے۔ چہرہ بھی سرخ ہو رہا ہے۔ رونا نہیں اب۔"

اس کے اوپر اچھی طرح لحاف ڈال کر اور لالٹین کی لو نیچے کر کے جیدی کی امی باہر نکل گئیں۔

جیدی اپنی جگہ ساکت پڑا رہا۔ رہ رہ کر ایک لہر اس کے اندر سے اٹھتی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ بند کمرے سے باہر گھر والوں کی ملی جلی آوازیں

آرہی تھیں۔ انور کی آواز آئی "جیدی کہاں ہے؟" شمیم کی امی نے جواب دیا "اس کے سر میں درد ہو رہا ہے' گولی کھا کر لیٹا ہوا ہے" ایک آدھ بار ابا میاں کی آواز بھی سنائی دی۔ انہیں صبح چوہدری قربان علی کے ساتھ مچھلی کے شکار پر جانا تھا اور وہ اپنا سامان وغیرہ ٹھیک کر رہے تھے۔ کافی دیر کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ غالباً ابا میاں صبح سویرے اٹھنے کے لئے جلدی بستر پر چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ چیں کی آواز سے وا ہوا۔ جیدی نے قیاس کیا کہ شاید انور اندر جھانک رہا ہے یا ہو سکتا ہے امی آئی ہوں۔ چند لمحے بعد اسے قدموں کی چاپ اپنے بالکل قریب سنائی دی۔ یکایک اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا' آنے والا کوئی اور تھا۔ جیدی نے دم سادھ لیا' کسی نے لحاف کے اوپر سے اس کا کندھا ہلایا۔ آپی شمیم کی شیریں آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"جیدی' دودھ پی لو۔"

وہ اپنی جگہ ساکت رہا' آپی نے دودھ کا گلاس لکڑی کی تپائی پر رکھ دیا۔ چند لمحے گھمبیر خاموشی رہی۔ جیدی نے سوچا شاید وہ بے آواز چلتی باہر نکل گئی ہے لیکن نہیں' وہ یہیں تھی۔ اس کے قریب ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اسنے نرم آواز میں کہا۔

"جیدی' میں نے تجھ سے ایسی کیا بات کہہ دی تھی جو خالہ کو اتنا ستا رہا ہے' میں نے یہی کہا تھا نا.........؟"

"بس چپ کرو" جیدی نے پھنکار کر اس کی بات کاٹی "میں سن چکا ہوں سب کچھ' جاؤ اب مہربانی کر کے یہاں سے۔"

اس کے لہجے نے شمیم کو کاٹ کر رکھ دیا۔ کتنی ہی دیر وہ کہنے کے لئے کوئی فقرہ نہ ڈھونڈ سکی۔ آخر کار وہ پسپائی کے انداز میں بولی "اچھا یہ رونا دھونا بند کرو' بیمار پڑ جاؤ گے تو ہماری جان کو مصیبت پڑے گی نا۔"

جیدی کی ہچکیاں کچھ اور تیز ہو گئیں۔ اس کے حلق میں کوئی گولا سا پھنسا ہوا تھا۔ نہ آگے جاتا تھا اور نہ پیچھے۔ شمیم نے روہانسی آواز میں کہا "اچھا اب کیا چاہتے ہو' معافی دے دو اگر میں نے کوئی غلط بات کہی ہے تو......... چلو اٹھو......... اٹھو اب۔"

نہ جانے یہ کیسی ہچکیاں تھیں جو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ جیدی کوشش کے باوجود انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ شمیم نے جیدی کا کندھا تھاما اور زور لگا کر اس کا رخ اپنی طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ دبے ہوئے غصے سے بولی "جیدی' اب تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ تمہاری......... ہر بات مان رہے ہیں' پھر بھی تم ٹیڑھے کے

ٹیڑھے ہو۔"

وہ غصے سے بولا "کوئی میری بات نہیں مانتا' میں جانتا ہوں مجھے بہلا رہے ہو تم لوگ۔ یہ سب اوپر کی باتیں ہیں' جو بات اتنی جلدی مان لی جاتی ہے' وہ کبھی دل سے نہیں مانی جاتی" پتا نہیں اتنا حوصلہ اور اتنی باتیں اسے کہاں سے آگئی تھیں۔ وہ اپنی سرخ انگارہ آنکھیں شمیم کی آنکھوں میں گاڑ کر بولا "مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا۔ پلیز......... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

شمیم چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ جیسے فیصلہ کر رہی ہو کہ اس سے سخت رویہ اختیار کرے یا نرمی سے سمجھانے کی کوشش کرے۔ آخر اس نے دھیمے دھیمے لہجے میں کہا "نہیں......... میں نہیں جاؤں گی۔ پہلے یہ دودھ پی لو۔"

"نہیں پیوں گا۔"

اس نے زبردستی دودھ والا گلاس جیدی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اسی دوران دروازے کے بالکل پاس سے شمیم کی امی کی نحیف آواز سنائی دی' وہ شمیم کو پکار رہی تھیں۔ شمیم نے بوکھلا کر کہا "آئی امی" اور اوڑھنی درست کرتی ہوئی جلدی سے باہر نکل گئی۔

☆---------------☆---------------☆

اگلی صبح جیدی سو کر اٹھا تو کل شام والے واقعات اسے خواب کی طرح محسوس ہوئے۔ اسے امی اور شمیم سے عجیب طرح کی جھجک محسوس ہونے لگی۔ تاہم اس جھجک میں ایک بے نام خوشی کی آمیزش بھی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنی منزل کی جانب اس نے ایک بڑا قدم اٹھایا ہے۔ نہ صرف امی کو اس کے دل کا حال معلوم ہو گیا تھا بلکہ شمیم پر بھی سب کچھ کھل گیا تھا۔ پھر اسے وہ کشمکش یاد آئی جو رات اس میں اور شمیم میں ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں گدگدی سی ہونے لگی جیسے وہ آسمانی جھولے میں بیٹھا تیزی سے نیچے آرہا ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ شمیم اس سے کچھی کچھی سی ہے۔ وہ حسب معمول برآمدے میں صفائی کرنے نہیں آئی۔ ناشتے کے دوران بھی سارا وقت دھواں دھواں باورچی خانے میں بیٹھی رہی۔ نہ جانے کیوں جیدی کو اس کا یہ کھچاؤ برا نہیں لگا۔

انور ابا میاں کے ساتھ ہی مچھلی کے شکار پر جا چکا تھا۔ جیدی دوپہر تک گمشدہ گائے کی طرح اکیلا کھیتوں میں پھرتا رہا۔ دوپہر کو تندرو کی بیسن والی روغنی روٹیوں کے ساتھ چاٹی کی مزیدار لسی کے دو گلاس پی کر وہ کوٹھے پر چلا گیا۔ یہاں ایک بوسیدہ چارپائی پر

اوندھا لیٹ کر وہ منڈیر کے سوراخوں سے نیچے گھر کے صحن میں جھانکنے لگا۔ شمیم دھوپ میں چارپائی ڈالے سویٹر بن رہی تھی۔ جیدی کی امی پاس بیٹھی رات کے کھانے کے لئے چاول چن رہی تھیں۔ جیدی کی نگاہیں شمیم کی قمیص کے پھولوں میں الجھنے لگیں۔ یہ پھول ان پھولوں سے ملتے جلتے تھے جو وہ چار برس پہلے دیکھا کرتا تھا۔ ہاں رنگ ذرا مختلف تھا۔ ان پھولوں کو دیکھ کر اور ان کے پیچ و خم میں الجھ کر جیدی کے دل میں کہانی سننے کی خواہش جاگا کرتی تھی۔ ایسی کہانی جو بہت طویل ہو اور جسے سنانے کے دوران آپی شمیم کسی کے کہنے پر بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ بس اس کا سر اپنی گود میں رکھے سناتی چلی جائے۔ لیکن آج.......... آج اس کی خواہش کا رنگ بدل گیا تھا۔ آج ان پھولوں کو دیکھ کر جیدی کے دل میں عجیب بے سروپا خیالات آ رہے تھے۔ کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ ان پھولوں کو ناک سے لگا کر سونگھتا چلا جائے۔ کبھی دل چاہتا تھا کہ ان پھولوں پر کوئی ایسا تیز رنگ پھینکے کہ پھولوں کے سارے رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں۔ کبھی اس کی نگاہ پھولوں سے اوپر ایک شفاف اور ہموار گردن پر مرکوز ہو جاتی۔ معلوم نہیں شمیم اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر رہی تھی یا یہ صرف جیدی کا وہم تھا۔ اس نے دو تین بار نظریں اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور ہر بار جب وہ دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئی تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا لہراتا ہوا نظر آیا۔

اگلے روز جیدی کو گھر والوں کے ساتھ واپس لاہور چلے جانا تھا۔ اس نے وہیں چھت پر بیٹھے بیٹھے ایک پرانے ڈائجسٹ میں سادے کاغذ کے ورق رکھے اور ایک طویل خط لکھنا شروع کیا۔ یہ خط شمیم کے نام تھا۔ وہ دسویں میں پڑھتا تھا لیکن اس کی تحریر میں بی اے کے طالب علم جیسی پختگی تھی۔ بڑی احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ اس نے شمیم کو اپنے دلی جذبات سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ اس نے وہ سب کچھ اگل دیا جو وہ زبان سے کہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنا یہ خط ان سطور پر ختم کیا۔

"میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں بچہ نہیں ہوں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر لکھا ہے اگر میری شادی ہو گی تو تم سے ہو گی.......... اگر تم اور امی مجھے زندہ اور سلامت دیکھنا چاہتی ہو تو میری باتوں کو مذاق میں نہ لینا.......... میں چار ساڑھے چار سال تک بی اے کر لوں گا۔ ابا میاں کئی بار کہہ چکے ہیں کہ وہ میری شادی زیادہ دیر سے نہیں کریں گے۔ ایک بار انہوں نے میرے سامنے امی سے کہا تھا کہ ان کی شادی بی اے کے فوراً بعد ہوئی تھی' وہ میری شادی بھی اسی عمر میں کریں گے۔ اس کا مطلب ہے'

ساڑھے چار پانچ سال تک میری شادی ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہے۔ میں کل اس امید کے ساتھ یہاں سے جا رہا ہوں کہ پانچ سال بعد پھر یہاں آؤں گا۔ اور جس دن میں یہاں آؤں گا وہ ہم دونوں کی شادی کا دن ہو گا.......... خدا حافظ۔"

جس طرح جیدی نے یہ خط اچانک شروع کیا تھا اسی طرح اچانک ہی ختم کر دیا۔ خط کو ایک ہوم میڈ لفافے میں بند کر کے جیدی نے جیب میں ڈال لیا اور موقعے کی تاک میں ادھر ادھر منڈلانے لگا۔

یہ موقع اسے شام سے تھوڑی دیر قبل ملا۔ شمیم کوئلوں والی استری دہکا کر جیدی اور ابا میاں کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ یہ کپڑے انہیں صبح پہن کر جانا تھے۔ جیدی جب کمرے میں داخل ہوا تو شمیم کے ہاتھوں میں جیدی کی ہی ایک پتلون تھی۔ یہ منظر جیدی کو بھلا لگا۔ شاید وہ کچھ دیر کھڑا ہو کر اپنی پتلون کے استری ہونے کا منظر دیکھتا لیکن اسے جلدی تھی۔ خط کا پہنچنا زیادہ اہم تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر اس نے جلدی سے قدم بڑھائے اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مٹھی میں دبا ہوا خط اس نے شمیم کی طرف بڑھا دیا۔ وہ جیسے اس کے اندر داخل ہوتے ہی اس کا مدعا جان گئی تھی۔ خاموشی کے ساتھ اس نے خط لے لیا۔ جیدی کو بے حد اطمینان ہوا کہ اس مرتبہ شمیم کی تیز سوالیہ نظریں اس کی طرف نہیں اٹھی تھیں.......... کچھ کہے سنے بغیر وہ کانپتی ٹانگوں سے باہر آ گیا۔

اگلے روز ناشتے کے بعد وہ لوگ گاؤں سے لاہور آنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ نہ جانے کیا بات تھی' جیدی اب جلدی سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی اب تک کی پیش رفت سے پوری طرح مطمئن تھا۔ وقت رخصت ان کی گاڑی کے گرد گاؤں والوں کا مجمع لگ گیا۔ ننگ دھڑنگ بچے' نیلے اور کالے تہبندوں والی عورتیں' نوجوان لڑکیاں اور پرخلوص' مسکراتے چہروں والے مرد۔ جیدی کے ابا میاں نے نہ جانے کیا سوچا کہ اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا۔ شاید وہ اس طرح گاؤں والوں کو دکھانا چاہتے تھے کہ دیکھو' میرا نو عمر بچہ نہ صرف گاڑیوں میں گھومتا ہے بلکہ گاڑیاں چلاتا بھی ہے۔ اسٹیرنگ سنبھال کر جیدی نے محسوس کیا کہ کئی رشک بھری نگاہیں اس پر لگی ہیں۔ وہ ان نگاہوں میں اپنی مطلوبہ نگاہ تلاش کرنے لگا۔ پھر جلد ہی وہ اسے نظر آ گئی۔ وہ اپنی ماں کے کندھے سے لگی کھڑی تھی۔ جیدی کی نگاہ اس سے ٹکرائی وہ جلدی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ جیدی کو لگا جیسے اس نے کوئی بہت بڑا قلعہ فتح کر لیا ہے اور اب اس قلعے کے

سب سے اونچے برج پر فاتحانہ کھڑا ہے۔ جیدی کی امی نے شمیم کو گلے لگالیا۔ اس کے سر
پر پیار دیا، پھر شمیم کی ماں سے الوداعی باتیں کیں اور گاڑی میں آ بیٹھیں۔ جیدی نے ایک
ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ گاڑی کو آگے بڑھایا۔

☆------------☆------------☆

وقت کا پنچھی شب و روز کے پر لگا کر اڑتا رہا۔ ہفتوں اور مہینوں کے سنگ میل
گرد راہ بنتے رہے۔ اور اس طرح تین سال اور بیت گئے۔ جیدی اب انٹرمیڈیٹ کا
امتحان پاس کر چکا تھا۔ اس نے اپنے سابقہ عزائم کے برخلاف ایف اے کے بجائے ایف
ایس سی کا امتحان دیا تھا اور اچھے نمبر حاصل کئے تھے۔ پچھلے تین سالوں میں صرف دو دفعہ
شمیم سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی دفعہ دو سال پہلے وہ ایک شادی پر شہر آئی تھی۔
جیدی کو وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت اور باوقار لگی تھی۔ جیدی نے خود بھی تیزی سے
قد کاٹھ نکالا تھا اور شمیم سے دو انگل اونچا ہو گیا تھا۔ اس اونچائی کے ساتھ اسے شمیم کی
طرف دیکھنے میں عجیب سی راحت ہوئی تھی۔ ان دونوں میں بہت کم بات ہوئی تھی تاہم
جب آنکھیں بولتی ہوں تو کوئی بات ان کہی نہیں رہ جاتی۔ جیدی کی جلتی ہوئی گستاخ، منہ
زور آنکھوں نے اس کے بیشتر احساسات دوسرے فریق تک پہنچا دیے تھے۔ دوسری دفعہ
شمیم سے ملاقات ایک سانحے پر ہوئی تھی۔ یہ سات آٹھ ماہ پرانی بات تھی۔ جیدی کے ابا
میاں چند ہفتے بیمار رہنے کے بعد انتقال کر گئے تھے۔ یہ ایک طوفان تھا جس نے جیدی اور
اس کی والدہ کی مختصر دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ بہرحال یہ مقام شکر تھا کہ جب وہ اس طوفان
سے نکلے تو اپنے پاؤں پر کھڑے تھے۔ نثار صاحب نے اپنی زندگی میں بڑی اچھی پلاننگ کی
تھی۔ انہوں نے اپنے اہل خانہ کو جس کشتی میں سوا کیا تھا، وہ ناخدا کے بغیر بھی اپنا سفر
بخوبی جاری رکھ سکتی تھی۔ گاؤں میں زمین محفوظ تھی، اس کے سارے معاملات محفوظ اور
ایماندار ہاتھوں میں تھے۔ جیدی کی والدہ کی معمولی نگرانی سے زمینداری کا کام ٹھیک ٹھاک
چل سکتا تھا۔ اس کے علاوہ شہر میں بھی چند دکانیں موجود تھیں، جن کا ماہانہ کرایہ باقاعدگی
سے آتا تھا.......... پھر بھی جیدی کی والدہ کو اب ایک احساس تحفظ درکار تھا۔ جب جیدی
نے انٹر اچھے نمبروں سے پاس کیا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسے ڈاکٹر یا انجینئر بنائیں گی۔
مارکس کم تھے تاہم انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے کوشش شروع کر دی۔

پچھلے تین برسوں میں شمیم کے معاملے میں ماں بیٹا میں کئی دفعہ بات ہو چکی تھی۔
یہ بات عموماً جیدی ہی چھیڑتا تھا۔ اس کا مقصد ماں کو یاددہانی کرانا ہوتا تھا۔ وہ اب اس

مسئلے پر ماں سے کھل کر بات کرتا تھا۔ وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔
اس کی امی اصولی طور پر تو جیدی کا مطالبہ تسلیم کر چکی تھیں لیکن ان کا ذہن اس فیصلے کا
ساتھ کیسے دے سکتا تھا۔ جیدی اور شمیم کا جوڑ جگ ہنسائی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ
ایک مطلقہ عورت تھی، جب کہ ان کے بیٹے نے ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ پھر
جن حالات میں شمیم کو طلاق ہوئی ان کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اب اس بے جوڑ شادی کا
معاملہ چھیڑ کر لوگوں کے شبہات کی تصدیق نہ کی جائے۔ مگر جیدی کے منہ زور جذبے کے
سامنے کوئی مصلحت، کوئی دور اندیشی ٹھہرتی نظر نہیں آتی تھی۔ جیدی کی والدہ کا دل روتا
تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ جیدی کو اس کے راستے سے ہٹانے کی کوشش بہت بڑی
بربادی کا سبب بنے گی۔ وہ موقع دیکھ کر بیٹے کو سمجھانے کی کوشش ضرور کرتی تھیں لیکن
جونہی اس کے چہرے پر برہمی کا پہلا تاثر نمودار ہوتا تھا فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگتی
تھیں۔ کسی کسی وقت وہ واقعی جیدی کی ہم خیال ہو جاتی تھیں۔ وہ سوچتیں، انہیں دنیا
سے کیا لینا ہے، انہیں اپنے بیٹے کی زندگی اور خوشی سے سروکار ہونا چاہئے۔ دنیا والوں کو
کیا حق پہنچتا ہے ان کے بیٹے کو کسی خوشی سے محروم کرنے کا۔ وہ شادی کر کے کوئی گناہ تو
نہیں کرے گا۔ ایسی شادیاں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں.......... وہ باتوں باتوں میں شمیم کی ماں
کو بھی اپنے خیالات سے آگاہ کر چکی تھیں۔ شمیم کی ماں پہلے تو یہ باتیں سن کر بہت حیران
ہوئی تھی پھر دھیرے دھیرے اسے یقین کرنا پڑا تھا۔ اب وہ ذہنی طور پر بڑی حد تک اس
صورت حال کو تسلیم کر چکی تھی.......... اور غالباً یہی وجہ تھی کہ شمیم کی دوسری شادی
کے لئے اس کے ایک دور کے چچا نے جو بات چلائی تھی وہ جلد ہی ختم ہو گئی۔ گاؤں کا
رنڈوا پٹواری احمد رضا بھی اس سلسلے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ جونہی احمد رضا والے معاملے کی
بھنک جیدی کے کانوں میں پڑی وہ غم و غصے سے نڈھال ہو گیا۔ ماں نے اس کی کیفیت
محسوس کر کے فوراً گاؤں کا رخ کیا اور شمیم کی ماں سے باز پرس کی۔ اس تفتیش سے پتا چلا
کہ یہ احمد رضا کی یک طرفہ کاروائی تھی اور شمیم یا شمیم کی ماں نے اس سلسلے میں سوچا
تک نہیں تھا۔

کافی تگ و دو کے بعد جیدی کو ملتان کے نشتر کالج میں داخلہ مل گیا۔ ماں نے
اکلوتے بیٹے کو اس کے بہتر مستقبل کے لئے کلیجے پر پتھر رکھ کر خود سے جدا کیا۔ جس صبح
جیدی کو کلاس جوائن کرنے کے لئے لاہور سے روانہ ہونا تھا اس رات ایک بار پھر ماں بیٹا
میں شمیم کے متعلق بات چھڑ گئی، جیدی نے کہا۔

"امی، کسی کی باتوں میں نہ آنا، جو فیصلہ میں اور آپ کر چکے ہیں اس پر ہمیں کاربند رہنا ہے۔"

ماں اس کا اشارہ سمجھ کر مسکرائی اور بولی "تو اس طرف سے بے فکر رہ، صرف اپنی پڑھائی کی فکر کر۔"

"پھر بھی امی" جیدی نے ٹھٹکتے ہوئے کہا "میں آپ سے دور رہوں گا، کہیں آپ بھٹک نہ جائیں۔"

ماں نے مسکراتے ہوئے کہا "جن ماؤں کی تربیت تجھ جیسے بیٹے کرتے ہیں، وہ راستے سے کیسے بھٹک سکتی ہیں.......... لیکن بیٹا جی.........."

"لیکن کیا امی؟" جیدی نے چڑتے ہوئے کہا۔ اسے اس لیکن سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔

ماں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "بیٹا! میں پھر یہی کہوں گی کہ زندگی کسی بے حرکت شے کا نام نہیں۔ یہ ایک چلتی ہوئی گاڑی ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اگلے موڑ پر کیا ہو گا۔ زندگی کے فیصلے زندگی کے ساتھ ساتھ بدلتے ہیں۔ جوانی کا کوئی فیصلہ بچپن میں کیا جا سکتا ہے اور نہ بڑھاپے کا جوانی میں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں انہیں اکثر اپنے فیصلوں پر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ میں خدانخواستہ تمہیں اس سے دور کرنا نہیں چاہتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنے دل و دماغ کو کسی زنجیر میں نہ جکڑو۔ ایک نارمل انسان کی طرح جیو اور نارمل انسان کی طرح سوچو۔"

کم و بیش یہی بات مختلف انداز سے وہ سیکڑوں مرتبہ کہہ چکی تھیں۔ اس بات کا مطلب جیدی کو یہی باور کرانا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ کو بدلنا ہو گا۔ جس بات کو وہ آج مناسب سمجھ رہا ہے کل اس کے لئے نامناسب بھی ہو سکتی ہے۔

جیدی چپ ہو گیا۔ وہ ایسے موقع پر ہمیشہ چپ ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے ماتھے پر ابھرنے والی شکن خطرے کا سگنل ہوتی تھی اور یہ سگنل ماں کو فوراً رویہ بدلنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ ماں نے متبسم ہو کر اس کی پیشانی چومی اور بولیں۔

"چند روز تک میں گاؤں کا چکر لگاؤں گی، تیری چچی کو ابھی تیرے پاس ہونے کے لڈو بھی تو کھلانے ہیں۔"

اس بات نے جیدی کا غصہ کافور کر دیا ور وہ کچھ شرمایا شرمایا سا باہر نکل گیا۔

اگلے روز جیدی لاہور سے ملتان چلا گیا۔ نئے شہر میں نئے لوگ تھے۔ نئی

مصروفیات اور نئے شب و روز۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ پڑھائی پر مرکوز کر دی۔ اپنی ماں کی خواہش پوری کرنے کا بھوت اس کے سر پر سوار ہو چکا تھا۔ اور جب کوئی بھوت اس کے سر پر سوار ہو جاتا تو پھر اتارے نہیں اترتا تھا۔ ان دنوں شمیم کی یاد اسے یوں آتی تھی جیسے گھٹاٹوپ رات میں اچانک بجلی چمک جائے۔ چند لمحوں کے لئے اس کی خیرہ کن چمک سے ہر نشیب و فراز روشن ہو جائے اور دیکھنے والے کو یاد آجائے کہ آسمان پر گھنگور گھٹائیں پرے جمائے کھڑی ہیں.......... کالج میں دو امتحان پاس کرنے کے بعد وہ خود کو خاصا بااعتماد محسوس کرنے لگا۔ پڑھائی میں اس کی لگن اور بڑھ گئی۔ انہی دنوں سحرش سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ سحرش فرسٹ ایئر میں داخل ہوئی تھی جبکہ جیدی تھرڈ ایئر میں تھا۔ سحرش ایک چھریرے بدن کی نازک اندام لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے خوب صورت چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ بالکل آبگینوں جیسی شفاف آنکھیں، جن کے اندر بہت دور تک، تہ تک نظر آجاتا تھا۔ ان میں ہر وقت ایک ذہانت آمیز شوخی بھری رہتی تھی۔ سحرش بہت جلد کالج کے حلقوں میں مقبول ہو گئی۔ پھر جب سالانہ الیکشن کے دن آئے تو سحرش ہر اسٹوڈنٹ کے لئے جانی پہچانی شخصیت بن گئی۔ وہ یونین کے ایکٹنگ صدر کی سرگرم کنوینر بن کر ابھری۔ وہ تقریر کے فن میں طاق تھی اور یہ فن اس کے بہت کام آرہا تھا۔ جیدی مخالف پینل کی حمایت کر رہا تھا گاہے گاہے وہ دھواں دھار تقریر بھی کر جاتا تھا۔ جیدی کی طرح سحرش کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ کچھ ساتھیوں نے جیدی کو مشورہ دیا کہ وہ سحرش کو مخالف پارٹی سے توڑنے کی کوشش کرے۔ جیدی نے سب کے مجبور کرنے پر ایک دو کوششیں کیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی بلکہ جواب میں اسے توڑنے کی کوشش کی گئی۔

الیکشن سے کوئی دو ہفتے پہلے کی بات ہے، سکینڈ ایئر کے اسٹوڈنٹ پکنک کے لئے ایک سیرگاہ میں گئے۔ وہاں ان کے ساتھ ایک سنگین شرارت ہوئی۔ کسی نے ان کے کھانے میں کچھ ملا دیا۔ کالج ہاسٹل واپس پہنچتے پہنچتے کئی طلبا کی حالت غیر ہو گئی۔ زہر خوردنی کے آثار واضح تھے۔ پندرہ بیس طلباء و طالبات کی حالت زیادہ خراب تھی، انہیں اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ اپنے ایک بیمار دوست کی تیمارداری کے لئے جیدی کو بھی اسپتال میں رہنا پڑا۔ یہ ایک علیحدہ کمرا تھا، جہاں باتھ روم کے علاوہ اضافی بیڈ کی سہولت بھی حاصل تھی۔ اس راہداری میں دونوں طرف ایسے ہی کمرے تھے اور اس وقت بیشتر کمرے بیمار اسٹوڈنٹس کے زیر استعمال تھے۔ جیدی کے ساتھ والے کمرے میں ایک طالبہ

زیرِ علاج تھی جس کی تیمارداری باری باری دو لڑکیاں کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک سحرش تھی........... یہ دوسری رات کا واقعہ ہے' دوست کی ڈرپس وغیرہ چیک کرنے کے بعد جیدی ساتھ والے بستر پر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ رات کسی پہر اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے ساتھ سویا ہوا ہے۔ غنودگی کے عالم میں اس نے زیادہ نہیں سوچا اور یہی خیال کیا کہ شاید کوئی دوست آکر لیٹ گیا ہے (حالانکہ ایسا کوئی امکان نہیں تھا) کچھ دیر بعد کروٹ بدلنے پر اسے پھر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے ایک طرح کا گداز اور لوچ بھی محسوس کیا۔ وہ بدک کر اٹھ بیٹھا۔ باتھ روم میں زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ کمرے میں اس کی روشنی بس اتنی ہی تھی کہ چیزوں کے ہیولے نظر آجاتے تھے۔ جیدی نے جلدی سے کمرے کی روشنی جلائی۔ اپنے بستر کی طرف دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ اس کے ساتھ ایک قیامت موجود رہی تھی وہ حیرت سے گنگ دیکھتا چلا گیا۔ اس کے تراشیدہ ریشمی بال تکئے پر عین اس جگہ بکھرے ہوئے تھے جہاں تھوڑی دیر پہلے جیدی لیٹا تھا۔ سپید بازو پر چند سبز چوڑیاں بڑی حسین بے ترتیبی سے ٹکی ہوئی تھیں۔ کمبل کے نیچے وہ حسن مجسم دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ وہ سحرش تھی' ذرا سی دیر میں ساری بات جیدی کی سمجھ میں آگئی۔ ان کمروں کی بناوٹ بالکل ایک جیسی تھی۔ لوگ عموماً دھوکا کھا جاتے تھے۔ خود جیدی پرسوں پریشانی میں دو دفعہ ایک غلط کمرے میں گھس گیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ سحرش کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ وہ کسی کام سے باہر نکلی تھی اور غنودگی میں بھول کر غلط کمرے میں گھس آئی تھی۔ گھبراہٹ کے عالم میں جیدی کو اور تو کچھ نہیں سوجھا' اس نے اپنے دوست رفیق خاں کو جگا دیا۔ وہ بھی بیچارہ حیرانی سے اس خوابیدہ فتنے کو دیکھنے لگا۔ سرگوشیوں میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد جیدی سحرش کی طرف بڑھا اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے کو ہلا ہلا کر اسے جگا دیا۔ وہ چندھیائی آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھتی رہی پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسکی ہراساں نظریں جیدی پر لگی تھیں۔

"تم........... آپ........... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ ہکلائی۔

جیدی نے کہا "یہی سوال میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔"

اس نے گھبرا کر کمرے کا جائزہ لیا' پھر اس کی نگاہ رفیق خان پر پڑی۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ تڑپ کر بستر سے نیچے اتر آئی۔ اس کی حالت دیدنی تھی' ہونٹ لرز رہے تھے لیکن کوئی بات منہ سے نہیں نکلتی تھی "یہ کیا ہو گیا" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا "ویری سوری جاوید صاحب........... ویری ویری سوری' میں سمجھی۔"

"ہم سب سمجھ رہے ہیں مس" جیدی نے اس کی بات کاٹ کر کہا "آپ پریشان نہ ہوں' اٹ از کوائٹ کلیئر' جوتی پہن لیں۔"

سحرش کسی معمول کی طرح اپنے جوتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یہ ایک تسمے دار سینڈل تھا۔ پاؤں کانپ رہے تھے اس لئے وہ کوشش کے باوجود پہن نہ سکی اور سینڈل ہاتھوں میں اٹھا کر باہر لے گئی۔ جیدی اور رفیق خاں دونوں اس دلچسپ صورت حال پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ رفیق خاں نے جیدی کو بتایا کہ سحرش کے علاوہ ایک لڑکی رفعت بھی ساتھ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ غالباً وہ دونوں اکٹھی سوئی ہوئی تھیں جس کے سبب جیدی کے ساتھ لیٹنے کے باوجود سحرش کو غلطی کا احساس نہ ہوا۔

شروع رات میں آنکھ کھل گئی تھی اس لئے جیدی کو پھر گہری نیند نہیں آئی۔ علی الصباح کسی نے دروازے پر دستک دی۔ جیدی نے اٹھ کر دیکھا' دروازے پر سحرش تھی۔ اس نے لباس بدلا ہوا تھا۔ بال سلیقے سے بندھے تھے۔ وہ بالکل کمپوز تھی' چہرے پر رات والی بدحواسی کی جگہ متانت نظر آرہی تھی۔

"خیریت' اتنی صبح؟" جیدی نے پوچھا۔

اس نے جھکی نظروں سے جیدی کو دیکھا "ایک منٹ پلیز۔"

جیدی شب خوابی کے لباس میں ہی باہر راہداری میں آگیا۔

"جی فرمائیے؟"

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا "دیکھئے جاوید صاحب' جو کچھ ہوا غلط فہمی کے سبب ہوا' پلیز........... اب یہ بات باہر نہ نکلے ورنہ بہت مذاق بنے گا۔"

جیدی نے کہا "کیا میں آپ کو ایسا نظر آتا ہوں!"

"نہیں' آپ پر تو مجھے بھروسا ہے لیکن آپ کا دوست........... میرا مطلب ہے میں انہیں ٹھیک طرح نہیں جانتی۔"

پتا نہیں اس فقرے میں کیا بات تھی کہ سحرش کے ملیح چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ شاید اسے اپنی رات والی غلطی یاد آگئی تھی۔ وہ غلطی جو کم و بیش دو گھنٹے پر مشتمل تھی۔ وہ بکھرنے سی لگی' جیدی نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا "آپ بے فکر رہیں۔ یہ بات کسی تیسرے شخص کو معلوم نہیں ہوگی۔"

سحرش نے بہت مدہم مسکراہٹ کے ساتھ 'تھینک یو' کہا۔ یہ دو لفظ کہتے ہوئے اس کی نگاہیں بس ایک ساعت کے لئے جیدی کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ کوئی برقی لہر سا

کوند کر رہ گیا۔ وہ جلدی سے واپس چلی گئی۔

تیسرے چوتھے روز کی بات ہے' جیدی کو کچھ دوستوں کی زبانی پتا چلا کر سحرش نواز نے مخالف امیدوار کے حق میں کنویسنگ ترک کر دی ہے اور خود کو انتخابی مہم سے بھی الگ کر لیا ہے۔ سب واقف حال اس خبر پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ مخالف امیدوار کا ایسے اہم سپورٹر سے محروم ہو جانا نیک شگون تھا۔ تاہم اس نیک شگون کے پیدا ہونے کا سبب کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سحرش تو ان معاملات میں بہت انوالو تھی۔

اس شام ہاسٹل کے پارک میں جیدی کی ملاقات سحرش سے ہوئی۔ پتھریلے بنچوں اور گھاس پر اکا دکا اسٹوڈنٹ بیٹھے مطالعے میں مصروف تھے۔ سحرش بھی نیم کے ایک پیڑ تلے کتاب پر جھکی ہوئی تھی۔ جیدی اس کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ دونوں میں ہیلو ہیلو ہوئی۔ جیدی کو دیکھتے ہی سحرش کی آنکھوں میں عجیب سا رنگ ابھر آیا تھا۔

جیدی نے کہا "یہ میں کیا سن رہا ہوں سحرش بی بی۔ لوگ کہہ رہے ہیں' آپ عبداللہ شاہ کی انتخابی مہم سے الگ ہو گئی ہیں؟"

"ٹھیک ہی سنا ہے آپ نے" اس نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟"

"بس' موڈ کی بات ہوتی ہے۔ نہیں دل چاہ رہا تھا............ اور آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرائی۔

"خوش تو ہوں۔ لیکن حیران بھی ہوں۔"

"حیران تو میں بھی ہوں" اس نے کہا۔ انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ سب کچھ اپنے آپ ہی ہو گیا ہے۔

"تو پھر آجایئے ہماری طرف۔"

"نہیں بابا" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے "اتنی سنگین دشمنیاں میں مول نہیں لے سکتی۔ ابھی چار پانچ سال گزارنے ہیں مجھے اس کالج میں............ ہاں جب آپ الیکشن لڑیں گے تو ضرور سپورٹ کروں گی۔"

وہ کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کیمپس میں ایسی میٹنگز کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا جاتا تھا۔ نیم کے پیڑ تلے ہونے والی یہ ملاقات' ملاقاتوں کے ایک سلسلے کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ وہ اکثر و بیشتر ملنے لگے۔ کسی نے اس کا نام سحرش بہت سوچ سمجھ کر رکھا تھا۔ اس میں سحر زدہ کر دینے والی قوت تھی۔ وہ حواس پر سوار ہو کر دل میں میٹھی میٹھی کسک

پیدا کرتی تھی۔ پھر اپنی خوش گفتاری سے اس کسک کو پتھر کی لکیر کے مانند پائیدار کر دیتی تھی۔ اس سے ایک بار ملنے والا اسے آسانی سے بھول نہیں سکتا تھا۔ اپنی عمومی وابستگیوں سے قطع نظر وہ کالج کی پسندیدہ ترین شخصیت تھی............ اگر جیدی کے دل و دماغ پر کسی اور کا قبضہ نہ ہوتا تو وہ سحرش کی دوستی پر خوشی سے پھولا نہ سماتا............ اس رشک زمانہ کی رفاقت کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا............ لیکن صورت حال مختلف تھی۔ وہ سحرش کی پیش قدمی کا جواب پیش قدمی سے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ اور اس کی یہ لاتعلقی سحرش کی آمادگی کو اور بڑھا رہی تھی۔ اسکا شوق تیز ہو رہا تھا۔ وہ گاہے گاہے جیدی کو ٹیلیفون کرنے لگی۔ اس سے مل بیٹھنے کے مواقع ڈھونڈنے لگی۔ لیکن یہ سب کچھ بڑے باوقار اور شائستہ انداز میں ہو رہا تھا............ آخر جیدی دھیرے دھیرے ان حسین آنکھوں کے جال میں الجھنے لگا۔ اس نازک اندام کی ادائیں اس کے دل میں ایک نئے موسم کی داغ بیل ڈالنے لگیں۔ ایک روز وہ دونوں شاپنگ کے لیے بازار میں گھوم رہے تھے۔ سحرش کے چھوٹے بھائی کی سالگرہ تھی۔ وہ چند روز کے لئے لاہور جا رہی تھی۔ روانگی سے پہلے وہ تھوڑی سی شاپنگ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے جیدی سے درخواست کی کہ وہ اسے ساتھ لے جائے۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی۔ وہ ایک دکان سے دوسری دکان میں گھس رہے تھی۔ اسی دوڑ دھوپ کے دوران نہ جانے کس وقت سحرش کا ہاتھ جیدی کے ہاتھ میں آگیا۔ ان دونوں کو اس بات کا علم کچھ دیر بعد ہوا۔ اور جب ہوا وہ دونوں چونک پڑے۔ سحرش کا پسینہ میں نم ہاتھ جیدی کے توانا ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ اچانک ایک برقی رو ان دونوں کے جسموں میں پاس ہونے لگی۔ وہ دونوں ایک دم خاموش ہو گئے۔ جیسے وہ اس بھرے پرے بازار میں نہ ہوں' کسی تنہا نیم تاریک کمرے میں بیٹھے ہوں اور لمس کی زبان میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے ہوں' جیدی نے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے ذرا سا ڈھیلا چھوڑا تو سحرش کی انگلیوں کی گرفت میں معمولی سا اضافہ ہو گیا۔ اس گرفت کو محسوس کر کے جیدی کے جسم میں ہزاروں آتش فشاں پھٹ گئے۔ ہاتھوں کا رشتہ ٹوٹنے سے پہلے ہی پھر قائم ہو گیا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ وہ انسانوں کے ہجوم میں گھوم رہے تھے لیکن بالکل تنہا تھے۔ اب انہیں کچھ خریدنا بیچنا نہیں تھا۔ کیونکہ اس خریدوفروخت سے ہاتھوں کا رشتہ ٹوٹتا تھا۔ وہ صرف چل رہے تھے اور چلتے جا رہے تھے۔ ان کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ ہاتھ پسینے میں شرابور ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ سحرش نے اپنا ہاتھ جیدی کی گرفت میں بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ جیسے یہ

ہاتھ نہ ہو مکمل جسم ہو، جسے کسی کے سپرد کر دیا گیا ہو۔ کسی کی سرکشی کے حوالے کر دیا گیا
ہو۔ وہ خالی نظروں سے در و دیوار کو دیکھتے دور نکل آئے۔ بازار ختم ہونے لگا تو وہ دونوں
چونک گئے۔

"دکانیں تو پیچھے رہ گئیں" جیدی نے کہا۔

سحرش نے بڑی نرمی کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس کے عارض سرخ ہو رہے
تھی۔ ایک مختصر ترچھی نگاہ جیدی پر ڈال کر وہ واپس مڑ گئی۔ جیدی نے بھی اپنا رخ پھیر
لیا، دونوں ایک بار پھر پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔ ان کے چلنے کا انداز اب یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔

ان دونوں کی دوستی اچانک ہی محبت کے تعلق میں ڈھل گئی تھی۔ دیکھنے کا انداز،
باتیں کرنے کا انداز، ایک دوسرے کے انتظار کا ڈھنگ سب کچھ بدل گیا۔ ان کی راتیں
شاعرانہ، صبحیں حسین اور شامیں رنگین ہونے لگیں۔ جیدی کا دوست رفیق خاں ان کا
ہمراز تھا۔ کبھی کبھی اس کے گھر دونوں کو مل بیٹھنے کا موقع میسر آجاتا۔ تنہائی ملتی تو وہ کمرے
میں بیٹھے بیٹھے بہت دور نکل جاتے۔ ایک دوسرے کو تلاش کرتے کرتے ہانپ جاتے۔
جب وہ مسکراتے تو ان کی آنکھوں میں دنیا کا حسین ترین نشہ چھلکنے لگتا...... لیکن ایسا
نہیں تھا کہ سحرش کی اس حسین و جمیل رفاقت میں جیدی بچپن میں سنی ہوئی کہانیاں بھول
گیا تھا۔ یا سوتی قمیض کے پھول اور پھولوں کی پیچ و خم اس کی نظروں اوجھل ہو گئے
تھے۔ وہ مناظر تو ہر گھڑی اس کی آنکھوں کے سامنے رہتے تھے۔ وہ چہرہ اس کے تصور کا
حصہ بن چکا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ سحرش میں، شمیم کو ڈھونڈنے لگتا۔ سحرش کے
ہونٹوں، رخساروں اور آنکھوں کے لمس پر کسی اور کے لمس کو منطبق کرنے لگتا۔ ایسے
میں اس کی کشادہ پیشانی سے پسینے کی دھاریں پھوٹنے لگتیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا۔
اسے محسوس ہوتا، اس کا جسم بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو رہا ہے۔ ایسی کیفیت میں اسے کچھ
اچھا نہ لگتا، وہ اپنی ہر مصروفیت ترک کر کے تنہائی ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوتا۔

وہ اس کی زندگی کا بڑا عجیب دور تھا۔ سحرش اپنی تمام تر ظاہری و باطنی خوبیوں کے
ساتھ اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہی تھی۔ دوسری جانب شمیم تھی جس کے خواب
بچپن سے اس کی نیندوں کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ اپنے بچپن اور جوانی کے درمیان بھاگ
رہا تھا۔ کبھی ایک طرف جاتا تھا کبھی دوسری طرف۔ جان لیوا کشمکش کے پتھریلے راستے پر
اس کے پاؤں خون اگل رہے تھے۔ سحرش اور اس کے میل جول کی بھنک دور دور تک
پہنچ گئی تھی۔ اس کی امی اور دیگر عزیزوں کو بھی اس معاملے کی ہوا لگ چکی تھی......

جوں جوں یہ خبر پھیل رہی تھی، ایک پشیمانی سی جیدی کے دل میں گھر کرتی جا رہی تھی۔ وہ
کوشش کے باوجود کئی ماہ تک لاہور نہیں جا سکا۔ ہاں...... اس نے ماں کو خط ضرور لکھے
جس میں اسے بتایا کہ وہ لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ ان باتوں میں حقیقت نہ ہونے
کے برابر ہے۔ ماں نے بھی اسے دو تین خط لکھے۔ ان خطوط سے جیدی کو پتا چلا کہ شمیم
نے ایف اے کے بعد ٹیچنگ کا کورس کر لیا ہے اور گوجرانوالہ آگئی ہے۔ یہاں وہ بچوں
کے ایک اسکول میں پڑھا رہی ہے۔

☆------------☆------------☆

سحرش بہت دن سے اصرار کر رہی تھی کہ وہ اسے لاہور لے جائے اور اپنے گھر
والوں سے ملائے۔ جیدی اسے مسلسل ٹال رہا تھا۔ جب ایک روز ذہنی کشمکش انتہا کو پہنچ
گئی تو اس نے چند روز کے لئے لاہور جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سحرش سے کہا کہ وہ
اسے لاہور لے جانے سے پہلے خود ایک دفعہ امی سے ملنا چاہتا ہے۔ سحرش سے رخصت ہو
کر وہ ریل گاڑی میں آبیٹھا اور لاہور روانہ ہو گیا۔ ریل گاڑی میں ہمیشہ اس کے دل کی
حالت عجیب ہو جاتی تھی۔ بھولی بسری باتیں اور مناظر یاد آنے لگتے تھے۔ جوں جوں گاڑی
ملتان سے دور اور لاہور سے نزدیک ہوتی گئی، جیدی جیسے کسی خواب سے بیدار ہوتا گیا۔
اسے لگا جیسے سحرش ایک دھندلا خواب تھی جبکہ شمیم ایک حقیقت ہے۔ وہ سوچ رہا تھا، یہ
اس کے سینے میں کیسی اتھل پتھل ہو رہی ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہ کیوں اس
نادان بچے کی طرح سوچ رہا ہے جو دو پسندیدہ کھلونوں کے درمیان بیٹھا ہوا ہو اور سمجھ نہ
پائے کدھر جاتا ہے...... وہ اپنے خیالوں میں گم رہا۔ گاڑی چلتی رہی۔ آخر اسے لاہور
کے در و دیوار اور سبزہ زار نظر آنے لگے۔ وہ لاہور پہنچ گیا۔ لاہور پہنچ کر بھی اس کا دل گھر
جانے کو نہیں چاہا۔ وہ پورے چوبیس گھنٹے لاہور کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ اسکے پارکوں
میں بیٹھا رہا اور ریستورانوں کے گرد منڈلاتا رہا۔ یہی وہ بام دور تھے، یہی وہ گلیاں تھیں
جن میں اس کا بچپن جوان ہوا تھا، اور بچپن کے ساتھ ساتھ اس کو کہانیاں سنانے والی کی
محبت جوان ہوئی تھی۔ جیدی کے دل میں مہینوں سے جاری کشمکش ایک دم ایک نئے موڑ
پر آگئی۔ اسے لگا کہ وہ کسی نامعلوم سحر سے آزاد ہو کر حواس کی دنیا میں آگیا ہے۔ سحرش کا
ہیولا دھندلانے لگا اور شمیم کی قمیض کے پھول اجاگر ہوتے چلے گئے۔ اس کے بدن کی
ناقابل فراموش مہک جیدی کے دل و دماغ پر چھانے لگی "نہیں...... نہیں۔ میں اس
خوشبو سے دستبردار نہیں ہو سکتا" اس کے ذہن نے چلا کر کہا "میں اسے حاصل کروں گا"

کر کے رہوں گا۔" وہ لارنس گارڈن کی ایک روش پر ٹہلتے ٹہلتے بے قراری سے مٹھیاں بھینچنے لگا۔ اسے اس دھندلے خواب پر افسوس ہونے لگا جو وہ پچھلے ایک برس سے دیکھ رہا تھا۔ شیم کا حسن سادہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس نے تصور ہی تصور میں اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اپنی صدیوں کی پیاس اس کے چشمہ لبوں کے مقابل رکھ دی۔ اپنی بے قراریوں سے اسے ششدر کر دیا اور اپنی محبت کی فراوانی میں اسے بہالے گیا۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ گارڈن سے سیدھا ایک گرم حمام پر پہنچا۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے اور اٹیچی سنبھال کر گھر کا رخ کیا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو ماں گیٹ پر ہی مل گئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا اور وہ ایک نوکر سے باتیں کر رہی تھیں۔ جیدی کو دیکھ کر وہ چونک گئیں۔ انکی آنکھوں میں ممتا کی چمک نمودار ہوئی۔ لپک کر انہوں نے جیدی کو گلے سے لگا لیا اور بلائیں لیں۔ ذرا سی دیر میں جیدی نے محسوس کر لیا کہ ماں کچھ پریشان ہیں۔ اس نے سبب پوچھا تو یہ پریشانی مزید گھمبیر ہو گئی۔ ماں اسے اپنے ساتھ نشست گاہ میں لے آئیں۔ کہنے لگیں "جیدی! تو بڑے وقت پر آیا ہے۔ یہ دیکھ، یہ لفافہ میں تجھے ہی پوسٹ کر رہی تھی۔"

"کوئی مسئلہ ہے؟" جیدی نے تشویش سے پوچھا۔

ماں خاموشی سے لفافے کی طرف دیکھنے لگیں، پھر بولیں "بہتر ہے تو یہ خط ہی پڑھ لے، میں اتنی دیر میں تیرے لئے چائے بنا لاتی ہوں۔"

ماں کچن کی طرف چلی گئی تو جیدی نے بے قراری سے لفافہ چاک کیا۔ ماں کے ہاتھ کی تحریر جیدی کے سامنے تھی۔

"جیدی بیٹے! ماں کی حیثیت سے میں نے تجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ میری ذاتی رائے کچھ بھی ہو، میں خود کو اس وعدے کا پابند سمجھتی ہوں۔ تیری خوشی کا خیال رکھنا، میری سب سے بڑی ذمے داری ہے۔ لیکن ادھر حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں جنہیں تو ہی سلجھا سکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا، دو ڈھائی ماہ پہلے شیم نے گوجرانوالہ کے ایک اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ وہ اب اپنی ماں شریفاں کے ساتھ گوجرانوالہ ہی میں رہ رہی ہے.......... کچھ روز پہلے مجھے معلوم ہوا کہ اس اسکول کا مالک پٹواری احمد رضا ہے۔ یہ وہی ہمارے گاؤں والا احمد رضا ہے جس کے رشتے کی بات دو تین سال پہلے شیم کی طرف چلی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان دنوں احمد رضا شریفاں کے گھر اکثر آتا جاتا ہے۔ اسنے اپنے دو بچوں کو ٹیوشن کے لئے شیم کے سپرد کر رکھا ہے اور یہ

بچے شیم کے پاس ہی رہتے ہیں۔ مجھے یہ سارا معاملہ کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ چند روز پہلے میں شیم سے ملنے گوجرانوالہ گئی تھی۔ میں سارا دن انتظار کرتی رہی۔ وہ سہ پہر کو تھوڑی دیر کے لئے گھر آئی اور پھر چلی گئی۔ کہتی تھی اسکول میں مصروف ہوں۔ بہن شریفاں کا رویہ بھی کچھ بدلا بدلا سا تھا.......... میں نے تمہیں ساری صورت حال بتا دی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس معاملے کی وجہ سے ہم ماں بیٹے میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔ بہتر ہے کہ تم خود آکر حالات دیکھ لو.......... تمہاری ماں۔"

خط جیدی کے ہاتھوں میں لرزنے لگا۔ وہ جلدی سے کچن میں پہنچا۔ ماں نے اپنی ساری توجہ چائے پر مرکوز کر رکھی تھی۔ جیدی نے کہا! ".......... یہ سچ ہے؟"

ماں نے جواب دیا "جو مجھے معلوم تھا وہ تمہیں بتا دیا ہے" ان کی آواز میں خلوص اور غمگساری کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"یہ.......... یہ کیسے ہو سکتا ہے ماں۔ وہ رنڈوا پٹواری.......... اس کی صورت دیکھی ہے آپ نے.......... اور وہ کئی سال بڑا ہے۔ وہ.......... وہ کیسے سوچ سکتی ہے اس کے بارے میں، یقیناً کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے ہمیں۔"

ماں نے غمناک نظروں سے بیٹے کی آنکھوں میں جھانکا اور بولیں۔ "بیٹے، کچھ بھی سوچنے یا کرنے سے پہلے یہ دھیان میں رکھنا کہ تو اپنی ماں کا آخری سہارا ہے۔ اس معاملے کو خوب اچھی طرح دیکھ اور پرکھ لے اور جو فیصلہ کر، ٹھنڈے دل سے کر۔ ماں کی حیثیت سے میرا حق ہے لیکن میں نے تجھ پر کوئی روک ٹوک نہیں لگائی اور نہ کبھی لگاؤں گی۔"

جیدی نے لرزاں لہجے میں کہا "کہیں ایسا تو نہیں امی.......... کہ وہ.......... کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہو۔ ہم سے.......... پیچھا چھڑانے کے لئے۔ کہیں اسے سحرش والی بات کا.......... میرا مطلب ہے.........."

"میں تیرا مطلب سمجھ رہی ہوں" ماں نے اس کی بات کاٹی "یہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہتر ہے کہ تو ایک بار چچی شریفاں کے ہاں سے ہو آ۔"

جیدی کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں تھیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "امی! ایک اور بات بھی ہو سکتی ہے۔ ابا میاں کے بعد ہماری مالی حالت پہلے جیسی نہیں رہی، ہو سکتا ہے کہ.......... میرا مطلب ہے کیا یہ احمد رضا خاصا امیر ہے؟"

جیدی کی ماں بیٹے کا مافی الضمیر سمجھ کر بولیں "میں تیری اس بات سے اتفاق نہیں

کر سکتی۔ احمد رضا ایسا امیر ہے اور نہ ہم کوئی ایسے تنگ دست ہیں۔ معاملہ وہ نہیں ہے جو
تو سوچ رہا ہے۔"

☆--------------☆--------------☆

اگلے روز جیدی دوپہر کے وقت گوجرانوالہ پہنچا اور پیدل ہی ماں کے بتائے ہوئے
پتے پر روانہ ہو گیا۔ اس کے قدم زمین پر پڑ رہے تھے اور ذہن سوچوں کے تانے بانے
میں الجھا ہوا تھا۔ کوئی غیر مرئی آواز اس کے اندر سے چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھی۔ شیم نے
ایسا کیوں کیا؟ وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔ کیا یہ سب سحرش کی وجہ سے ہوا ہے؟ اگر یہ اس
کی وجہ سے ہوا ہے تو وہ اسے بتا دے گا کہ سحرش لمحوں کی بھول کا نام ہے جبکہ شیم
زندگی کی انمٹ حقیقت ہے.......... کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ایک دو منزلہ مکان کے سامنے
رکا۔ دروازے پر کال بیل موجود تھی۔ اس نے بڑے اعتماد سے بٹن پر انگلی رکھی۔ آج
اس ہچکچاہٹ کا دور دور پتا نہیں تھا جو شمیم کی دہلیز پر پہنچتے ہی اسے گھیر لیتی تھی۔ دروازہ
کھلا اور چچی شریفاں کی صورت نظر آئی۔ بیماری کی وجہ سے ان کا چہرہ زرد رہتا تھا۔ لیکن
جیدی کو دیکھ کر وہ کچھ زیادہ ہی زرد ہو گیا۔ جیدی نے سلام کیا۔ گھبراہٹ میں جواب دے
کر انہوں نے اس کے سر پر پیار دیا اور اندر لے آئیں۔ شمیم ابھی گھر نہیں پہنچی تھی۔
جیدی کے لئے شربت بناتے ہوئے چچی شریفاں نے باورچی خانے کے اندر سے ہی بتایا کہ
شمیم چونکہ بڑی استانی (ہیڈ مسٹریس) لگ گئی ہے اس لئے کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ کئی دفعہ
اسے گھر آتے آتے چار بج جاتے ہیں۔ جیدی کا خون اس کی رگوں میں کھول کر رہ گیا۔
اس کا دل چاہا کہ وہ چچی پر چیخ پڑے اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھے کہ مجھ سے کیا چھپایا جا رہا
ہے' کیوں چھپایا جا رہا ہے؟ لیکن اس کی فطری کم گوئی آڑے آئی۔ وہ اس معاملے پر اپنی
ماں کے علاوہ اور کسی سے کھل کر بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔

چچی نے دوپہر کا کھانا کھلانا چاہا۔ شمیم کے انتظار کا وقت کاٹنے کے لئے اس نے
آمادگی ظاہر کر دی۔ بھوک کا تو کوسوں نشان نہیں تھا۔ کمرے میں بیٹھا وہ یونہی لقمے منہ
میں رولتا رہا۔ کھانا ختم ہو گیا تو اس نے ایک رسالہ اٹھا لیا۔ رسالہ بھی ختم ہو گیا لیکن شمیم
نہیں آئی۔ کمرے کی ایک جالی دار کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ جیدی کی نگاہیں مسلسل اس
کھڑکی پر لگی ہوئی تھیں۔ آخر سورج اپنا بیشتر سفر طے کر کے مغرب میں جھک گیا۔ سائے
طویل ہو گئے۔ شام کوئی پانچ بجے ایک ٹیکسی کھڑکی سے چند گز کے فاصلے پر رکی۔ جیدی
نے کھڑکی سے جھانکا اور اس کی نظریں جل اٹھیں۔ ٹیکسی کی اگلی نشست پر وہی سانولے

چہرے والا پٹواری بیٹھا تھا۔ اس کے سفید بالوں اور مونچھوں کا کلف جیدی اتنی دور سے
بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ پچھلی نشست پر شمیم بیٹھی
تھی۔ اس نے بوسکی کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے ساتھ چار اور پانچ سال کی عمر کے
دو بچے تھے۔ پھر دروازہ کھلا اور شمیم بچوں کو لے کر نیچے اتر آئی۔ اس نے ہلکے گلابی
رنگ کے پھولدار کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں کوئی رجسٹر نما چیز تھی۔
دوسرے ہاتھ کی انگلی ایک چھوٹے بچے نے تھام رکھی تھی۔ پٹواری احمد رضا نے گاڑی
میں بیٹھے بیٹھے شمیم سے کوئی بات کی۔ شمیم کے چہرے پر مسکراہٹ کی دھوپ پھیل گئی۔
احمد رضا بھی اپنی ٹیڑھے دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔ شمیم نے جھک کر دونوں بچوں سے
کچھ کہا' ان دونوں نے خدا حافظ ابا جی' کی آواز لگائی اور ہاتھ ہلانے لگے۔ احمد رضا نے
بھی اپنا موٹا بھدا ہاتھ لہرایا۔ ٹیکسی کار آگے بڑھ گئی۔ شمیم نے جھک کر بڑی محبت سے
چھوٹے بچے کا منہ چوما' سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اپنی لمبی چوٹی کو واپس کمر پر پھینکا اور
گھٹنوں کو خم دے کر چھوٹے بچے کو بازوؤں میں اٹھا لیا۔ جیدی کا دل سینے میں تڑخنے لگا۔
حسد اور رقابت کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی اور وہ بے حال ہو گیا۔ شمیم دونوں
بچوں کو لے کر گھر کی طرف آئی۔ اس کی چال میں عجب سا لوچ اور ردھم تھا۔ وہ تینوں
گھر میں داخل ہو گئے تو جیدی نے اپنا سر تکئے پر ڈالا اور بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔
اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر کیا کرے۔ تھوڑی ہی دیر بعد زنانہ جوتے
کی ٹھک ٹھک دروازے سے باہر سنائی دی۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر شمیم کی شیریں آواز
آئی۔

"جیدو.......... سو رہے ہو؟"

وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ بڑی بے باکی سے
اس نے شمیم کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے گڑبڑا کر پلکیں جھکا لیں "کیا بات ہے جیدو'
تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"یہ بچے کون ہیں؟" اس نے شمیم کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ.......... وہ خالہ جان نے تمہیں بتایا نہیں؟"

"نہیں۔"

شمیم کے چہرے پر گھبراہٹ کی جگہ ایک طرح کے سکون نے لے لی' وہ عام سے
لہجے میں بولی "یہ رضا صاحب کے بچے ہیں' ٹیوشن کے لئے میرے ہی پاس رہتے ہیں۔"

"کون رضا صاحب؟"

"جن کے اسکول میں پڑھا رہی ہوں۔"

"جن سے...... جن سے تمہاری رشتے کی بات چلی تھی؟"

شمیم کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں کھنچ گئے۔ اس نے سر پر آنچل درست کیا اور بات بدل کر بولی "میں...... تمہارے لئے چائے لاؤں؟"

"میرے سوال کا جواب دو۔"

احمد رضا کا بڑا بچہ شمیم کا آنچل کھینچنے لگا "چلو آنٹی جان...... چلو نا، بڑی بھوک لگی ہے۔"

"میری بات کا جواب دو" جیدی نے تیز لہجے میں کہا۔ بچہ بدستور آنچل کھینچ رہا تھا۔ شمیم خاموش کھڑی تھی "جواب دو میری بات کا" جیدی نے پھر کہا۔

"ہائے جیدو، یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو" شمیم کے چہرے پر شرم کی سرخی تھی۔

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے" جیدی پھنکارا۔ شمیم نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شک کر رہی ہو۔

جیدی نے ایک طویل اور گہری سانس لی۔ پھر نسبتاً نرم لہجے میں بولا "دیکھو شمیم! مجھے صاف صاف بتاؤ۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ کیا وہ کالج والی بات...... میرا مطلب ہے......"

بچپن والا گولا پھر اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اس آہنی گولے کو نگلا اور بولا "کیا وہ...... سحرش والی بات ہے؟"

شمیم دھیرے سے مسکرائی "توبہ ہے، کتنے بے شرم ہو گئے ہو، بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرتے...... ویسے مجھے پتا ہے سب کچھ...... ساری کارگزاری معلوم ہے تمہاری...... لگتا ہے تمہیں بڑی جلدی ہے 'لڈو وغیرہ کھلانے کی۔"

شمیم کا عام سا انداز اور اس کا ناصحانہ لہجہ جیدی کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔ اسے لگا جیسے وہ بارود کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں ایک چنگاری آگری ہے۔ کوئی لمحہ جاتا ہے کہ وہ خوفناک دھماکوں سے پھٹ پڑے گا۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ خود کو نارمل رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہوئے اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، لیکن اس سے پیشتر ہی احمد رضا کا بڑا بچہ شمیم کو زور زور سے کھینچنے لگا "چلو آنٹی...... چلو نا۔"

یکایک شمیم نے اپنی تمام تر توجہ بچے پر مرکوز کر دی۔ جھک کر اس کا سر چوما اور

بولی "چلو بھئی چلو...... بڑے بے صبرے ہو تم" وہ بچے کو لے کر باہر نکل گئی۔ جیدی کے لئے یہ بڑے انکشاف انگیز لمحے تھے۔ ان لمحوں میں جیدی کو محسوس ہوا کہ وہ ہوش سنبھالنے سے اب تک ایک سراب کے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ اس نے ایک ایسے ہیولے کی پرستش کی ہے جو صرف اس کے ذہن کی تخلیق تھا......

☆------------☆------------☆

اس کے بعد جیدی کے وہاں رہنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ اس نے وہ چار دیواری چھوڑنے سے پہلے خودکشی نہیں کر لی تھی یا شمیم کا گلا نہیں دبا دیا تھا۔ شمیم اور بچے کے باہر نکلتے ہی وہ اسپرنگ کے مانند اچھل کر بستر سے اترا، جوتے میں پاؤں گھسیڑے، کمرے سے نکل کر اپنے پیچھے دروازہ ایک دھماکے سے بند کیا اور دندناتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ شہر کی گلیوں کو اپنے پاؤں سے کوٹتا ہوا بس اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا۔ جوں جوں چچی شریفاں کے گھر سے اس کا فاصلہ بڑھ رہا تھا، اس کے آنکھوں کے سامنے کچھ اور طرح کے مناظر طلوع ہو رہے تھے۔ ملتان کے باغ، ریستوران اور بازار اس کی نگاہوں میں پھر رہے تھے اور تصور میں کسی عرق آلود نازک ہاتھ کا لمس اجاگر ہوتا جا رہا تھا...... وہ سحرش کی طرف لوٹ رہا تھا۔

اور یہی وہ وقت تھا جب شمیم اپنے گھر کے ایک نیم تاریک بند کمرے میں بستر پر اوندھی پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بپھرے ہوئے سمندروں کی طغیانی تھی۔ اس کے سینے سے دلدوز ہچکیاں بلند ہو رہی تھیں اور پورا جسم زلزلوں کی زد میں تھا۔ وہ رو رہی تھی اور ٹوٹ کر رو رہی تھی۔ نہ جانے وہ کب تک اسی طرح پڑی رہی...... آخر کمرے کی نیم تیرگی، گہری تاریکی میں بدل گئی۔ وہ سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بستر سے اٹھی۔ لائٹ جلائی اور اپنے پرس میں...... کوئی چیز ڈھونڈنے لگی۔ یہ ایک چھوٹی سی چابی تھی۔ چابی لے کر وہ کونے میں رکھی چوبی الماری کی طرف بڑھی۔ الماری کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا دراز تھا۔ شمیم نے چابی سے وہ دراز کھولا، چند کتابیں اٹھائیں اور ان کے نیچے سے ایک پاکٹ سائز فوٹو البم نکال لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے البم کھولا۔ اس البم میں صرف جیدی کی تصویریں تھیں۔ چند تصویریں جو بلیک اینڈ وائٹ تھیں، اس کے بچپن کی تھیں۔ اس کے بعد رنگین تصویریں تھیں، یہ اس کے لڑکپن اور جوانی کی تھیں۔ البم کی آخری تصویر صرف چند ماہ پہلے کی تھی۔ شمیم چند لمحے غور سے ان

تصویروں کو دیکھتی رہی پھر ایک ایک کر کے اس نے سب تصویروں کے پرزے کر دیے.......... صرف پہلی تصویر رہنے دی۔ یہ ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ اس میں چار پانچ سالہ جیدی ہاتھ میں گیسی غبارے لئے کھڑا تھا۔

ایثار پیشہ

محبت نام ہی ایثار اور قربانی کا ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی ایثار پیشہ لڑکی تھی۔
اس نے اپنے محبوب کے بدخواہوں سے بدلہ لینے کے لئے خود کو دیوانہ وار ایک ایسی
آگ میں جھونک دیا جس میں اس کا تن من جھلس گیا۔ وہ ہوس کے اشکنجے میں یوں
جکڑی گئی کہ اس کی شخصیت تک بدل کر رہ گئی لیکن اس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں
جلتا ہوا پیار کا دیا بجھنے نہیں دیا۔

ڈاکٹر فاروق اور بانو کا معاشقہ پورے گاؤں میں مشہور تھا۔ میں ان دنوں ایف

اے پاس کرنے کے بعد فارغ پھر رہا تھا۔ فرصت کے زمانے میں انسان کے پاس سوچنے سمجھنے کو بہت کچھ ہوتا ہے لہٰذا میرا ذہن بھی سوچوں کا اکھاڑا بنا رہتا۔ ان میں سب سے نمایاں سوچ ڈاکٹر فاروق اور بانو کی تھی۔ گاؤں کے بیشتر نوجوانوں کی طرح میں بھی سوچا کرتا تھا کہ اس عجیب و غریب معاشقے کا انجام کیا ہو گا۔

جہاں تک آغاز کا تعلق ہے' اس عشقیہ سلسلے کی شروعات اسی روز ہو گئی تھیں جس روز ڈاکٹر فاروق نے ہمارے گاؤں میں قدم رکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ بہار کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ میں ناشتا کر کے گھر سے نکلا ہی تھا کہ پٹواری کے لڑکے' روشن سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ گاؤں میں ایک نیا ڈاکٹر آیا ہے۔ نمبردار کی حویلی کے پچھواڑے اس نے اپنا دواخانہ کھولا ہے۔ میں نے کہا۔ "چلو آؤ' اس سے مل کر آتے ہیں۔"

ہم نئے ڈاکٹر کے دواخانے پہنچے تو وہ ابھی اس گاؤں میں اپنے پہلے مریض کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک خوش شکل نوجوان اور صورت سے ہی بااخلاق اور ملنسار نظر آتا تھا۔ اس نے ہمیں تپاک سے خوش آمدید کہا اور تعارفی باتوں میں مصروف ہو گیا۔ وہ لاہور کا رہنے والا تھا اور اس نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اپنی پیشہ ورانہ جدوجہد کے آغاز کے لیے اس پسماندہ گاؤں کو منتخب کیا تھا۔

ڈاکٹر سے رسمی ملاقات کے بعد میں اور روشن واپس چل دیے مگر ابھی ہم کلینک سے سو گز دور' گلی کے موڑ تک ہی پہنچ پائے تھے کہ شور و غل کی آواز سن کر ٹھٹک گئے۔

مڑ کر دیکھا تو عجیب منظر نظر آیا۔ ڈاکٹر فاروق ایک بھینس سے گتھم گتھا تھا۔ وہ ایک باؤلی بھینس تھی اور ڈاکٹر کو بار بار اپنے سینگوں پر اچھال رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی ڈاکٹر کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالے گی۔ پھر اچانک سامنے والے گھر سے ایک لڑکی برآمد ہوئی اور لاٹھی سونت کر بھینس پر پل پڑی۔ لڑکی نے بھینس کے منہ پر اتنے تابڑ توڑ حملے کیے کہ اس نے بوکھلا کر ڈاکٹر کو چھوڑ دیا اور لڑکی کی طرف رخ کر کے ڈکرانے لگی۔ اس دوران ہم نے بھی صورت حال کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا لہٰذا پوری رفتار سے کلینک کی طرف بھاگ پڑے مگر ہمارے پہنچنے سے پہلے ایک جانب سے بھینس کا مالک برآمد ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ بپھری ہوئی بھینس لاٹھی بردار لڑکی کی پسلیاں چکنا چور کر دیتی' اس نے کمال حکمت سے بھینس پر قابو پا لیا۔ جب بھینس کے اشتعال میں نمایاں کمی نظر آئی تو ادھر ادھر کونوں میں دبکے ہوئے لوگ بھی نکل آئے اور وہاں جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر فاروق زخمی حالت میں زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ لڑکی جس کا نام بانو تھا' زیادہ زخمی تو نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے ایک پاؤں کی انگلیاں بھینس کے سم تلے آ کر کچلی گئی تھیں۔ اب وہ دیوار سے ٹیک لگائے ہائے ہائے کر رہی تھی۔ ہم ڈاکٹر کو سنبھال کر کلینک میں لائے زخم شدید ضرور تھے مگر سنگین نہیں تھے کچھ زخموں کو ٹانکوں کی ضرورت تھی لہٰذا نمبردار کا بڑا لڑکا ریاست' ڈاکٹر کو اپنی جیپ میں ڈال کر شہر روانہ ہو گیا جبکہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بانو کی مرہم پٹی کی اور اسے احتیاط سے گھر پہنچایا۔ اس کا گھر کلینک کے قریب ہی تھا۔ صورت حال سنگین ہونے کے باوجود کسی حد تک مضحکہ خیز تھی لیکن یہ مضحکہ خیزی ایسی تھی کہ مسکراہٹ کے بجائے رونا آ رہا تھا۔ ایک ہمدرد شخص جو گاؤں والوں کے لیے درد کا مداوا بن کر آیا تھا' اپنی آمد کے پہلے ہی روز خود سراپا درد بن کر شہر واپس لوٹ گیا تھا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' یہ حادثہ ایک گہری سازش کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر فاروق کی آمد سے پہلے گاؤں میں ایک ناتجربہ کار عطائی کام کر رہا تھا اور اس عطائی کو نمبردار کے چھوٹے لڑکے کی حمایت حاصل تھی۔ اپنی حمایت کے بل بوتے پر وہ نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں میں کوئی دوسرا معالج پہنچے جو اس کی اجارہ داری کو ختم کرنے کا سبب ہو۔ اس عطائی کا نام تو یوسف تھا مگر سب اسے ڈاکٹر طوطی کے نام سے پکارتے تھے۔ ڈاکٹر طوطی لمبی ناک اور مدقوق جسم والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ لاہور کے طبیہ کالج سے اس نے حکمت کا کورس کر رکھا تھا۔ وہ اس بات کا بھی دعویدار تھا کہ اس نے ہومیوپیتھک کا کورس کر رکھا ہے۔ اور

ایلو پیتھی تو اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ اپنی ایلو پیتھی کے ہنر کو وہ اتنی بے دریغی سے استعمال کرتا تھا کہ اس کے موجدوں کی روحیں قبروں میں تڑپ جاتی ہوں گی۔ الغرض تمام طریقہ ہائے علاج کو باہم ملا کر اس نے مکسو پیتھی کے نام سے گاؤں والوں کو الو بنا رکھا تھا اور اچھا خاصا مال بنا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اسے ڈاکٹر فاروق کی آمد کا پتا چلا تو اس نے چپکے چپکے یہ کوشش شروع کر دی کہ ڈاکٹر کا یہاں آنا ٹل جائے یا کھٹائی میں پڑ جائے مگر یہ دونوں باتیں نہ ہوئیں اور نمبردار کا بڑا لڑکا ریاست، اس ڈاکٹر کو گاؤں میں لے آیا۔ ڈاکٹر طوطی اور اس کے ہمنواؤں نے ڈاکٹر فاروق کو مزہ چکھانے کے لیے یہ سازش کی کہ پہلے ہی روز ایک خطرناک بھینس اس کے کلینک میں داخل کر دی۔

یہ بھینس، شریف گوجر نامی ایک شخص کی تھی اور وہ بھی ڈاکٹر طوطی سے ملا ہوا تھا۔ اس نے بھینس کو عین کلینک کے سامنے لا کر چھوڑ دیا اور خود دائیں بائیں ہو گیا۔ بھینس نے کلینک میں گھس کر نہ صرف تہلکہ مچا دیا بلکہ ڈاکٹر فاروق کو بھی سینگوں پر اٹھا کر باہر لا پھینکا۔ اتفاقاً بانو جو گھر کی چھت پر کھڑی، یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی کمال جرات سے نیچے آئی اور لاٹھی لے کر ڈاکٹر کی مدد کو پہنچ گئی۔

ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد ڈاکٹر فاروق صحت یاب ہو کر پھر گاؤں آگیا۔ شروع میں تو اسے خاصی دشواری پیش آئی مگر پھر دھیرے دھیرے اس کا کام چل نکلا۔ نہ صرف گاؤں بلکہ قرب و جوار سے بھی مریض اس کے پاس آنے لگے۔ آدمی مخلص اور محنتی ہو تو کہاں اپنا مقام نہیں بنا سکتا اور دیہات میں تو ویسے بھی کوالیفائیڈ ڈاکٹر کی شدید کمی محسوس کی جاتی ہے۔ انہی دنوں میرے کانوں میں یہ اڑتی اڑتی ہوئی بات پہنچی کہ چاچے نتو کی لڑکی بانو، ڈاکٹر فاروق کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ بتانے والے نے بتلایا کہ وہ ہر وقت اپنے گھر کی چھت پر کھڑی ڈاکٹر سے آنکھ لڑایا کرتی ہے۔

یہاں میں آپ کو بانو کے بارے میں مختصراً بتا دوں۔ وہ انیس بیس برس کی خوبصورت لڑکی تھی۔ اگر وہ اپنے حلیے سے اتنی بے پرواہ نہ رہتی تو کہیں زیادہ دلکش نظر آتی۔ پھر بھی الجھے بالوں، میلے لباس اور گندے ہاتھ پاؤں کے باوجود وہ دل موہ لینے والی ادائیں رکھتی تھی۔ ہنسی مذاق، دھول دھپا اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ لڑکوں والے کھیل کھیلتے ہوئے جوان ہوئی تھی اور اب بھی اس کی چال ڈھال میں مردوں کی سی بے باکی پائی جاتی تھی۔ کوئی ڈیڑھ دو برس پہلے ایک روز اس کے باپ نے اسے

بری طرح مارا نہ ہوتا تو وہ اب بھی گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہی ہوتی یا اپنی سڈول کلائی کسی جھرو کے ہاتھ میں دے کر اس کو سمجھا رہی ہوتی کہ کلائی چھڑانے کے لیے کیسے زور لگانا چاہیے اور کلائی پکڑتے وقت کیا چالاکی دکھانی چاہیے۔ میرے اندازے کے مطابق بانو کا قد ساڑھے پانچ فٹ سے کم نہیں تھا۔ جسم متناسب ہونے کے باوجود مضبوط تھا۔ باپ زمینداری کرتا تھا اور گھر میں خوشحالی تھی جس کا ایک ثبوت اس کے سرخ انار جیسے گال تھے۔ غصے کے عالم میں یہ گال اور بھی سرخ ہو جاتے۔ یوں لگتا جیسے ابھی ان میں سے خون ٹپک پڑے گا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، بانو جب دس گیارہ برس کی تھی تو اکثر ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ میری عمر بھی اس کے لگ بھگ ہی تھی۔ وہ مجھے شرارت سے تیلا کہا کرتی تھی۔ تیلا، پنجابی زبان میں تنکے کو کہتے ہیں اور چونکہ شروع میں میرا جسم بہت ہی دبلا تھا لہٰذا اس نے اسی مناسبت سے میرا نام رکھا تھا۔ میرے ہم عمر دوسرے لڑکے بھی اس نام سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک دفعہ ہم گاؤں سے باہر قبرستان کے قریب کھلے میدان میں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ کھیل کے دوران ہانپتی ہوئی بانو نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سرخ انار جیسے گال پر رکھ لیا اور بولی۔ "دیکھ تیلے! میرے گال کیسے تپ رہے ہیں۔" اس کی اس اضطراری حرکت سے میں دل ہی دل میں بہت لطف اندوز ہوا تھا۔ اس کے گال کی نرمی اور حدت میں عرصے تک فراموش نہیں کر سکا۔ چوری چوری میں نے کئی بار سوچا تھا کہ کاش! پھر کسی دن بانو کے گال دہکنے لگیں اور وہ میرا ٹھنڈا ہاتھ بے نیازی سے پکڑ کر اپنے رخسار پر رکھ لے مگر پھر کبھی ایسا نہیں ہوا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب گاؤں کے چند دوسرے لڑکوں کی طرح میں نے بھی بانو کے عشق میں گرفتار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ لڑکپن کے اس دور سے یوں آندھی اور طوفان کی طرح گزری تھی کہ سارے دل پھینک آنکھیں ملتے رہ گئے تھے۔ میرا یکطرفہ عشق بھی تین چار ماہ سے زیادہ نہیں چل سکا۔ جس دن مجھے اپنے یار روشن کی زبانی پتا چلا کہ بانو نے میراثیوں کے ایک لڑکے کی بری طرح پٹائی کی ہے اور مکا مار کر اس کے ناک کی ہڈی توڑ ڈالی ہے، تو میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکی کچھ اور طرح کی ہے اور اس کے لیے آہیں بھرنے میں سنگین خطرات پوشیدہ ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے بانو کا بھوت میرے سر سے اتر گیا اور وہ جو مرغ بسمل، ماہی بے آب اور بلبل صحرا کی سی کیفیت تھی، از خود بتدریج معدوم ہو گئی۔

...... تو میں ذکر کر رہا تھا بانو اور ڈاکٹر فاروق کے عشق کا۔ پہلے پہل مجھے یہ خبر بڑی عجیب سی لگی۔ یقین نہیں آیا کہ بانو جیسی لڑکی کی زندگی کا ایک رخ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال بہت جلد نہ صرف مجھے اس خبر پر یقین کرنا پڑا بلکہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح میں نے بہت کچھ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ کلینک والی گلی سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار بانو کو اپنے گھر کی چھت پر قلانچیں بھرتے دیکھا۔ کبھی کبھار وہ سیڑھیوں پر بیٹھی ایک ٹک ڈاکٹر کو گھورتی نظر آتی۔ ایک روز مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بانو ڈاکٹر کے کلینک میں گھسی ہوئی صفائی کرنے میں مصروف ہے۔ اس نے دوپٹا کس کے کمر سے باندھ رکھا تھا اور جھاڑو دینے میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر فاروق بے بسی کے عالم میں باہر کھڑا تھا۔ میں ڈاکٹر کی دل جوئی کی خاطر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ روہانسے لہجے میں بولا۔

"یار! یہ لڑکی تو میری جان کو آگئی ہے۔ ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے۔ دو دن سے کہہ رہی تھی کہ میں تیری دکان کی صفائی کروں گی۔ مجھے خواب آیا ہے کہ گاؤں کی کوئی لڑکی تیری دکان میں تعویذ دبا گئی ہے۔ اس تعویذ کی وجہ سے تو اس کے جال میں پھنس جائے گا کم بخت کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ گاؤں والے کیا سوچیں گے؟" ڈاکٹر فاروق نے یہ باتیں بڑے دھیمے لہجے میں کہی تھیں مگر بانو کے تیز کانوں سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ وہ جھاڑو پکڑے بگولے کی طرح اندر سے نکل آئی اور تنک کر بولی۔

"ڈاکٹر! کوئی اور مجھے کم بخت' کہتا تو اللہ کی قسم اس کم بخت کی گردن توڑ دیتی۔"

ڈاکٹر جھلا کر بولا۔ "تو میری بھی توڑ دے گردن۔ کیوں مہربانیوں کے دریا میں ڈبو رہی ہے مجھ کو؟"

بانو کے چہرے پر شفق سی پھیل گئی۔ عجیب انداز سے شرماتے ہوئے بولی۔ "تیری تو اور بات ہے ڈاکٹر' تو تو میری جان بھی لے لے تو ہائے نہ کروں۔"

بانو کی بے باکی دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ معاملہ کافی آگے بڑھ چکا تھا۔

میں بی اے کے امتحانات میں مصروف ہو گیا تھا اس لیے دو تین ماہ گاؤں کی معاشرتی زندگی سے تقریباً کٹا رہا۔ اس روز میں اپنا آخری پرچا دینے کے لیے جا رہا تھا۔ جب میں نے یہ روح فرسا خبر سنی کہ رات کسی نے ڈاکٹر فاروق پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔

اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں اور شدید زخمی حالت میں اسے لاہور پہنچا دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر فاروق کو دیکھا تھا ان کا خیال تھا کہ اس کے بچنے کے امکانات بہت کم ہیں۔

میں نے جیسے تیسے اپنا پرچا دیا اور فوراً گاؤں واپس روانہ ہو گیا۔ راستے میں طرح طرح کے خیالات ذہن پر یلغار کرتے رہے۔ گاؤں پہنچا تو ایک اور حیرت انگیز خبر ملی' بانو گھر سے غائب تھی۔ متعلقہ تھانے کا اے ایس آئی عملے کے ساتھ موقعے پر پہنچ کر تفتیش میں مصروف تھا۔ میرے ایک چچا پولیس میں تھے اور ان کے حوالے سے یہ اے ایس آئی مجھے بھی پہچانتا تھا۔ اس جان پہچان کے سبب مجھے جائے واردات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر فاروق کلینک کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ پہلے پہل وہ روزانہ لاہور چلا جایا کرتا تھا لیکن اب چونکہ سردیاں آگئی تھیں اس لیے چوہدری کے بڑے بیٹے ریاست نے جو اس کا دوست بھی تھا اس کے لیے کلینک کی ساتھ ہی رہنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ اب ڈاکٹر دوسرے یا تیسرے دن لاہور جایا کرتا تھا۔ یہ بارہ ضرب بارہ کا ایک عام سا کمرا تھا۔ گارے سے لپی ہوئی دیواروں پر ایک کیلنڈر اور دو تین تصویریں لگی تھیں۔ الماری نہ ہونے کی وجہ سے ایک میز پر کتابوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ لحاف چارپائی سے نیچے پڑا ہوا تھا تکیے اور چادر پر کثرت سے خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ خون کی ایک لکیر بستر سے دہلیز اور دہلیز سے آگے تک چلی گئی تھی۔ غالباً جب ڈاکٹر فاروق کو اٹھا کر ریاست کی جیپ میں ڈالا گیا تو اس کا لہولہان جسم یہ لکیر بناتا چلا گیا۔ حملہ رات کوئی دس بجے ہوا تھا۔ شاید ڈاکٹر فاروق یہیں بستر پر سسک سسک کر دم توڑ دیتا لیکن ایک اتفاق نے اسے فوری موت سے بچا لیا۔ گاؤں میں ایک شخص کو گردے کا شدید درد ہوا۔ اس کا بیٹا ڈاکٹر فاروق کو بلانے پہنچا تو------- بار بار کی دستک کے باوجود ڈاکٹر نے دروازہ نہ کھولا۔ ڈاکٹر فاروق کا یہ کمرا چوہدری یعنی نمبردار کی حویلی کا ایک حصہ تھا اور اس کمرے کا ایک دروازہ حویلی کی بیٹھک میں کھلتا تھا۔ مسلسل دستک کی آواز سن کر ریاست کمرے میں پہنچا تو اس نے ڈاکٹر کو شدید زخمی پایا۔

اس حادثے نے گاؤں کے ہر فرد کو متاثر کیا اور ان متاثرین میں میرا نام بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر فاروق ایک ہمدرد اور شریف النفس انسان تھا۔ اس کی ذات سے گاؤں والوں کو

عجیب طرح کا لگاؤ ہو گیا تھا۔ یہ لگاؤ مجھ میں شاید کچھ زیادہ ہی تھا۔ غیر شعوری طور پر میری یہ خواہش تھی کہ ڈاکٹر فاروق اور بانو کی محبت اچھے طریقے سے انجام پذیر ہو۔ ڈاکٹر فاروق' بانو سے شادی کر کے مستقل طور پر اس گاؤں میں سکونت اختیار کر لے......... مگر اس حادثے نے سارا تانا بانا بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ سردیوں کی اس تاریک رات کو کیا واقعہ رونما ہوا کہ خوبرو ڈاکٹر فاروق کو زندگی کے لالے پڑ گئے اور وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ حسین و چنچل بانو بھی گھر سے غائب ہو گئی۔ اس سوال کا جواب کم و بیش گاؤں کے ہر فرد کو چاہیے تھا مگر میری طبع میں شروع سے تجسس کچھ زیادہ ہی رہا تھا۔ اس لیے میں کسی پولیس والے کی طرح تحقیق میں مصروف ہو گیا۔ میں نے میو اسپتال لاہور کے تین چار چکر لگائے اور وہاں زیر علاج ڈاکٹر فاروق سے بات چیت کی لیکن کوئی اہم بات معلوم نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر فاروق نے مجھے بھی وہی کچھ بتایا جو اس نے پولیس اور دوسرے گاؤں والوں کو بتایا تھا یعنی اسے کچھ معلوم نہیں۔ رات سات آٹھ بجے سونے کے بعد اس کی آنکھ دوسرے روز یعنی ۳ دسمبر کو صبح دس بجے کھلی۔ وہ پٹیوں میں جکڑا اسپتال کے آئی سی یو' میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر فاروق نے اپنی طرف سے کسی پر شک کا اظہار نہیں کیا یا شاید وہ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

کمرے میں آمدورفت سے قدموں کے نشانات اور دوسرے شواہد ملیامیٹ ہو چکے تھے۔ بغور جائزے کے باوجود پولیس کو جائے واردات یا اردگرد سے کوئی خاموش گواہی بھی نہیں مل سکی۔ البتہ یہ معلوم ہوا کہ گاؤں کے قریب کھیتوں میں ایک گھوڑا گھومتا ہوا پایا گیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ گھوڑا بانو کے باپ فتو کا ہے جو نہ جانے کس طرح کھل کر کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔

صورت حال کے عمومی جائزے سے تین امکانات سامنے آئے تھے۔ پہلا امکان یہ تھا کہ ڈاکٹر پر اس عطائی کی طرف سے حملہ ہوا ہے جو پہلے روز سے ڈاکٹر کا مخالف تھا اور حیلے بہانوں سے اسے یہاں سے نکال دینا چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ ہو سکتی تھی کہ بانو کے بھائیوں نے جگ ہنسائی سے مشتعل ہو کر ڈاکٹر کا کام تمام کرنے کی کوشش کی اور تیسرا امکان یہ تھا کہ بانو نے خود اپنے محبوب کو ختم کرنا چاہا ہو اور اپنی دانست میں اسے ختم کرنے کے بعد روپوش ہو گئی ہو۔ کھیتوں میں گھومتا ہوا بابے فتو کا گھوڑا بھی اسی امکان کی

طرف اشارہ کرتا تھا ممکن ہے بانو نے گاؤں چھوڑنے کے لیے گھوڑا استعمال کیا ہو مگر بعد ازاں اس نے ارادہ بدل لیا ہو۔

یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی تھی کہ وقوعے سے صرف ایک روز پہلے بانو کو ڈاکٹر فاروق سے لڑتے جھگڑتے پایا گیا تھا۔ اس واقعے کے دو چشم دید گواہ بھی موجود تھے۔ یہ دونوں کسان تھے اور یکم دسمبر کی صبح منہ اندھیرے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اچانک انہیں درختوں کی طرف سے تیز لہجے کی آوازیں آئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ بانو اور ڈاکٹر فاروق کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق بانو کو جھڑکتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہاں سے چلی جائے اور کبھی اپنی شکل نہ دکھائے۔ جواب میں بانو نے روتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بھی دیکھ لوں گی' کون چھمک چھلو تیرے دل کی رانی بنتی ہے۔ ایک ایک کو برباد نہ کر دیا تو بانو نام نہیں۔"

ڈاکٹر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "جب برباد کرے گی تو دیکھ لوں گا۔"

بانو غضب ناک ہو کر بولی۔ "ڈاکٹر! تو نے ابھی بانو کا غصہ نہیں دیکھا اور اللہ کرے تو نہ ہی دیکھے۔"

ڈاکٹر نے بھڑک کر کہا۔ "اچھا بھونکتی رہ' یہاں کتیا کی طرح۔" اور منہ پھیر کر آگے نکل گیا۔

بانو کچھ دیر وہاں چپ چاپ کھڑی رہی پھر اس کی نگاہ دونوں کسانوں پر پڑی اور وہ ٹھٹک کر گاؤں کی طرف چل دی۔ اس واقعے کے ٹھیک سترہ گھنٹے بعد کسی نے ڈاکٹر فاروق پر سوتے میں حملہ کیا اور اسے سنگین طور پر زخمی کر دیا۔ اسی رات بانو نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے گھر سے فرار ہو گئی۔

حالات اور شواہد نہایت واضح طور پر بانو کی طرف انگلی اٹھا رہے تھے مگر کچھ ایسے اشارے بھی ملے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ بانو کا اس واردات میں کوئی ہاتھ نہیں۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ڈاکٹر فاروق کے کمرے کا وہ دروازہ جو گلی میں کھلتا تھا اندر سے بند تھا۔ اگر ڈاکٹر پر حملہ بانو نے کیا تھا تو وہ آئی کہاں سے تھی۔ صرف ایک ہی صورت تھی کہ وہ پہلے حویلی میں پہنچی ہو گی اور وہاں سے مردانے میں پہنچ کر کمرے کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہوئی......... اور پھر وہیں سے فرار بھی ہو گئی مگر حقیقت یہ تھی کہ حویلی کی بیرونی دیواریں خاصی بلند تھیں اور پھاٹک پر بھی ہمہ وقت مسلح آدمی

موجود رہتا تھا۔ بانو کتنی بھی کھلنڈری اور چاق و چوبند سہی، دس گیارہ فٹ اونچی سپاٹ دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اب یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کسی مرد کا کام ہے یا پھر اس میں کوئی ایسا شخص ملوث ہے جو حویلی کے اندر ہی موجود تھا اور یہ بات کوئی ایسی بعید از قیاس بھی نہیں تھی۔ حویلی کے اندر ڈاکٹر فاروق کا ایک کھلا دشمن موجود تھا۔ یعنی چوہدری کا چھوٹا بیٹا کرامت۔ کرامت شروع سے ہی ڈاکٹر کی آمد کا مخالف تھا اور گاؤں کے عام لوگوں کو معلوم تھا کہ عطائی ڈاکٹر طوطی جو بڑے دھڑلے سے ڈاکٹر فاروق کی مخالفت کرتا ہے تو اسے چوہدری کرامت ہی کی حمایت حاصل ہے۔ یہ بات بہت ممکن تھی کہ خود کرامت یا اس کے کسی وفادار ساتھی نے موقعے سے فائدہ اٹھایا ہو اور اندرونی دروازے سے گھس کر ڈاکٹر کو گھائل کر دیا ہو۔ موقعے سے فائدہ اٹھانے کی بات میں نے اس لیے کی ہے کہ کرامت اس بات سے آگاہ تھا کہ یکم دسمبر کی صبح بانو اور ڈاکٹر کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔ درحقیقت اس جھگڑے کے دونوں چشم دید گواہوں نے اس واقعے کی اطلاع کرامت کو دی تھی۔ انہوں نے کرامت کو بتایا تھا کہ چاچے فتو کی لڑکی بانو، گاؤں کی عزت برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس نے اب ڈاکٹر سے کھیتوں کھلیانوں میں ملنا شروع کر دیا ہے۔ کرامت نے اس خبر پر سخت غصے کا اظہار کیا اور کہا کہ بڑے چوہدری صاحب شہر، تاریخ پر گئے ہوئے ہیں۔ کل واپس آئیں گے تو ان کے سامنے یہ معاملہ رکھوں گا۔ ہو سکتا ہے، بعد میں کرامت نے عیاری سے یہ فیصلہ تبدیل کر دیا ہو۔

یہاں پھر ایک بات الجھا دیتی تھی اور وہ یہ کہ اگر کرامت نے یہ کام کیا تھا تو اس نے گلی کا دروازہ کیوں نہ کھول دیا تاکہ حویلی کے کسی مکین پر شک نہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ وہ بدحواسی میں بھول گیا ہو مگر یہ بات دل کو لگتی نہیں تھی۔ اب تیسری صورت یہ رہ جاتی تھی کہ بانو کے دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک نے یا دونوں نے مل کر یہ کام کیا ہو۔ بانو کا ایک بھائی تو بالکل سیدھا سادھا تھا۔ اس کے منہ سے ہر وقت رال بہتی رہتی تھی لیکن وہ خاصا تومند تھا۔ اس واردات میں اگر اس کا کوئی کردار تھا تو اتنا ہی ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو کندھوں پر اٹھا کر حویلی کی دیوار پر چڑھا دیا ہو۔ دوسرے بھائی کی ذہنی حالت نسبتاً بہتر تھی۔ وہ اٹک اٹک کر باتیں کرتا تھا اور کبھی سخت طیش میں بھی آجاتا تھا۔ اس کا نام گلو تھا۔ ایک بات جو اسے مشکوک بناتی تھی، یہ تھی کہ واردات کی صبح وہ گاؤں سے باہر ایک کھیت میں سوتا پایا گیا تھا۔ پولیس نے اسے وہیں سے گرفتار کر لیا۔ گلو

کی عادت تھی کہ وہ بعض دفعہ گھر سے نکل جاتا تھا اور ساری رات بے مقصد گھومتا رہتا مگر عین واردات کے روز اس کا کھلے آسمان تلے محو استراحت پایا جانا ایک خاص سمت اشارہ کرتا تھا۔

قصہ مختصر، پولیس نے مندرجہ بالا تینوں خطوط پر بھرپور تفتیش کی مگر اس گتھی کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔ کافی عرصہ گزرنے کے باوجود جب بانو کی گمشدگی کا کوئی سراغ نہ ملا تو لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ سارا کام اسی خبیث لڑکی کا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر فاروق شہر میں شادی کر رہا ہے تو اس نے اسے خطرناک نتائج کی دھمکی دی اور بعد ازاں اس دھمکی کو عملی جامہ پہنایا اور فرار ہو گئی۔

اس کے باوجود کچھ لوگ ایسا نہیں سمجھتے تھے اور ان میں، ایک میں بھی تھا۔ میں نے بانو کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے چاچا فتو کی ساری اولاد کی عقل اور ہوشمندی اسی میں آگئی ہے۔ ہاتھ چھٹ اور خود سر ہونے کے باوجود وہ بڑی ذہین لڑکی تھی اور بظاہر لاابالی ہونے کے باوجود نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کی مالک تھی۔ گاؤں کی ہم عمر لڑکیوں کے برعکس اس نے جس طرح اوائل بلوغت میں اپنا دامن بچایا تھا وہ اس کے کردار کی مضبوطی پر دلالت کرتا تھا۔ یقینی بات ہے کہ ڈاکٹر فاروق کی شادی کا سن کر اس کے دل کو ٹھیس پہنچی ہوگی اور اس نے تنہائی پا کر ڈاکٹر فاروق سے بات کی ہوگی مگر یہ کہنا کہ اس گفتگو کے نتیجے میں اس نے ڈاکٹر کو جان سے مارنے کی کوشش کی، کم از کم میرے ذہن میں نہیں سماتا تھا...... اور بہ فرض محال اس نے ایسا کیا بھی تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی بڑی وجہ رہی ہوگی۔

اس واقعہ کو بغیر حل ہوئے چار برس بیت گئے۔ اس دوران میں بطور اے ایس آئی پولیس میں بھرتی ہوا۔ پھر سب انسپکٹر بنا دیا گیا۔ وہ سردیوں کی ایک ٹھٹھری ہوئی سہ پہر تھی۔ میں راولپنڈی کے راجا بازار میں کچھ خرید و فروخت کر رہا تھا۔ یہاں میری آمد ایک اہم کیس کے سلسلے میں تھی اور میں اپنی تفتیشی پارٹی کے ساتھ ہیڈ کوارٹر میں قیام پذیر تھا۔ میں بازار کے شمالی حصے میں کراکری کی ایک دکان کے سامنے کھڑا تھا جب سرخ رنگ کی ایک ٹویوٹا کرولا سڑک پر رکی اور اس میں سے ایک خوبصورت عورت اتر کر دکان کی طرف بڑھی۔ میں نے عورت کی صرف ایک جھلک دیکھی اور سن ہو کر رہ گیا۔ وہ بانو تھی۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ میں نے اسے بہت قریب سے اور ایک

عرصے تک دیکھا تھا۔ میں اس کی ایک ایک ادا کو پہچانتا تھا۔ بانو اس وقت بالکل مختلف
روپ میں تھی۔ اس نے اونچی ایڑی کی جوتی اور جدید فیشن کی تنگ پائنچوں والی شلوار
پہن رکھی تھی۔ بالائی جسم بوسکی کی ایک لیس دار چادر میں چھپا ہوا تھا۔ اس چادر میں سے
اس کا پرکشش چہرہ ہلکے میک اپ میں کسی نگینے کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی
دکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگی اور اسی وقت اس کی نگاہ میری طرف اٹھ گئی اس کی خوب
صورت آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں اور چہرہ چند لمحوں کے اندر کئی رنگ بدل گیا۔
ایک موقعے پر تو بالکل یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے بات کرنے لگی ہے مگر اگلے ہی لمحے
وہ بالکل اجنبی نظر آنے لگی۔ اس نے پیشانی پر ڈھلک آنے والی بالوں کی لٹ کو سر جھٹک
کر پیچھے ہٹایا اور دکان دار کی طرف متوجہ ہو گئی میں وہیں کھڑے کھڑے اس کا جائزہ لینے
لگا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ خریداری کی طرف
قطعاً دھیان نہیں دے رہی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جان چکی تھی کہ میں وہیں قریب میں
موجود ہوں۔ چند لمحے بعد وہ بغیر کچھ خریدے دکان سے نکلی اور سڑک پر آگئی۔ بازار میں
خاصی گہما گہمی تھی۔ وہ لوگوں کے درمیان راستہ بناتی تیز تیز آگے بڑھنے لگی۔ میں بھلا
کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ میں نے مستعدی سے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ
اپنے تعاقب سے آگاہ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سراسیمگی میں اضافہ ہو گیا۔

میں کافی فاصلے سے بھی اس کے چہرے کا ہراس واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ پھر
اچانک وہ تنگ سی گلی میں مڑ گئی۔ اس نے یہ حرکت اتنی اچانک اور ایسی سمجھداری سے
کی تھی کہ میں جو بڑے بڑے گھاگ مجرموں کو بھاگنے کا راستہ نہیں دیتا تھا اس سے چکر کھا
گیا۔

راہگیروں سے دھکم پیل کرتا میں جونہی اس تنگ گلی کے ناکے پر پہنچا' بانو مجھے
کہیں نظر نہیں آئی۔ گلی کے دونوں اطراف سلائی کڑھائی کے سامان کی ان گنت دکانیں
تھیں۔ ان دکانوں میں سے کچھ کے عقبی دروازے بھی تھے چھوٹی چھوٹی گلیوں کا جال بچھا
ہوا تھا............ میں نے ان گلیوں میں تھوڑی سی بھاگ دوڑ کی اور جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا
کہ اب تگ و دو کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ فوری طور پر میرا دھیان اس سرخ
گاڑی کی طرف چلا گیا جس نے بانو کو کراکری کی دکان کے سامنے اتارا تھا۔ میں واپس مڑا
اور قریباً بھاگتا ہوا اس دکان تک پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ کار وہیں موجود ہے۔

ادھیڑ عمر باوردی ڈرائیور کار کے قریب کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا' شاید اسے توقع نہیں تھی
کہ مالک اتنی دیر لگائے گی۔ وہ اسکوٹر جس پر میں یہاں پہنچا تھا' دکان کے سامنے ہی کھڑا
تھا۔ میں نے اسکوٹر وہاں سے ہٹایا اور کچھ فاصلے پر لے جاکر کھڑا کر دیا۔ یہاں سے میں اس
کار پر بخوبی نگاہ رکھ سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے کار کا نمبر نوٹ کیا اور پھر اسکوٹر پر
بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ کب وہ بدکی ہوئی ہرنی واپس پہنچے اور گاڑی میں بیٹھے۔ اگر وہ نہ
بھی پہنچتی تو کوئی خاص فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ میں کار کا تعاقب کرتا ہوا آسانی سے اس
کے ٹھکانے تک پہنچ سکتا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے گمان تھا۔ بانو واپس نہیں لوٹی۔ ڈرائیور بار بار گھڑی دیکھتا
رہا اور بے قراری سے اپنی چندیا کھجاتا رہا۔ مایوسی کے عالم میں اس نے قریبی دکانوں کا
ایک چکر لگایا اور پریشان چہرے سے گاڑی میں آبیٹھا۔ اب شام گہری ہو چکی تھی اور بانو کو
گاڑی سے اترے قریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ یقیناً اب ڈرائیور مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔
اس نے گاڑی آگے بڑھائی اور حتی الامکان تیزی سے روانہ ہو گیا۔ میں چونکہ سادہ لباس
میں تھا۔ اس لیے ڈرائیور کے چوکنا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ گاڑی کے ساتھ چپکے
چپکے میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ مختلف سڑکوں اور گلیوں سے ہوتی ہوئی آخر یہ
گاڑی ایک شاندار کوٹھی کے سامنے جا رکی۔ چاروں طرف سے درختوں میں گھری ہوئی یہ
کوٹھی ایک فیشن ایبل بستی میں واقع تھی۔ میں نے کوٹھی کی نیم پلیٹ پڑھی اور اس کی
تفصیلات اچھی طرح ذہن نشین کرتا ہوا واپس آگیا۔

☆---------------☆---------------☆

یہ کوٹھی مصدق بیگ نامی ایک شخص کی تھی۔ میں نے ٹیلیفون ڈائریکٹری سے
اس کے نام اور پتے کی تصدیق کی اور ٹیلیفون کا نمبر نوٹ کر لیا۔ اسی روز دوپہر کے وقت
میں نے اس نمبر پر رنگ کیا۔ ایک گھریلو ملازمہ نے فون اٹھایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ
کیا مصدق صاحب گھر میں ہیں۔ میری توقع کے مطابق نفی میں جواب ملا۔ میں نے کہا کہ
بیگم صاحبہ کو بلایا جائے۔ یہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ریسیور سے جو شیریں اور
کھنک دار آواز سنائی دی وہ بانو کی تھی۔ لب و لہجہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا تھا مگر یہ
تبدیلی کم از کم میرے کانوں کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ میں نے بانو کی ہیلو کے جواب
میں کہا۔

"دیکھو بانو! فون بند نہ کرنا کیونکہ اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔"

"کک...... کون ہو تم؟" دوسری جانب سے ڈری اور سہمی ہوئی آواز آئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ یہ خوفزدہ کمزور آواز بانو کی نہیں ہو سکتی۔ وہ ایسے لرزاں و ترساں لہجے میں کہاں بات کرتی تھی۔ کل بھی جب میں نے اسے لجاتے شرماتے، بڑی نزاکت سے دکان کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تھا تو وہ مجھے بڑی عجیب سی لگی تھی۔ بانو تو ایک تند بگولے کا نام تھا جو جدھر سے گزرتا، ہرشے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتا...... مگر کچھ بھی تھا فون پر دوسری طرف بانو ہی تھی۔

میں نے کہا۔ "بانو میں شاہ زمان ہوں۔ تمہارے بچپن کا ساتھی...... کل میں نے تمہیں گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ اسی گاڑی نے مجھے تمہارے ٹھکانے سے آگاہ کیا ہے۔"

دوسری جانب سے سراسیمہ آواز سنائی دی۔ "کون ہو تم؟ مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہیں...... اور میرا نام بانو نہیں ریحانہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "بانو عرف ریحانہ! تم بے حد خوف زدہ ہو رہی ہو۔ شاید تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ گھریلو عورتیں اس طرح فون پر اپنا نام نہیں بتایا کرتیں۔"

وہ سٹپٹا کر بولی۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کس لیے فون کیا ہے؟"

میں نے قدرے اعتماد سے کہا۔ "بانو! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" دوسری طرف سے کلک کی آواز آئی۔ میں ہیلو ہیلو کرتا رہا لیکن سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

میں نے پورا ایک دن بانو کو سوچنے کا موقع دیا اور اگلے روز پھر اسی وقت ٹیلی فون کیا۔ اتفاقاً اس روز بانو نے ہی فون اٹھایا لیکن اس نے ایک بار پھر مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وہ سخت متذبذب محسوس ہو رہی تھی...... ڈری اور سہمی ہوئی۔ میں نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بانو، میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ میں کل ٹھیک دو بجے کیفے کارواں میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اچھی طرح ذہن نشین کر لو، کیفے کارواں ٹھیک دو بجے سہ پہر! اس کے بعد حالات کی تمام ذمے داری تم پر ہو گی۔ اور تم گمان بھی نہیں کر سکتیں کہ حالات کتنے سنگین ہو سکتے ہیں......" یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

اگلے روز ٹھیک سوا دو بجے میں اور بانو کیفے کارواں کے ایک فیملی کیبن میں آمنے

سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اس وقت بھی سادہ لباس میں تھا۔ بانو نے خود کو...... ہلکے رنگ کی ایک چادر میں اس طرح چھپایا ہوا تھا کہ اس کے چہرے کا ایک چوتھائی حصہ بہ مشکل نظر آ سکے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چادر کا پلو سر سے سرکا دیا اور پرس سے ٹشو پیپر نکال کر پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگی۔

"اتنی سردی میں پسینہ!......" میں نے اپنائیت سے کہا۔

اس نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ آج ان آنکھوں سے گہری شناسائی جھانک رہی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھتی چلی گئی۔ پھر بالکل اچانک اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو تھاما اور ان پر اپنا چہرہ جھکا کر ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگی۔ چادر کے اندر اس کا خوب صورت جسم بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا اور میرے ہاتھ اس کے آنسوؤں کی گرمی محسوس کر رہے تھے۔ اس کی آواز زیادہ بلند تو نہیں تھی مگر پھر بھی کوئی متوجہ ہو سکتا تھا۔ میں بانو کو دلاسا دینے کی ناکام کوشش کرنے لگا مگر اس سے اس کی آواز اور بلند ہو گئی۔ یوں لگتا تھا اس کے ضبط کا ہر بند ٹوٹ گیا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یوں رونا ٹھیک نہیں، وہ خود کو روک نہیں سکی۔ حسب توقع چند لمحے بعد بیرا دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔ تاہم میں نے اپنے پراعتماد لہجے سے اس کو مطمئن کر دیا اور وہ یہ سمجھتے ہوئے کہ کوئی خانگی معاملہ ہے۔ واپس چلا گیا۔

بانو روئی اور بہت دیر تک روئی۔ پھر جب اس کا جی ہلکا ہوا تو ہم نے چائے وغیرہ پی۔ میرے بے پناہ اصرار کے بعد اس نے اپنی بپتا سنانی شروع کی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں اس کو اس کے حال پر چھوڑ دوں گا اور کسی طرح مہم جو بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھ سے عدم مداخلت کا عہد لینے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے تھے اور ایسا التجائیہ لہجہ اختیار کیا کہ میں نے خلوص دل سے وعدہ کر لیا کہ اگر میں اسے فائدہ نہ پہنچا سکا تو نقصان بھی نہیں پہنچاؤں گا اور اگر اس کے بتائے ہوئے حالات کے مطابق واقعی میرا خاموش رہنا مناسب ہوا تو میں اس خاموشی کو مصلحت سمجھ کر قبول کر لوں گا۔ اس کے بعد بانو نے مجھے جو روداد سنائی اس کا لب لباب یہ ہے:

۲ دسمبر کی اس رات ڈاکٹر فاروق پر جو قاتلانہ حملہ ہوا تھا وہ نہ بانو نے کیا اور نہ اس کے بھائیوں میں سے کسی نے۔ ڈاکٹر طوطی یا چوہدری کرامت میں سے بھی کوئی اس حملے کا ذمے دار نہیں تھا۔ اس حملے کا ذمے دار بانو کا ایک چچا زاد بھائی یونس عرف یوسی

تھا۔ یوسی ایک قریبی گاؤں میں رہتا تھا اور بانو سے شادی کا خواہشمند تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ بانو گاؤں کے ڈاکٹر سے محبت کرنے لگی ہے تو اس نے بہت پیچ و تاب کھائے۔ بانو کے باپ فتو سے اس کی بہت بنتی تھی اور وہ اکثر اس کے پاس آتا رہتا تھا۔ اس نے چاچے فتو سے کہا کہ لوگ باتیں بنانے لگے ہیں اس لیے وہ بانو کی شادی جلدی کر دے۔ دوسری طرف بانو کو جب پتا چلا کہ یوسی اس کے باپ کو الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا رہا ہے تو وہ بہت آگ بگولا ہوئی اور اس نے ایک روز یوسی کو ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا اور باپ سے صاف کہہ دیا کہ وہ اگر شادی کرے گی تو ڈاکٹر سے' ورنہ کنویں میں کود جائے گی۔ بانو کے غصے سے اس کے ماں باپ بھی واقف تھے' لہٰذا انہوں نے اسے زیادہ بھڑکانا مناسب نہیں سمجھا اور خاموش ہو رہے۔

اس دوران شہر میں ڈاکٹر فاروق کی شادی طے ہو گئی اور بانو کا یک طرفہ عشق گلی گلی خوار ہونے لگا۔ ایک روز یونس عرف یوسی ان کے گاؤں آیا اور بانو کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے بانو سے ملاقات کی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس سے شادی پر تیار ہو جائے۔ اس نے اپنے رقیب یعنی ڈاکٹر فاروق کو برا بھلا بھی کہا۔ جواب میں بانو نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور کہا کہ وہ ڈاکٹر کی جوتی جیسا بھی نہیں۔ ڈاکٹر اگر ایک بار جھوٹے منہ سے کہے تو وہ اس کے لیے اپنا آپ بیچ سکتی ہے مگر اس لچے کی گھر والی بننے سے بہتر سمجھتی ہے کہ زہر پھانک لے۔

کچھ تیز و تند مکالموں کے بعد یوسی دانت کچکچاتا ہوا واپس چلا گیا۔ یہ شخص پرلے درجے کا آوارہ گرد اور جھگڑالو تھا اور نشہ وغیرہ بھی کرتا تھا۔ اس نے اپنے چچا یعنی بانو کے بوڑھے باپ کو ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

بانو سے دو ٹوک جواب سننے کے بعد یوسی کے سینے میں ڈاکٹر کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ بانو کو جو............ سنگین دھمکیاں دے کر آیا تھا ان میں ایک دھمکی یہ بھی تھی کہ وہ ڈاکٹر فاروق کو جان سے مار ڈالے گا اور اب اس دھمکی پر عملدرآمد کا وقت آ گیا تھا۔ واردات سے دو روز پہلے وہ اپنے آپ کو چادر میں لپیٹ کر مریض کے بھیس میں ڈاکٹر کے کلینک پہنچا۔ اس نے موقعہ واردات کا اچھی طرح جائزہ لیا اور واپس چلا گیا۔ ۲ دسمبر کو رات سوا آٹھ بجے ڈاکٹر فاروق اپنے کمرے میں پہنچا تو یوسی چارپائی کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ درحقیقت وہ شام کے وقت ہی موقع پا کر گلی والے دروازے سے

کمرے میں گھس گیا تھا۔ وہ ایک تیز دھار کلہاڑی سے مسلح تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے ڈاکٹر کے سونے کا انتظار کیا اور جب ڈاکٹر کے مدہم خراٹے کمرے میں سنائی دینے لگے تو وہ چارپائی کے نیچے سے نکلا اور غضب سے مغلوب ہو کر اس پر اندھا دھند وار کرنے لگا۔ شاید وہ اسی جگہ ڈاکٹر کو جان سے مار دیتا مگر اچانک بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کے باپ کو گردے کا درد ہو رہا تھا۔ اس دستک پر یوسی بوکھلا گیا۔ اب ایک ہی صورت تھی۔ وہ حویلی میں کھلنے والا دروازہ استعمال کرے اور بیرونی دیوار پھاند کر بھاگ جائے۔ اس نے قسمت آزمائی کی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔ ریاست کے جاگنے اور کمرے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ دیوار پھاند کر فرار ہو گیا۔

اس اندوہناک واقعے کی خبر جب بانو تک پہنچی تو اس کا دھیان فوراً یونس عرف یوسی کی طرف چلا گیا۔ اسے یوسی سے چند روز پیشتر کی ملاقات اور اس کا زہریلا لہجہ یاد آیا اور وہ سمجھ گئی کہ اس کے محبوب کو خون میں ڈبونے والا کون ہے؟ اس کا مارے غصے کے برا حال ہو گیا۔ وہ وہی دس بارہ سال کی کھلنڈری لڑکی بن گئی جو لڑکوں سے پنجہ آزمائی کرتی تھی اور غصے میں آ کر مدمقابل کو زمین پر دے مارتی تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو اور ذہن میں طوفان لیے زخمی شیرنی کی طرح گھر سے نکلی اور اپنے محبوب کا انتقام لینے چل پڑی۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ ایک لڑکی ہے' خوب صورت ہے۔ رات تاریک ہے اور گاؤں کی گلیاں سنسان' وہ کتنی بھی زور آور ہے' کتنی بھی جوشیلی ہے' آخر عورت ذات ہے۔ مرد اسے دیکھے گا تو پاگل ہو جائے گا' اور پاگل کی قوت کئی گنا بڑھ جاتی ہے' اس کے دل میں صرف ایک ہی بات تھی کہ اسے اپنے چچا زاد سے انتقام لینا ہے' اور یہ انتقام صرف وہی لے سکتی تھی کیونکہ وہ اس کے کرتوت جانتی تھی اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے اپنے والدین کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر کو خون میں نہلانے والا اور اس کی ٹانگیں توڑنے والا یوسی ہے تو وہ کبھی یقین نہیں کریں گے۔ شاید کوئی بھی اس کی بات کا یقین نہیں کرے گا کیونکہ وہ گاؤں والوں کے لیے قابل اعتبار نہیں تھی۔

اپنے باپ کے گھوڑے پر سوار وہ سیدھی یوسی کے گاؤں پہنچی اور وہاں سے یوسی کے ٹھکانے پر آ گئی۔ گاؤں سے باہر چوہدری کا ڈیرا تھا اور یوسی اپنے نشے باز دوستوں کے ساتھ اکثر وہاں بیٹھا رہتا تھا۔ بانو غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ کسی بھی اندیشے کو خاطر میں لائے بغیر وہ سیدھی ڈیرے میں گھس گئی۔ وہاں یوسی کے علاوہ چوہدری اور اس کے دو

مہمان بھی موجود تھے۔ وہ چاروں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور مے نوشی میں مصروف تھے۔ بانو نے اندر گھستے ہی لپک کر یوسی کو دبوچ لیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک درانتی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی یوسی کو بچانے کی کوشش کرتا یا وہ خود ہی صورت حال جان کر اپنا دفاع کرنے کے قابل ہوتا' بانو کی درانتی دوبار اس کے پہلو میں گھس کر باہر آچکی تھی۔ یوسی نے چیخ ماری اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ چوہدری اور اس کے دونوں مہمانوں نے جھپٹ کر بانو کو دبوچنا چاہا مگر وہ خونخوار درندے کی طرح ان کی طرف مڑی۔ اور بے دریغ درانتی گھمانے لگی۔ چوہدری کی بندوق اور کلہاڑی ایک دیوار پر لٹکی تھی۔ اس نے بانو سے پنڈا بچاکر اپنے ہتھیاروں کی طرف لپکنا چاہا مگر درانتی کا ایک بھرپور وار اس کے بازو کو ادھیڑ گیا اور وہ چلاتا ہوا یوسی پر جا گرا۔ دونوں مہمان کونے میں دبکے بے بسی سے بانو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بانو انہیں دھمکی آمیز نگاہوں سے گھورتی الٹے پاؤں......... واپس ہوئی مگر اس وقت تک چوہدری کی چیخ و پکار کام کر چکی تھی۔ نزدیکی کنویں پر موجود اس کے دو کارندے دروازے پر نظر آئے۔ پھر ان میں سے ایک نے جی داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بانو کو عقب سے جکڑ لیا۔ دوسرے نے اس کی درانتی والی کلائی تھامی اور مروڑنا شروع کر دیا۔ بپھری ہوئی بانو نے خود کو چھڑانے کی زبردست کوشش کی اور چوہدری کے آدمیوں میں سے ایک کو زخمی بھی کر دیا مگر آخر کار وہ بے بس ہو گئی۔ ان لوگوں نے اسے زمین پر لٹا کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

چوہدری کی ہدایت پر اس کے کارندے زخمی یوسی کو ٹریکٹر ٹرالی میں ڈال کر نہایت خاموشی سے لاہور لے گئے۔ باقی جن افراد کو زخم آئے تھے انہوں نے خود ہی مرہم پٹی کر لی......... چوہدری نے اپنے ایک آدمی کو ہدایت کی کہ وہ بانو کے گھوڑے کو نہایت خاموشی کے ساتھ اس کے گاؤں پہنچادے تاکہ بانو کی اس گاؤں میں آمد کا واحد ثبوت بھی ختم ہو جائے۔ اب بے بس بانو وحشی درندوں کے قبضے میں تھی۔ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اور ان کے تیوروں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سے بھرپور انتقام لیں گے۔ اس نے یہاں پہنچ کر اپنے ڈاکٹر کا انتقام تو لے لیا تھا مگر خود آہنی جال میں پھنس گئی تھی۔ چوہدری کے دونوں مہمانوں میں سے ایک پتلون بشرٹ والا کوئی شہری شخص تھا اس کا نام مصدق تھا۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ مصدق نامی یہ شخص قریبی سائفن پر مچھلی شکار کھیلنے آیا تھا۔ چوہدری اس سے خاصا مرعوب نظر آتا تھا اور اس کا نام بے تکلفی

نہیں لے رہا تھا۔ چوہدری کے ساتھ ساتھ یہ مصدق نامی شخص بھی بانو کو للچائی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ آخر وہ چوہدری سے بولا۔
"طفیل یار! یہ مصیبت تو میرے گلے ڈال دے۔" اس کا اشارہ بانو کی طرف تھا۔
چوہدری نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ "مصدق صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ صبح مچھلیوں کے ساتھ ایک مچھلی یہ بھی سہی۔"
مصدق نے چوہدری طفیل کے حریص چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے کہ صبح تک اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونا چاہیے۔"
چوہدری نے اپنے زخمی بازو کی پٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مصدق صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے ہم تینوں آدمیوں پر حملہ کیا ہے۔ یہ رحم کے قابل کہاں؟"
مصدق کمینگی سے ہنستے ہوئے بولا "یار! تیرے ان زخموں کا بدلہ بھی میں ہی لوں گا اس سے۔ یاروں کے بدلے یار ہی تو چکاتے ہیں۔"
چوہدری نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "مصدق صاحب! مگر یوسی کیا کہے گا؟ یہ حرام زادی اس کی منگیتر ہے۔"
مصدق نے کہا۔ "پتا نہیں' اب وہ بچتا بھی ہے یا نہیں۔ اگر بچ گیا تو بھی وہ اس درانتی مار' سے شادی کرنا کب پسند کرے گا۔"
چوہدری نے کہا۔ "مجھے ٹھیک طرح معلوم نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کیا جھگڑا چل رہا تھا۔ بہرحال' یہ میں جانتا ہوں کہ اس نے اس خوب صورت چڑیل پر پیسہ بہت خرچ کیا ہے ہزاروں ہی کھلا دیے ہیں اس کے باپ کو۔" مصدق نے چوہدری کا مقصد سمجھ لیا۔ اس نے فرش پر پڑی بانو کو نگاہوں میں تولا اور بولا "پندرہ ہزار ٹھیک رہیں گے اس کے منگیتر کے لئے۔"

چوہدری کے چہرے پر مکارانہ تاثرات ابھرے۔ وہ بولا۔ "میرا خیال ہے مصدق صاحب' یہ بات ابھی قبل از وقت ہے ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یوسی کا کیا بنتا ہے؟"
مصدق نے کہا "چلو چھوڑو ان اندیشوں کو۔ میں تیس ہزار دے دیتا ہوں۔ اس میں اس کے علاج معالجے یا کفن دفن کا خرچا بھی شامل ہو گا۔"
چوہدری طفیل پھر بھی خاموش رہا۔ مصدق نے کہا۔ "اچھا چالیس ہزار۔ میرا خیال

ہے یہ رقم تمہارے اندیشوں اور یوسی کی دلجوئی کے لیے کافی ہو گی۔"

چوہدری کے چہرے پر نیاز مندانہ مسکراہٹ ابھری۔ "مصدق صاحب! آپ بھی کمال کے آدمی ہیں بس جو زبان سے نکلا۔ پتھر کی لکیر ہو گیا۔ ٹھیک ہے' میں کوشش کروں گا کہ اس لڑکی کی وجہ سے آپ کسی بھی مصیبت میں پھنسنے سے محفوظ رہیں۔"

مصدق سے وصول ہونے والی رقم کا بڑا حصہ یقیناً چوہدری کی جیب میں چلا گیا ہو گا۔ کیونکہ یونس عرف یوسی نے ان واقعات سے کوئی دو سال بعد ایک خیراتی اسپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی۔

الغرض چوہدری نے مصدق سے چالیس ہزار روپے وصول کر کے بانو اس کے حوالے کر دی اور وہ اگلے روز اسے اپنے ساتھ لاہور اور پھر پنڈی لے گیا۔ پنڈی کی اس شاندار کوٹھی میں بانو کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ قطعی ناقابل بیان ہے۔ مختصراً یہ کہ مصدق بیگ ایک نہایت کمینہ اور بے رحم شخص تھا۔ جس روز وہ اسے گاؤں سے لے کر آیا۔ اس روز اس نے واقعی مچھلی کا شکار کھیلا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک مچھلی ہی تھی جسے اس نے رواں پانی سے نکال کر خشک ریت پر تڑپنے کے لیے پھینک دیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے پیٹنا' نشے میں دھت ہو کر اسے گالیاں دینا اور بھوکا پیاسا کمرے میں بند رکھنا اس کا روز کا معمول تھا۔ اس نے بانو سے شادی نہیں کی تھی مگر اسکے ساتھ ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ بڑے اچھے موڈ میں ہوتا اور سفاکی کا دیو اس کے اندر کہیں سو رہا ہوتا تو وہ بڑی محویت سے بانو کا چہرہ تکتا اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے سہلاتا ہوا کہتا:

"بانو! میں تیرے اندر کی عورت کو زندہ کرنا چاہتا ہوں' جو تیرے اجڈپن اور تیری بے باکی کے بوجھ تلے دبی پڑی ہے۔ میں تجھے نہیں مارتا اس مرد کو مارتا ہوں جو تیرے اندر گھسا بیٹھا ہے' میں تجھ سے شادی کروں گا مگر اس وقت جب تو ایک مکمل عورت بن جائے گی۔"

بانو اس کی کوٹھی میں ایک قیدی کی زندگی گزار رہی تھی۔ مصدق کی غیر موجودگی میں اس کے دو ملازم ہر وقت بانو کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ دونوں چھٹے ہوئے بدمعاش اور شکل ہی سے جرائم پیشہ نظر آتے تھے۔ ایک دفعہ بانو نے اس جہنم سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ یہ کوئی ڈھائی سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ان دنوں مصدق شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ نصف شب کے وقت بانو خواب گاہ سے نکلی اور پالتو کتے کو پچکارتی ہوئی بیرونی گیٹ تک

پہنچ گئی مگر اسی وقت اس کے ایک محافظ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پستول نکال لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا واپس لے گیا۔

اپنی اس کمزور سی کوشش کی جو سزا ملی وہ اس کے تصور سے بھی باہر تھی اور اس سزا کے بعد کبھی فرار ہونے کا خیال بانو کے ذہن میں نہیں آیا۔ اس واقعے کے کوئی تین روز بعد مصدق واپس آیا اور اس سے اگلے روز رات کے کھانے کے بعد وہ اسے ساتھ لے کر ٹہلنے کے لئے پائیں باغ میں چلا گیا۔ یہاں ایک بند ویگن کھڑی تھی۔ ویگن کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ بانو نے بے خیالی میں جھانک کر دیکھا تو سکتے میں رہ گئی............ اندر ڈاکٹر فاروق پڑا تھا مگر اس حالت میں کہ اس کا جسم ایک اسٹریچر سے بندھا ہوا تھا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی............

فاروق کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور اس کے بدن کی جنبش اور گلے کی پھولی ہوئی رگوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ............ وہ بری طرح چیخ رہا ہے اور مدد کے لیے پکار رہا ہے مگر منہ کے کپڑے اور بند ویگن کی وجہ سے اس کی آواز باہر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اسکے جسم پر پھٹا ہوا لباس تھا اور خراشیں تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے اغوا کرتے وقت مارا پیٹا گیا ہے۔ بانو نے دیکھا کہ اس کی ایک ٹانگ گھٹنے سے غائب تھی اور چہرے پر بھی زخم کا ایک پرانا نشان تھا۔ وہ ڈاکٹر فاروق جس کے بارے میں بانو نے پہروں اس قید خانے میں سوچا تھا۔ جس کی یاد میں وہ رات بھر روئی اور سارا سارا دن تڑپی تھی' وہ آج اس کے سامنے تھا مگر اس بے بسی کے عالم میں کہ وہ سرتاپا کانپ گئی۔ اس کے پہلو میں کھڑے مصدق نے اپنے مخصوص اجنبی لہجے میں سفاکی سے کہا۔

"اس دفعہ میں ڈاکٹر کو کچھ نہیں کہوں گا اور وہ اسی طرح تمہارے گاؤں کی اس غلیظ کوٹھری میں واپس پہنچ جائے گا جسے یہ اپنا کلینک کہتا ہے لیکن اگر پھر تم نے مجھے دھوکا دے کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر زندہ نہیں رہے گا۔"

بانو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے جس محبوب کے لئے اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا' اپنی زندگی عذاب بنالی' وہ اس سے صرف ایک گز کی دوری پر تھا۔ وہ چیخ رہا تھا مگر وہ اس کی آواز نہیں سن سکتی تھی صرف تاریکی میں کھڑی ہو کر آنسو بہا سکتی تھی یا اس کے چہرے اور بالوں پر اپنی گاؤں کی خاک تلاش کر سکتی تھی۔ خاک کے یہ ذرے نگینوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ ہر ذرہ ایک داستان تھا اور ہر داستان ۲ دسمبر کی

اس تاریک رات سے شروع ہوتی تھی جب بانو کے ڈاکٹر کو کسی نے خون میں ڈبو دیا تو اور وہ اس کی مصیبت پر تڑپ اٹھی تھی اور اس کے دشمن کو جہنم واصل کرنے کے لیے ہر خطرے سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس کے بعد گاؤں میں کیا ہوا تھا؟ اس کے ماں باپ کہاں تھے؟ اس کا سکھیاں کیا سوچتی تھیں اس کے محبوب نے کیا کیا تھا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا ان سوالوں کے جواب اس سے ایسے ہی پوشیدہ تھے جیسے آخری سانس سے موت کا اندھیرا پوشیدہ ہوتا ہے۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ویگن کی اندرونی روشنی گل ہوئی اس کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ موڑ کاٹ کر کوٹھی سے باہر نکل گئی۔

اس روز کے بعد پنجرہ توڑنے اور جال کاٹنے کی تمام خواہشیں بانو کے اندر دم توڑ گئیں۔ وہ جان چکی تھی کہ اس کے صیاد کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور وہ اس کو تابع فرمان رکھنے کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور بے حسی سے زندگی گزارنے لگی۔ اس نے آخری فیصلہ کر لیا کہ اس کی ذات سے اس کے محبوب کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور وہ زندگی میں کبھی مصدق بیگ سے ٹکرانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طور پر وہ اسی رنگ میں رنگتی چلی گئی جس رنگ میں مصدق بیگ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ خاموش شرمیلی' نازک کمزور اور ہر قدم اٹھانے سے پہلے اپنے مالک کی طرف دیکھنے والی مصدق بیگ کے معیار کے مطابق ایک مکمل عورت' مصدق نے جب دیکھا کہ پنچھی کے پر کٹ چکے ہیں اور وہ قفس چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا تو اس نے کچھ شرائط کے ساتھ اسے گھر سے باہر نکلنے کی آزادی دے دی.......... اور پھر ایک روز بانو عرف ریحانہ مصدق کچن کے لیے کچھ کراکری خریدنے کے ارادے سے راجا بازار پہنچی اور دکان کی سیڑھیوں پر اس کی ملاقات ایک ہمدم دیرینہ سے ہو گئی۔

بانو کی روداد ختم ہوئی تو میز پر پڑے ہوئے تمام ٹشو پیپرز اس کے آنسوؤں کی نذر ہو چکے تھے۔ میرے اعصاب مضمحل ہو گئے تھے اور سینے میں ایک الاؤ سا بھڑک رہا تھا۔ شام کا اندھیرا اس فیملی کیبن تک نہیں پہنچ پایا تھا لیکن شام بہرحال ہو چکی تھی۔

میں نے اپنے سامنے بانو کے روپ میں بے بسی کی اس تصویر کو غور سے دیکھا اور دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر جانے کیوں مجھے سرکس کے جانور یاد

آگئے؟ ہم انہیں دیکھ کر خوش ہوتے اور تالیاں بجاتے ہیں۔ لطف اندوزی کے ان لمحات کے دوران شاید ہی ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہو کہ ان جانوروں کو یہ کرتب اور ادائیں سکھانے کے لیے ان پر کیا کیا سختیاں کی گئیں ہیں۔ جب ایک ہاتھی باسکٹ بال کھیلتا ہے یا ایک چیتا سائیکل چلاتا ہے تو در حقیقت وہ بہ زبان حال ہمیں فریب دہی اور ظلم و ستم کی ایک داستان سناتا ہے۔ بانو کو بھی کچھ ایسی ہی کیفیات سے گزرنا پڑا تھا۔ آج سے دس برس پہلے' میں خود کو اس کے سامنے بونا محسوس کرتا تھا۔ اس کی تیزی و طراری سے عاجز تھا۔ اس کے حسین چہرے کو دیکھا کرتا تھا اور تنہائی میں بیٹھ کر خیالوں کا تانا بانا بنتا تھا مگر آج وقت بدل چکا تھا۔ وہ سکڑی سمٹی ڈری سہمی اور اندوہ کی صورت بنی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں مضبوط' طاقتور اور صاحب اختیار تھا۔ مجھے تیلا کہنے والی' خود خشک پتے کی طرح بے جان ہو گئی تھی۔ آج اسے میری مدد کی ضرورت تھی اور میں اس کی مدد کرنا بھی چاہتا تھا۔ میں اس کا خاموش پرستار تھا۔ اس کے بچپن کا ساتھی تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا.......... بہت کچھ کر سکتا تھا۔ شاید قدرت نے یہ سنہری موقع مجھے اسی لیے فراہم کیا تھا کہ میں بانو کی مدد کر کے بچپن کی حسین یادوں کو ایک خوب صورت انجام دے سکوں۔

میں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "بانو! میں تیری مدد کروں گا۔"

یکایک اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے اور اس کی سہمی آنکھیں' مجھے میرا وعدہ یاد دلانے لگیں۔ میں نے کہا۔ "دیکھو بانو! یہ دنیا ایک سمندر ہے ہم اس میں جو مچھلیاں دیکھتے ہیں ان میں کچھ چھوٹی ہوتی ہیں اور کچھ بڑی لیکن ہر مچھلی سے بڑی ایک مچھلی ہوتی ہے۔ مصدق بیگ بھی ایک بڑی مچھلی ہے لیکن اس سمندر میں ایسی مچھلیاں بھی ہیں جن کے سامنے اس مچھلی کی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں۔ لہٰذا یہ خیال ذہن سے نکال دو کہ مصدق ناقابل تسخیر یا ناقابل گرفت ہے۔"

بانو نے بے قراری سے میری طرف دیکھا۔ پھر روانی میں مجھے بچپن کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"تیلے! یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ خدا کی قسم تو مصدق کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو میرے بارے میں جانتی ہے کہ میں کون ہوں؟" وہ سوالیہ نظروں سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے نیا سگریٹ سلگایا اور کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "تو سمجھ لے کہ میں وہی بڑی مچھلی ہوں جو اس مچھلی کو نگل سکتی ہے جس نے تجھے نگلا ہے۔"

وہ سٹپٹا کر بولی۔ "تیلے، تو کیسی باتیں کر رہا ہے میں کچھ نہیں سمجھ پا رہی۔"

میں نے کہا۔ "بانو! میں پولیس انسپکٹر ہوں اور عنقریب ڈی ایس پی بننے والا ہوں۔ ان دنوں اس علاقے کے قاتل ڈاکو میرے نام سے کانپتے ہیں اور چور اچکے تو مجھے دیکھتے ہی آدھے مر جاتے ہیں۔ ان ساڑھے تین چار برسوں میں پلوں کے نیچے سے بہت سا گندہ پانی گزر چکا ہے۔"

بانو شدید حیرت میں ایک ٹک میری طرف دیکھتی چلی گئی۔ اس کی آنکھ میں مسرت کا ایک آنسو لرزا مگر ملائم رخسار پر پھسلنے سے پہلے ہی پتلی میں جذب ہو گیا۔ وہ کبھی میرے سادہ لباس کو دیکھتی اور کبھی میرے دعوے پر غور کرتی تھی۔ آخر وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"ہائے اللہ! وہ آنے والا ہو گا۔ چار روز سے پشاور گیا ہوا ہے۔ آج سات بجے اسے واپس آنا ہے۔" بانو کا اشارہ مصدق کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ "بانو! میں سب کچھ جانتا ہوں اور اسی لیے میں نے تمہیں کہا ہے کہ صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔"

بانو ہونقوں کی طرح میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ دھیرے دھیرے لرزنے لگے ہیں۔

☆------------☆------------☆

یہ اندرون پنڈی کے ایک تھانے میں ایس ایچ او انسپکٹر رمضان علی کے کمرے کا منظر تھا۔ کمرے میں ایک بغلی دروازہ تھا جو ایک دوسرے چھوٹے سے کمرے میں کھلتا تھا۔ اس کمرے میں بانو موجود تھی۔ دروازے پر چق پڑی تھی۔ اس کمرے سے بانو نہ صرف ایس ایچ او کے کمرے میں جھانک سکتی تھی بلکہ یہاں کی آوازیں بھی سن سکتی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے انسپکٹر رمضان نے مصدق بیگ کے گھر رنگ کیا تھا۔ حسب توقع وہ ابھی ابھی گھر پہنچا تھا اور آواز سے خاصا پریشان محسوس ہوتا تھا۔ غالباً یہ پریشانی بانو کی غیر موجودگی کے سبب تھی۔ انسپکٹر رمضان نے اس سے کہا تھا کہ وہ فوراً تھانے پہنچے، ایک اہم معاملہ درپیش ہے۔ مصدق نے معاملے کی نوعیت جاننے کی کوشش کی مگر انسپکٹر طرح دے گیا اور صرف یہ بتایا گیا کہ اس کا فوراً تھانے پہنچنا اس کے لیے سودمند ہو گا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد تھانے کے دروازے پر کار کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ وہی سرخ رنگ کی ٹویوٹا داخل ہو رہی تھی۔ جسے میں نے تین روز پہلے راجا بازار میں دیکھا تھا۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے بڑی بڑی مونچھوں والا ایک تیم شحیم شخص، سگریٹ پیتا ہوا بڑی تمکنت سے اترا۔ وہ چہرے ہی سے سخت گیر اور عیار لگتا تھا مگر اس کے چہرے پر کچھ پریشانی بھی تھی کمرے میں پہنچ کر اس نے صرف رمضان علی سے مصافحہ کیا اور بے تکلفی سے ایک نسبتاً آرام دہ کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں بدستور انسپکٹر رمضان کے چہرے پر جمی تھیں۔ رمضان نے کہا۔

"مصدق صاحب! آپ کے خلاف ایک شکایت آئی ہے۔"

مصدق نے بدتمیزی سے کہا۔ "رمضانی یار! مجھے پہیلیاں نہ بھجوایا کرو۔ سیدھی بات کر، کیا آفت ٹوٹی ہے۔"

رمضان بولا "معاملہ سنگین ہے مصدق صاحب' بانو نامی ایک لڑکی نے تھانے پہنچ کر آپ کے خلاف بیان دیا ہے اور بڑا سنگین بیان دیا ہے۔"

"یار' یہ کوئی طریقہ ہے بات کرنے کا۔"

رمضان نے روکھے لہجے میں کہا۔ "مصدق صاحب! یہ انسپکٹر شاہ زمان صاحب اپنے ہی آدمی ہیں۔ ان سے کوئی پردہ نہیں۔"

مصدق مجھے کچھ دیر گھورتے رہنے کے بعد رمضان سے بولا۔ "اس الو کی پٹھی کو میرے سامنے تولا۔ ابھی صحیح بیان دلواتا ہوں تجھے۔ پاگل کی بچی' گھر کے جھگڑوں کو تھانے میں طے کرانے نکلی ہے۔" اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے کامل یقین ہے' انسپکٹر رمضان اس کے حکم پر بانو کو اس کے سامنے لائے گا اور وہ اسے دو تین جھانپڑ مار کر مطلب کا بیان دینے پر آمادہ کر لے گا یا آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی ایسی دھمکی دے گا کہ وہ فرفر اس کی مرضی کے مطابق بولنے لگے گی۔ پھر وہ انسپکٹر رمضان سے گرمجوشی سے مصافحہ کر کے بانو کے ساتھ اپنی سرخ ٹویوٹا میں جا بیٹھے گا...... لیکن آج کیا ہونے والا تھا...... مصدق بیگ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ تقدیر اس کے گرد کیا جال بن چکی ہے اور وہ جرم کے راستے پر چلتے چلتے کس موڑ پر پہنچ چکا ہے۔ اس کی توقع کے بالکل برعکس انسپکٹر رمضان نے کہا۔

"لڑکی تو اب عدالت ہی میں آپ کے سامنے آئے گی۔"

عدالت کا لفظ مصدق کے سر پر ہتھوڑے کی طرح پڑا۔ اس کا بلڈاگ سا چہرہ اندرونی غضب کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔ وہ امپورٹڈ سگریٹ جوتے تلے مسلتا ہوا بولا۔

"کیا ارادے ہیں انسپکٹر رمضان علی پولیس لائن سے بڑے بیزار دکھائی دیتے ہو۔ کہیں کوئی پلازا تو نہیں کھڑا کر لیا۔"

میں نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "مصدق صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ ایک ایماندار پولیس ملازم کو دھمکیاں دینے کے بجائے اپنی عاقبت کی فکر کریں۔ مجھے آپ کی گلو خلاصی ہوتی نظر نہیں آتی۔"

میرے فقرے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ آگ بگولا ہو کر بولا۔ "اوئے رمضانی! اس منہ پھٹ کو بتایا نہیں' میں کون ہوں!"

میں نے اطمینان سے کہا۔ "رمضان کو بتانے کی ضرورت نہیں...... مجھے

معلوم ہے کہ تم چھٹے ہوئے بدمعاش اور پرانے اسمگلر ہو۔"

اسمگلر کے خطاب نے اسے ایک بار پھر جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ خوفناک نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا پھر اوپر نیچے سر ہلاتا ہوا بولا۔ "ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے تو کرو گرفتار مجھے۔ ڈال دو حوالات میں اور جوتی مار مار کر چمڑی ادھیڑ دو۔ میں بھی دیکھتا ہوں' تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" ایسے لہجے میں نہایت سنگین اور عبرت ناک قسم کی دھمکیاں پوشیدہ تھیں مگر میں اس کے لہجے کو خاطر میں لائے بغیر بولا۔

"حوالات میں تو آپ کو ڈالیں گے اور انشاء اللہ جوتے بھی اتنے ماریں گے جتنی آپ کو حسرت ہوگی لیکن اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم پر کوئی قیامت توڑ سکیں گے تو یہ خوش فہمی بھی صبح تک دور ہو جائے گی۔"

میرے تاؤ دلانے والے لہجے نے مصدق کو آپے سے باہر کر دیا۔ اس نے دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر اپنے بیوقوف ہونے کا ثبوت دیا اور مجھے ایک غلیظ گالی سے نوازتا ہوا بولا "لگتا ہے تیری ماں کی قسمت میں تیرا منہ دیکھنا نہیں رہا۔"

اس کی گالی کے جواب میں میرا زنانے دار تھپڑ اس کے بھاری گال پر پڑا اور وہ ایک لمحے کو چکرا کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ پھر وہ غضب سے پاگل ہو کر صوفے سے اٹھا اور مجھ پر جھپٹنے کے لیے آگے کو جھکا لیکن اسی وقت دو اے ایس آئی لپک کر اندر آئے اور انہوں نے انسپکٹر رمضان کے ساتھ مل کر اسے قابو میں کر لیا۔ وہ بری طرح اچھل رہا تھا اور حلق پھاڑ پھاڑ کر مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس کی بکواس کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک سب انسپکٹر کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا اور چند لمحے بعد اس کے ساتھ ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا ایک شخص دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں پولیس کی مختصر سی جمعیت بھی تھی۔ یہ سوٹ بوٹ اور چشمے والا ایک نفیس سا شخص تھا مگر اس وقت اس کی تمام نفاست حوالات کی خاک میں مل چکی تھی۔ عینک کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ چہرے پر نیلگوں گومڑ تھے اور سوٹ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ کسی چور کی طرح سر جھکائے شرمندہ اور پشیمان خاموش کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مصدق کا رنگ بدل گیا۔ عملے کی گرفت میں اس کی تمام جدوجہد یکدم ختم ہو گئی۔ وہ منہ کھولے ناقابل یقین نگاہوں سے عینک والے کو دیکھتا چلا گیا۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک لرزاں آواز نکلی۔

"سر آپ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

عینک والے کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ اس نے اپنی گردن اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا تو وہ جیسے آیا تھا اسی طرح عینک والے کو لے کر باہر نکل گیا۔ اب مصدق کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ پھولا ہوا سینہ اور تنے ہوئے بازو خود بخود ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں جو ظلم اور سفاکی کے کلف سے اکڑی ہوئی تھیں۔ اپنی اٹھان پر خود ہی شرمندہ ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو یا جلتے چولہے میں کسی نے بالٹی بھر پانی انڈیل دیا ہو۔ اچانک ہی مصدق نے نہایت ملائم اور خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"انسپکٹر صاحب! میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مصدق صاحب! آپ اسی گھن گرج سے گفتگو فرماتے تو زیادہ بہتر تھا۔"

جواب میں مصدق یکایک اپنی اصلیت پر آگیا...... معافیاں مانگنے لگا اور ڈھکے چھپے لفظوں میں منہ مانگی رشوت کی پیش کش کرنے لگا۔ اس دوران انسپکٹر رمضان، ملزم سے کنی کترا کر باہر نکل چکا تھا۔ میں نے عملے کو اشارہ کیا اور وہ اسے دھکیلتے کھینچتے اور مارتے ہوئے حوالات کی طرف لے گئے۔

☆------------☆------------☆

ضروری کاروائی کے بعد میں بانو کو مصدق بیگ (جس کا اصل نام کچھ اور تھا) کی حبس بیجا سے آزاد کرا کے لاہور لے آیا۔ یہاں میں سرکاری کوارٹر میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم تھا۔ بانو اپنے والدین اور بھائیوں سے ملنے کے لیے بے قرار تھی مگر میں جانتا تھا، اب اس گاؤں میں بانو کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس کے والد، چاچا فتو کا انتقال ہو چکا تھا اور ایک بھائی کو کوئی ہمدرد شخص اپنے ساتھ کویت لے گیا تھا۔ میں نے کوشش کی اور چند ہفتے بعد اس کی بوڑھی والدہ اور نیم پاگل بھائی کو لاہور لے آیا۔ اپنے بچھڑے ہوؤں سے مل کر بانو کے غموں کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ اس دوران اسے گواہیوں کے سلسلے میں کئی بار عدالتوں میں جانا پڑا۔ میں نے کسی موقعے پر اسے تنہائی یا بیچارگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ان دنوں وہ اکثر مجھ سے پوچھتی تھی کہ پنڈی کے تھانے میں کون شخص تھا جسے ہتھکڑیوں

میں جکڑا دیکھ کر مصدق بیگ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا اور معافیاں مانگنے لگا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ بھی ایک بڑی مچھلی تھی تو بانو بہت حیران ہوئی۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے اسے پوری تفصیل بتائی کہ کس طرح ہم نے لاہور کے مضافات سے اسمگلروں کے اس سرغنہ کو پکڑا تھا اور پھر گروہ کے ارکان اور مال کی برآمدگی کے لیے اسے پنڈی لے کر گئے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ مصدق بیگ جو اس کے لئے ایک خوفناک اور ناقابل تسخیر شخص تھا، درحقیقت اس گروہ کا ایک عام سا رکن تھا۔ ہم نے پنڈی سے ایسے ہی تین آدمیوں کو گرفتار کیا تھا۔ مصدق بیگ کی اصلیت پر شبہ مجھے اسی وقت ہو گیا تھا۔ جب میں نے اس کی کوٹھی کی نیم پلیٹ پڑھی تھی۔ یہ نام پولیس ریکارڈ میں بلیک لسٹ ہو چکا تھا۔ بعد میں سرغنہ کی نشاندہی نے تصدیق کر دی کہ یہ وہی مصدق بیگ ہے۔ اس اتفاق نے نہ صرف میری بھاگ دوڑ مختصر کر دی بلکہ بانو کی برآمدگی کو بھی سہل بنا دیا۔

☆------------☆------------☆

اب صورت حال یہ تھی کہ بانو کا مستقبل تاریک تھا۔ وہ خوبصورت اور جوان تھی۔ زندگی گزارنے کے لیے اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ کئی بار میں تنہائی میں بیٹھتا اور بانو کا ملیح چہرہ میری نگاہوں میں گھومتا تو وہ مجھے کیچڑ میں لتھڑا ہوا ایک پھول نظر آتی۔ کیچڑ نے اسے ڈھانپ رکھا تھا مگر اس کے رنگ اور خوشبو سے کوسوں دور تھا۔ ایسے میں میرے دل میں یہ خواہش جاگتی کہ کیوں نہ میں خود ہی اس سے شادی کر لوں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اپنی والدین کو منا سکتا تھا اور رہی میرے دل کی بات تو وہ آج بھی بانو کو گیارہ سال کی کھلنڈری لڑکی سمجھتا تھا اور اسے اس کے رخسار کی نرم تپش یاد تھی...... جہاں تک ڈاکٹر فاروق کا تعلق تھا۔ اس کا اب کچھ علم نہیں تھا۔ زمانہ ہوا، وہ ہمارا گاؤں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور میں یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس نے نہایت خاموشی سے گاؤں کیوں چھوڑا۔ ایک بار نامعلوم لوگوں کے ہاتھوں اغوا ہونے اور زک اٹھانے کے بعد وہ بار بار یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی تین جوان بہنیں تھیں جن کا وہ واحد کفیل تھا۔ اسے زندگی کی ضرورت تھی۔ اسی لیے وہ اس پر خطر منظر سے ہٹ گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اب میرے لیے بانو کے حصول میں کوئی دشواری نہیں تھی بلکہ یہ سب کچھ اخلاقی تقاضوں کے عین مطابق تھا مگر ایک احساس مجھے پیش قدمی سے روک رہا

تھا اور وہ یہ کہ بانو کی آنکھوں میں اب بھی ڈاکٹر فاروق کے نام کے دیے روشن تھے۔ میں نے سنسان دوپہروں اور سرمئی شاموں میں اسے دور کہیں بہت دور کھوئے ہوئے پایا تھا۔

اچانک ایک روز میں نے سارے کام پس پشت ڈال کر ڈاکٹر فاروق کو ڈھونڈ نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے دفتر سے لمبی چھٹی لی اور ڈاکٹر کا سراغ لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اس سلسلے میں میں نے بہت دوڑ دھوپ کی' اپنے تجربے اور تعلقات کو بھی استعمال کیا ور آخر............ بہار کی ایک چمکیلی شام میرے لیے کامیابی کا پیغام لائی۔ ایک ایسی ہی چمکیلی شام کو میں نے پہلی بار ڈاکٹر فاروق کی شکل دیکھی تھی اور آج پھر اسے ضلع بہاولنگر کے ایک دور دراز گاؤں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ کمزور پژمردہ دکھائی دیتا تھا مگر اس کے گرد پر امید چہروں والے مریضوں کا ہجوم تھا۔ وہ ان کے درمیان بیٹھا مسیحائی کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے بے حد تپاک اور حیرت سے ملا۔ اس کی چہرے پر کلہاڑی کا ایک پرانا گھاؤ تھا لیکن اس بدنمائی کے باوجود اس کی شخصیت کی اندرونی خوب صورتی عیاں تھی۔

شام کے کھانے کے بعد میں نے ڈاکٹر سے پہلا سوال یہی کیا۔ "ڈاکٹر فاروق! آپ کی شادی تو نہیں ہوئی؟"

"ہو چکی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"کس سے؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اس بیساکھی سے" اس نے اپنے پہلو میں رکھی بیساکھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میرے سینے سے اطمینان کی ایک طویل سانس نکلی۔ میں نے کھدر کے تکیے سے ٹیک لگائی اور لالٹین کی ہر دم گہری ہوتی روشنی میں ڈاکٹر فاروق کو اس لڑکی کی کہانی سنانے لگا جس نے محبت پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا اور جو دل کے چور دروازوں سے آج بھی کسی کی راہ تکنے پر مجبور تھی۔ جوں جوں کہانی آگے بڑھتی گئی ڈاکٹر فاروق کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں اور میرا یہ یقین گہرا ہوتا چلا گیا کہ میری سعی رائیگاں نہیں جائے گی۔

نصابِ وفا

آخرت کی "سزا جزا" کے علاوہ اس دنیا میں بھی مکافات کا نظام قائم ہے ہم غور کریں تو یہ "مکافاتِ عمل" ہمیں اپنے اردگرد روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ قدرت کے ہاتھ میں ایک انتہائی حساس ترازو ہے جس میں ہر خوشی کے بدلے ایک دکھ اور ہر دکھ کے بدلے ایک خوشی تول کر دی جاتی ہے۔
اس کہانی کا مرکزی کردار اس "ترازو" کی موجودگی پر کامل یقین رکھتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے حصے کے غم بڑی فراخ دلی سے جھیل رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے حصے کی خوشی اسے ملے گی۔

خوشی........ جو ایک "دلنواز محبوبہ" تھی۔

میری کہانی کا آغاز آج سے کوئی دس سال پہلے ہوا۔ شباب کا آغاز تھا اور بہار کا دن‘ وہ ایک چمکیلی دوپہر تھی جب میں نے اپنی زندگی کا پہلا محبت نامہ لکھا تھا اور نتائج سے بے پروا ہو کر کرن کے گھر پھینک دیا تھا۔ کرن اپنے نام ہی کی طرح چھریرے بدن کی ایک اجلی اور دلکش لڑکی تھی‘ ہماری بستی سے چند فرلانگ دور ایک فیشن ایبل آبادی میں رہتی تھی بہار کی اس چمکیلی دوپہر کو کرن کے گھر پھینکا ہوا میرا محبت نامہ ایک رومان پرور اور دلنشین دور کا نکتہ آغاز ثابت ہوا‘ وہ کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی میں بھی سال سوم میں تھا اکثر تو نہیں‘ کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی‘ کبھی بس اسٹاپ پر کبھی کالج کے راستے میں‘ کبھی کسی کیفے کے کیبن میں ہم ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے اور وقت کا بے رحم گھڑیال بج اٹھا‘ وہی گھڑیال جو صدیوں سے بجتا آیا ہے۔ جب کسی کا سر کسی کے شانے پر ڈھلکتا ہے........ جب بھی دو چاہنے والے کوئی حسین سپنا دیکھنے لگتے ہیں‘ یہ گھڑیال بج اٹھتا ہے‘ منادی کر دیتا ہے کہ خبردار‘ ہوشیار ہو جاؤ محبت کی جا رہی ہے۔ سیکڑوں زہریلی نگاہیں اور الزام تراش انگلیاں جاگ اٹھتی ہیں اور بدنصیب عاشقوں کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔

میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ کرن کی مالی حیثیت مجھ سے اچھی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا چچا بھی سخت گیری میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ کرن کے والدین بچپن میں فوت ہو گئے تھے اور اسے اس کے چچا نے پالا پوسا تھا۔ وہ علاقے کا ایک بااثر شخص تھا اور نہایت غصیلا بھی‘ بااثر لوگ عموماً باخبر بھی ہوتے ہیں‘ نتیجہ یہ ہوا کہ جونہی ہماری محبت خوشبو بن کر اڑی‘ سیدھی کرن کے چچا محترم کی ناک میں جا گھسی اور انہیں چونکہ "خوشبو" سے الرجی تھی‘ وہ خوفناک قسم کی چھینکیں مارنے لگے۔ ان دھواں دھار چھینکوں نے جہاں کرن کو سہما دیا وہاں میرے حوصلوں کو بھی پست کر دیا۔ ہجر کا ایک طویل موسم ہم

دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ کرن کو اب اس کا پندرہ سالہ چچا زاد بھائی کالج لے کر جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کا گھر سے نکلنا بے حد کم ہو گیا۔

ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اپنی والدہ ماجدہ سے گزارش احوال کی...... میرے اصرار پر انہوں نے ڈرتے ڈرتے میرے والد سے بات کی (والد صاحب ایک بیمہ کمپنی میں ہیڈ کلرک تھے) اگلے روز علی الصباح درس حدیث شریف دینے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور نہایت دھیمے لہجے میں انہوں نے بات کا آغاز کیا اور بتدریج اپنے جلالی موڈ کی طرف بڑھتے رہے۔ پندو نصائح کے اس طویل دورانیے کا اختتام ان گرجدار فقروں پر ہوا۔

"تو ایک دیوث انسان ہے‘ تجھ جیسے بیکار کو تو دھکے دے کر گھر سے نکال دینا چاہیے ناہنجار‘ لڑکیاں بھی کوئی گاجریں مولیاں ہوتی ہیں کہ گئے اور کھیت سے توڑ لائے۔ ابھی ٹھیک سے ناک صاف کرنا آتی نہیں اور چلا ہے نواب زادہ رشتے ڈھونڈنے........ ابھی تو ہے کیا؟ تیری اوقات کیا ہے؟" وغیرہ وغیرہ۔

میں حسب معمول کان لپیٹ کر باہر نکل آیا۔ سمجھدار نوجوان ایسے موقعوں پر ایسا ہی کیا کرتے ہیں........ شاید میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ میں فلسفے میں ایم اے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور بی اے میں فلسفہ ہی میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ دوسرا نمبر سائیکالوجی تھا۔ میرے انتخاب سے آپ کو میرے فطری رجحان کا کچھ اندازہ ہوا ہو گا۔ درحقیقت میں پیدائشی طور پر ایک تخیل پسند شخص ہوں اور غور و فکر میری گھٹی میں شامل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس غور و فکر کے سبب کبھی کبھار ہی کسی کار آمد نتیجے پر پہنچ پاتا ہوں۔ میں اسے سوچ کی ناکامی نہیں کہوں گا‘ ہاں اس خام خیالی کو ایک تدریجی عمل کہا جا سکتا ہے۔

عشق و محبت کا کاروبار سرد پڑا اور والد گرامی سے دھواں دھار پھٹکار سنی تو میرے اندر ایک عجیب سی ترنگ جاگ اٹھی۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا‘ کچھ ثابت کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ ان دنوں میرا ذہن گھڑدوڑ کا میدان بنا رہتا تھا۔ چھت پر لیٹا ہوں اور سوچ رہا ہوں‘ کبھی خیال آتا کہ فلسفہ اور سائیکالوجی پر لعنت بھیجوں اور کرکٹ کھیلنا شروع کر دوں۔ خوب محنت کر کے اس میدان میں نام کمانے کی کوشش کروں‘ تھوڑی ہی دیر بعد اس خیال کو رد کر دیتا اور اخبار لے کر بیٹھ جاتا انداز ایسا ہوتا کہ جیسے آج ہی پوری دنیا کے سیاسی حالات کو ازبر کر لوں گا اور کل سے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دوں گا........ بس ایسے ہی اوٹ پٹانگ خیالات پر سوچتے سوچتے ایک روز ذہن جوڈو کرانے

کی طرف مائل ہو گیا ان دنوں جگہ جگہ کراٹے کلب کھل چکے تھے اور نوجوانوں نے اس کھیل میں شوق ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔

اپنے ایک لنگوٹیے کے ہمراہ میں نے ایک اچھے کلب میں داخلہ لے لیا اور نہایت سنجیدگی سے تربیت لینا شروع کر دی۔ جوڈو کراٹے ایک صحت مندانہ کھیل ہے اور نوجوانوں کی فالتو توانائی کو خود میں جذب کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے......... چند مہینے کے اندر میں اپنے کلب کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہونے لگا۔ اس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی اور میں مزید لگن سے سیکھنے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ایک عقیدے پر پختہ یقین رکھتا تھا......... بلکہ اب بھی رکھتا ہوں، اس عقیدے کو انگلش زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ "نو پین......... نو گین" یعنی جب تک کوئی تکلیف نہ اٹھائی جائے خوشی یا کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور اس کے حق میں ہزاروں دلائل دیئے جا سکتے ہیں، لیکن میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اپنے مخصوص فلسفیانہ خیالات کے حوالے سے میرا ایمان تھا کہ انسان جو مشقت اٹھاتا ہے اس کا صلہ کسی نہ کسی شکل میں اسے ملنا ہوتا ہے اور مل کر رہتا ہے یہ قدرت کا اٹل اصول ہے اور اس سے انحراف ممکن نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ میں اپنے حصے کی تکلیفیں تو جھیلتا رہوں لیکن اپنے حصے کی خوشیاں قبول کرنے سے انکار کر دوں خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوں۔ صرف ایک شکل کو اپنے لیے قابل قبول رکھوں یعنی کرن کی شکل......... اس کی چاند جبیں کو اپنے پسینے کا نذرانہ پیش کروں، اس کے بدن کی ڈالی کو اپنے خون سے سینچوں اور اس کی مانگ میں ستارے بھرنے کے لیے اپنے جسم کو ہزار عذابوں سے گزار دوں......... انہی جذباتی سوچوں کے تحت میں نے کھیل کے میدان میں سخت محنت کی اور ملک کے صف اول کے کھلاڑیوں میں شامل ہو گیا۔ شوق اور شہرت کی حد تک تو یہ سب ٹھیک تھا، مگر معاشی نکتہ نظر سے دیکھا جاتا تو میں ابھی پہلی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ بہت تگ و دو کرتا تو اپنا چھوٹا موٹا کلب کھول کر بیٹھ جاتا یا سفارشیں وغیرہ لڑاتا اور جوتیاں گھستا تو کسی سرکاری محکمے میں کھیل کی بنیاد پر معمولی نوکری مل جاتی اور یہ میری منزل نہیں تھی۔ معمولی روزگار کا چراغ کرن کی متمول خان فیملی کی سورج کے سامنے کیا روشنی دیتا۔ اگر مجھے کرن کو جیتنا تھا تو اس کے لئے نمایاں کامیابیوں کی ضرورت تھی۔

دس پندرہ ہزار روپے ماہوار آمدنی والا کاروبار یا کوئی دھانسو قسم کی ملازمت اس کے علاوہ بینک بیلنس اور پلاٹس وغیرہ......... ایک ابھرتے ہوئے کراٹے کے کھلاڑی کے

لیے یہ سب کچھ ناممکن تھا۔ انہی دنوں ایک مخلص دوست نے مجھے مشورہ دیا کہ میں پانی سے کھیر پکانا چھوڑ دوں۔ جس طرح پانی سے کھیر نہیں پک سکتی اسی طرح جوڈو کراٹے اور اس جیسے دوسرے مشاغل کسی کو بڑا آدمی نہیں بنا سکتے پھر بھی اگر میں نے ارادہ کر ہی لیا ہے کہ اسی میدان میں قسمت آزمائی ہے تو پھر اس کے لیے کوئی طریقہ کار ڈھونڈوں۔ اس نے کہا میں جاپان چلا جاؤں، کسی اچھے کلب کا رکن بن کر وہاں سے بلیک بیلٹ لوں اور پاکستان آکر اپنا تربیتی ادارہ کھولوں وغیرہ وغیرہ۔

اس دوست کے دلائل خاصے وزنی تھے اور میں ان سے متاثر بھی ہوا۔ میرے والد، جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ ایک سرکاری ملازم ہیں، ان کے ایک دوست محکمہ سیاحت میں تھے، ان کے ذریعہ میں نے جاپان جانے کی تیاری شروع کر دی۔ دوست احباب میں مشہور ہو گیا کہ میں جاپان جا رہا ہوں۔ میں بھی ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا، میرے والد اور والدہ بھی جیسے تیسے راضی ہو گئے تھے۔ کرن کو الوداعی خط تک لکھا جا چکا تھا۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ کچھ دفتری رکاوٹیں سامنے آئیں، مالی مجبوری نے ان رکاوٹوں کو اور سنگین بنایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔

ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی، رات کی سیاہی پھیلتی ہے تو پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ مایوسی اور نامرادی کے انہی دنوں میں کرن کی ایک سہیلی کے ذریعے مجھے پتا چلا کہ ایک کھاتے پیتے کاروباری گھرانے میں کرن کی منگنی ہو رہی ہے اور ایک سال کے اندر شادی کا امکان ہے یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔

"نو پین......... نو گین، کہاں ہے اس مقولے کا نامعقول خالق؟" میرا ذہن چلا اٹھا، ان ڈھائی تین برسوں میں میں نے کس تکلیف سے آنکھ چرائی، کس مشقت کو گلے نہیں لگایا......... اور کرن کی آرزو، میں اس کے لمس کی چاہت میں تنہائی اور پیاس کے کیسے کیسے دشتوں سے نہیں گزرا کیا کچھ نہیں کیا میں نے اسے پانے کے لیے......... ناکامی کے احساس نے میرے ذہن میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ چند لمحوں کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے ضبط و تحمل کے تمام بند ٹوٹ جائیں گے، میں راستے سے بھٹک جاؤں گا، کسی اور ہی ڈگر پر چل نکلوں گا (مارشل آرٹ کے ناکام ہونے والے کھلاڑیوں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دنگا فساد اور مار پیٹ کی طرف مائل ہو کر جرائم کی راہ پر چل نکلتے ہیں) بہرحال ایک زبردست کشمکش کے بعد میں نے سیلف کنٹرول کا سہارا لیا اور اپنی بے

تاہیوں کو کم کرنے کے لیے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ شاید آپ اسے میرے پاگل پن سے تعبیر کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ محبت کی ناکامی کا خوف انسان کو سوختہ پا بنا کر اسکے ذہن میں وحشتیں بھر دیتا ہے' اس سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔

مجھے یاد ہے وہ دسمبر کے دن تھے میں راولپنڈی سے براستہ مری' نتھیا گلی چلا گیا' برف پڑی ہوئی تھی' شدید سردی کا آغاز ہو چکا تھا' کھلی ہوا میں پہنچتے ہی خون رگوں میں جمنے لگتا تھا میں نے نتھیا گلی کی ایک دکان سے چند ہفتوں کا سامان خورد و نوش لیا اور دو تھیلے کندھوں پر ڈال کر برف پوش پہاڑوں کی طرف نکل گیا ایک سیکنڈ ہینڈ سفری خیمہ میں راولپنڈی ہی سے لے گیا تھا۔ پہاڑوں پر جا کر کیا کروں گا' مجھے کچھ نہیں معلوم تھا' بس ذہن پر یہی خیال غالب تھا کہ مجھے اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچانی ہے........ اپنی جان پر زیادہ سے زیادہ سختی کرنی ہے ممکن ہے کسی پرانی دیکھی ہوئی مارشل آرٹ کی فلم یا ناول وغیرہ کا تصور ذہن میں ہو........ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میری مہم جوئی کا اصل محرک کیا تھا۔ میں ان برف پوش پہاڑوں میں چند ہفتے قیام کے لیے گیا تھا' مگر یہ قیام طویل ہوتا چلا گیا' اس دوران میں نے خون منجمد کرنے والی سردی میں جوڈو کراٹے کی انتہائی سخت مشقیں کیں اور دو تین بار ٹھیک ٹھاک بیمار بھی ہوا لیکن اپنی دھن میں لگا رہا۔ دو ڈھائی ماہ کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ میں صرف ایک انڈرویئر کے ساتھ خیمے سے نکل آتا اور ننگے پاؤں برف کے اوپر ورزش شروع کر دیتا' کئی بار خود کو برف کے گڑھے میں دفن کر دیتا اور سردی کی اذیت برداشت کرتا۔ کبھی جی میں آتا تو سخت بھوک کے باوجود فاقہ کشی شروع کر دیتا میری ڈاڑھی بڑھ چکی تھی اور بدن پر مہینوں کا میل کچیل جما تھا۔ پاؤں کے تلوے سردی سے پھٹ چکے تھے' در حقیقت میں یہاں آیا تو اس لیے تھا کہ جسم میں زیادہ سے زیادہ قوت مدافعت پیدا کروں اور خود کو کراٹے کے مقابلوں کے لیے ناقابل تسخیر بنا لوں لیکن بندہ سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ میں نے جب خود کو اذیتوں کے سپرد کیا تو ان میں ایک عجیب طرح کا مزہ آنے لگا۔ مین اپنے حال میں مگن ہوتا چلا گیا۔ یہ بات نہیں کہ کرن کی یاد میرے دل سے محو ہو رہی تھی یا میرے ہاتھوں نے اس کے گرم ریشم جیسے لمس کو ترسنا چھوڑ دیا تھا۔ نہیں بلکہ بات یہ تھی' میری طبیعت میں ایک عجیب طرح کا ٹھہراؤ آگیا تھا۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میری یہ جدوجہد رائیگاں نہیں جائے گی' مجھے اس کا صلہ مل کر رہے گا۔ میں آگے بڑھوں یا نہ بڑھوں' جستجو کروں یا نہ کروں' کرن مجھے ملے گی' میں اسے کھوؤں گا نہیں۔ یہ خیال غلط تھا یا صحیح' تاہم مجھے اس پر پختہ یقین تھا۔ پھر چار مہینے گزر گئے۔ موسم معتدل ہونے لگا' برف اونچی ویران چوٹیوں پر باقی رہ گئی لیکن میں خود کو اپنی مہم جوئی ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ ایک عجیب طرح کی آوارگی اور خود فراموشی دل میں راہ پا رہی تھی۔ اس "خود فراموشی کی انگلی تھام کر میں نے ان سنسان اور کم آباد پہاڑوں میں گھومنا جاری رکھا........ بہار گزر گئی' مختصر گرمیاں بھی اختتام کو پہنچیں........ اور تب ایک بار پھر ان سرد پہاڑوں پر سرما کے سائے پھیلنے لگے۔

وہ وسط جنوری کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات تھی۔ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی بستی کے مکان میں داخل ہوا۔ میرا حلیہ فقیروں جیسا ہو چکا تھا' لہٰذا راستے میں پڑنے والی بستیوں کے سیدھے سادے لوگ ہمہ وقت میری قدم بوسی کو تیار رہتے تھے بعض ضعیف العقیدہ دیہاتی لوگ مجھ سے بچوں کو دم کرواتے اور تعویذوں کی فرمائش داغتے تھے۔ اول اول مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگا لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ اس طرح میں دانستہ طور پر ان کی دل شکنی کر رہا ہوں تو میں ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔ اس راستے پر چلنے میں میرے لیے کچھ آسانیاں بھی تھیں۔ خوراک وغیرہ کا انتظام کسی دردسری کے بغیر ہو جاتا تھا اور رات دو رات گزارنے کے لیے ٹھکانا میسر آجاتا تھا۔ میرا اپنا خیمہ تو اب تار تار ہو چکا تھا' نقدی بھی قریباً برابر ہو گئی تھی' بھیک مانگنے کا یارا نہیں تھا' فقیر کے بھیس میں ان سب مشکلات کا حل نکل آتا تھا۔

اس روز میں کسی کشمیری کے اس چھوٹے سے مکان میں داخل ہوا تو صاحب خانہ نے بھاگم بھاگ مجھے خوش آمدید کہا' مکان کی ڈیوڑھی میں فوراً میرے لیے ایک گدیلا بچھا دیا گیا' گڑ کی ابلی ہوئی چائے اور رس میرے سامنے رکھ دیئے گئے۔ میرا ایک راہ چلتا عقیدت مند کچھ ہفتے پہلے مجھے ایک اونی گدڑی نذر کر چکا تھا' یہ گدڑی میرے سخت کوش جسم کے لئے کافی تھی لہٰذا جب ایک عورت اندر سے لحاف لے کر آئی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"لے لو پیر جی' آج بڑی سردی ہے۔" ایک کھنکتی ہوئی آواز نے مجھے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ میں چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور دیکھتا چلا گیا ایک نوخیز پہاڑی دوشیزہ میرے سامنے تھی۔ جیسے میلے بادلوں کی اوٹ میں چاند دمک رہا ہو وہ اپنے جسم کی اٹھان اور پیچ و خم سے بے پروا' بے تکلفی سے کھڑی تھی۔ ایک "پہنچے" ہوئے اللہ لوک کے سامنے تکلف بھی کیسا؟ لے لو پیر جی! آج تو برف بھی گرنے والی ہے۔" اس نے

مقامی لہجے اور دلنشین آواز میں اپنی پیشکش دہرائی۔ اس کے حسن نے میری آنکھوں میں آگ سی لگا دی۔ بے لگام سوچ کے پرندے جبر کا پنجرہ توڑ کر نکلے اور تصور کے پروں سے پرواز کرتے' کرن کے باغ حسن میں چہکنے لگے' اس کے ہونٹوں کے' نشیلی آنکھوں اور گداز جسم کے گیت گانے لگے............ الھڑ پہاڑن میری خاموشی کو بھی کوئی ادائے مستانہ سمجھی اور لحاف میرے قریب ڈھیر کر کے لچکتی لہراتی چلی گئی۔

میں اسی طرح اپنی سوچوں میں گم رہا۔ دل ہی دل میں میں حساب لگایا' ایک سال گزر چکا تھا۔ ایک سال کا خیال آتے ہی دل ڈولنے لگا اندازا" انہی دنوں میں اس کی شادی ہونا تھی' آہ............ برا وقت کتنی جلدی لپکتا ہوا آتا ہے............ شاید اس وقت کرن کے گھر ڈھولک پر تھاپ پڑ رہی ہو یا اس کے جہیز کے جوڑے ٹانکے جا رہے ہوں یا اس کی ڈولی اٹھائی جا رہی ہو کیا میری ساری ریاضت' ساری اذیت و مشقت رائیگاں جائے گی۔ دل میں آئی کہ اسی وقت اٹھ کر واپس روانہ ہو جاؤں لیکن ارادے کے باوجود میرے جسم میں جنبش نہیں ہوئی۔ اور پہلی دفعہ مجھے اس بات کا یقین ہوا کہ میں لوٹنے سے خوفزدہ ہوں' میں لاشعوری طور پر ان حالات کا سامنا کرنا نہیں چاہتا جو وہاں مجھے پیش آسکتے ہیں' شاید میرے یہاں آنے کی وجہ ہی یہی تھی میں گدڑی میں سر دیئے بیٹھا رہا............ سوچتا رہا اور اونگھتا رہا رات اندھیرے کی چادر لپیٹے' سکڑی سمٹی اپنے طویل راستے پر گامزن رہی............ نجانے وہ کون سا پہر تھا' جب کسی کمرے کا دروازہ چرچرایا اور کوئی دبے پاؤں چلتا میری طرف بڑھا۔ میں نے سوچا شاید گھر کا مالک ہے' جاننے نکلا ہے کہ "پیر جی" کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں مگر جب آنے والا قریب پہنچا تو مجھے شبہ سا ہوا یہ کسی لڑکی کا سایہ تھا' غالباً وہی لڑکی جس نے چند گھنٹے پہلے مجھے لحاف لا کر دیا تھا۔ وہ اور نزدیک آئی تو میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ ننگے پاؤں تھی' اس کے بال کھلے تھے اور اوڑھنی کندھے پر اس طرح لٹکی ہوئی تھی کہ پاؤں میں الجھ رہی تھی۔ ڈیوڑھی کے طاقدان میں مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اس کی روشنی میں وہ مجھے کسی قدیم عمارت کی دیوار میں کندہ شبیہہ کی طرح دکھائی دی۔ اس کے جوان جسم پر لباس کی ہر سلوٹ قیامت خیز ہو گئی تھی۔ تب میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور چونک اٹھا' وہ آنکھیں عجیب بے باکی سے میری طرف دیکھ رہی تھیں' میرے بالکل قریب پہنچ کر وہ آہستگی سے بیٹھی' کچھ دیر خاموشی سے انگیٹھی کے ادھ بجھے انگاروں کو تکتی رہی پھر اس کی نگاہیں قریب کے لحاف پر گئیں اس نے لحاف اٹھایا اور اسے اچھی طرح لپیٹ کر میرے بالکل پاس سو گئی۔ "یا الہٰی یہ کیا ماجرا ہے؟" میں

بے پناہ حیرت کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ وہ اب بے خبر سو رہی تھی' دیئے کی روشنی اس کے حسین چہرے پر منعکس ہو رہی تھی' اس کے سانسوں کا لمس برچھی کی طرح میری داہنی کلائی پر چل رہا تھا۔

ہر بندے کے اندر ایک اور بندہ چھپا رہتا ہے۔ مجھے خوف آنے لگا' اس شب کی تنہائی میں کہیں وہ ہم نفس بیدار نہ ہو جائے' میں نے آج تک اسے نہایت کٹھن حالات میں بھی سلائے رکھا تھا۔ اس ویرانے میں آنے سے پہلے جب میں ایک معروف کھلاڑی بننے کا خواب دیکھ رہا تھا' کئی خوبصورت آنکھوں نے میرے کسرتی جسم کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا تھا' کئی نسوانی مسکراہٹیں میرے راستوں میں چمکتی تھیں۔ لیکن میں خود پر مسرت کا ہر دروازہ بند کر چکا تھا' ان ویرانوں میں داخل ہونے کے بعد بھی گاہے بگاہے پہاڑی بستیوں میں معصوم حسن کی دلکشی میری پارسائی کو للکارتی رہی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی بستی کی عقیدت مند عورتیں مجھے گھیر لیتیں تھیں۔ وہ خود ہی مجھے پیر تصور کرتیں اور خود ہی یقین کر لیتی تھیں کہ میں انتہا درجے کا پارسا اور نیک فرشتہ ہوں حالانکہ میں انسان تھا' رگوں میں جوان خون تھا۔ صنف مخالف کی قربت اور کشش مجھے سخت امتحانوں سے گزارتی تھی تاہم میں ہر امتحان میں سرخرو ہوا تھا' میں نے مشقتوں کو غارت کرنے والا وہ در کبھی نہیں کھولا تھا جس پر کرن کے نام کی کنڈی چڑھی ہوئی تھی مگر............ آج اس شب اور اس تنہائی میں ایک سراپا قیامت' مجسم امتحان بن کر میرے پہلو سے آلگی تھی۔ میں چور نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور دل کے بے قابو گھوڑے پر کاٹھی ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ نجانے کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی پھر وہ لحاف کے نیچے کسمسائی' اپنی جگہ سے اٹھی اور مجھے دیکھے بغیر جیسے آئی تھی ویسے ہی بے آواز چلتی واپس لوٹ گئی۔

اگلے روز میرے میزبان نے میرے سامنے نمک والی روٹی اور چائے کا پیالہ رکھا تو میں نے گھمبیر آواز میں پوچھا "تیرا نام؟"

"مردان خان............ پیر جی۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

"کیا کرتا ہے؟"

"جی نیچے وادی میں چھوٹی سے کھیتی ہے۔"

"کوئی پریشانی؟"

"پریشانیاں تو لاکھوں ہیں جی............ لیکن پیر جی............ ایک دعا خاص طور پر

کروائی ہے' آپ سے۔"

"ہاں کہو۔"

"میری بیٹی کو نیند میں چلنے کا مرض ہے جی' بڑی پریشانی رہتی ہے۔ کچھ کریں جی۔"

اب رات کا واقعہ پوری طرح میری سمجھ میں آرہا تھا۔ لڑکی خواب کی حالت میں میرے پاس آئی تھی۔ مردان خان مجھ سے اصرار کرنے لگا کہ میں لڑکی کے لیے ضرور کچھ کروں۔ میں حسب عادت دیر تک کہتا رہا "بھلے مانس میرے پاس کچھ نہیں' میں گناہگار بندہ ہوں.......... مجھے خود دعاؤں کی ضرورت ہے۔" میں جتنا انکسار دکھا رہا تھا وہ نیاز مندی سے اتنا ہی دہرا ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میں نے ایک کاغذ پر چند الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر اسے دے دیں۔ اس کے علاوہ میں نے باتوں باتوں میں مردان خان پر یہ عندیہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں مزید چند روز اس کی ڈیوڑھی میں قیام کروں گا۔ دراصل برف باری کی وجہ سے موسم بہت سخت ہو رہا تھا' میں چند روز کسی ایک چھت کے نیچے گزارنا چاہتا تھا۔ مردان خان بیچارہ غریب تھا اور زبردست پیر پرست تھا۔ میرے قیام کا سن کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ اپنی خوش بختی پر ناز کرنے لگا۔

مردان خان کی ڈیوڑھی میں رہتے ہوئے مجھے ساتواں آٹھواں روز تھا' ایک دن مردان خان کا چھوٹا بیٹا میرے لیے گرم پکوڑے لے کر آیا۔ یہ پکوڑے جو ایک اخباری کاغذ میں تھے اس نے حسب دستور میرے سامنے گدیلے پر رکھ دیئے۔ خستہ پکوڑوں کی خوشبو ناک میں گھسی تو میرا ہاتھ خود بخود ان کی طرف بڑھ گیا لیکن اچانک مجھے ٹھٹک جانا پڑا' ساعت کے ہزارویں حصے میں تمام حسیات آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ میں اخباری کاغذ کے ٹکڑے کی طرف جھکتا چلا گیا۔ دل سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکلنے کو تھا لرزاں انگلیوں سے میں نے پکوڑے الٹ کر کاغذ کھینچا اور اسے آنکھوں کے عین سامنے رکھ کر دیکھنے لگا۔ کتنا دلدوز نظارہ تھا وہ' میرے سامنے کرن دلہن بنی اپنے دولہا کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ نیچے کیپشن میں دولہا اور دلہن کے نام لکھے تھے اور بتایا گیا تھا کہ پچھلی جمعرات کو ان کی شادی انٹر کان کے سبزہ زار میں بخیر و خوبی انجام پائی۔

آہ! میری قسمت میں یہ کیا منظر دیکھنا تھا۔ کیا تھا اگر وہ لڑکا پکوڑے لے کر نہ آتا! کیا تھا کہ اگر میں ان کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتا.......... مگر ہونے والی بات ہو چکی تھی' میں اپنی حیات کی خوفناک ترین خبر سے آگاہ ہو چکا تھا.......... مجھے نہیں معلوم کہ میں کب

تک اخبار کا ٹکڑا ہاتھ میں تھامے سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا' شاید چند گھنٹے.......... شاید ساری رات' شاید دو راتیں' میری آنکھوں سے یادوں کے جنازے گزرتے رہے اور جگر کا خون پانی ہو کر رخساروں اور گردن پر ڈھلکتا رہا۔ میری موہوم ترین امیدیں بھی دم توڑ چکی تھیں' نرم حرارت کے خواب چکنا چور ہو چکے تھے اور برف کی طرح سخت اور اٹل حقیقت سامنے تھی۔ اخبار کی ایک خبر میں چھ جنوری کی تاریخ میرا منہ چڑھا رہی تھی۔ یعنی میرے خدشوں کے عین مطابق کوئی دو ہفتے قبل کرن شنزاد کی شادی ہو چکی تھی۔
.... جس شاخ پر میری مشقتوں کا آشیانہ تھا۔ وہ شاخ ہی کٹ گئی تھی۔ میں تنکا تنکا ہو کر بکھرنے لگا ٹوٹے پھوٹے مایوس انسان کے ملبے سے ایک اور شخص جھانکنے لگا۔ وہ جو ایک مدت سے دنیاوی لذتوں سے دور تھا' ان عذاب ناک لمحوں میں نہ جانے کہاں سے میرے اندر ایک خواہش جاگ اٹھی۔ میں سوچنے لگا' کاش پھر کسی شب مردان خان کی بیٹی نیند میں چلتی ہوئی آئے اور میرے پہلو میں آن لیٹے' پچھتاوے کے دیو میرے اندر اودھم مچانے لگے۔ مجھے یاد آنے لگا کہ میں ایک سراب کے تعاقب میں کیسے کیسے ٹھنڈے میٹھے چشموں کو نظرانداز کر چکا ہوں۔

میں کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنے دل کی واردات آپ کو سنا رہا ہوں۔ پچھلے کئی سالوں کی ریاضت کے بعد میرے نفس امارہ کا وہ شدید ترین حملہ تھا۔ اندرون جسم عجیب ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی تھی۔ میں مردان خان کی ڈیوڑھی میں ہر شب لاشعوری طور پر اس آفت جاں کا انتظار کرنے لگا مجھے اپنے تعویذوں کی "کارکردگی" پر پورا بھروسا تھا۔ ان تعویذوں سے مریضہ کو بھلا کیا افاقہ ہوتا! مجھے پوری امید تھی کہ وہ پھر کسی دن خواب کی حالت میں چلتی ہوئی میرے پاس آجائے گی۔ ہر رات میری نگاہیں غیرارادی طور پر اس دروازے کی جانب لگی رہتیں جو اس شب چرچرایا تھا اور ایک حسن بلا خیز لڑکھڑاتا ہوا میرے سامنے آگیا تھا.......... اور بالآخر پانچویں یا چھٹی شب وہ واقعہ رونما ہوا جس کے انتظار میں میں پل پل گھل رہا تھا۔ نصف شب کے بعد کا وقت تھا' یخ بستہ ہوا گھر کے کونے کھدروں میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک سایہ سا صحن میں نظر آیا۔ اس کی پہلی جھلک نے مجھے سمجھا دیا کہ یہ مردان خان کی لڑکی ہے اور حالت خواب میں باہر نکلی ہے۔ میرے اندر کا شیطان چوکس ہو کر بیٹھ گیا لڑکی حسب معمول بہ آہستگی چلتی میرے پاس سے گزر کر بیرونی دروازے تک گئی' پہلے ہاتھوں سے اس کی کنڈی کھولنے کی کوشش کرتی رہی' کنڈی میں چونکہ قفل تھا اس لئے اسے کامیابی نہیں ہوئی'

کسی الیکٹرانک ڈوائے کی طرح وہ واپس مڑی اور حسب سابق میرے پہلو میں گدڑی اوڑھ کر سو گئی۔ شاید قارئین میری اس وقت کی دلی حالت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا مختصراً یہ سمجھ لیں کہ یخ بستہ تنہائی' حسن کی حرارت اور برسوں کی نا آسودگی نے باہم مل کر ایسی ناقابل برداشت صورت حال پیدا کر دی تھی کہ میں چند لمحوں کے اندر ہزار امتحانوں سے گزر گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بدخواہ نے ایک زاہد خشک کی توبہ شکنی کے لیے بطور خاص اہتمام کیا ہے اور فرار کا کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا' گردوپیش میں ہر ذی روح محو خواب' حسن اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ایک فٹ کی دوری پر بے سدھ' بے ترتیب بے خبر۔ اس لمحے اور اس مقام پر کچھ بھی ہو سکتا تھا.......... اور اس کے بعد میں اطمینان سے گدڑی سنبھال کر اور دیوار پھلانگ کر پہاڑی بھول بھلیوں میں گم ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ناقابل برداشت آسانیاں نظر آ رہی تھیں.......... میرے لرزاں ہاتھ باغ جوانی کی خوشہ چینی کے لیے آگے بڑھے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے مٹھیاں بھینچیں اور انہیں بے دریغ دیوار پر مارنا شروع کر دیا۔ نہایت دیوانگی سے میں دیوار پر مکے رسید کرتا رہا یہاں تک کہ کھال چھل گئی اور خون کہنیوں تک بہہ نکلا۔

جب تسخیر نفس کا مشکل ترین کام ہو چکا تو میں نے لڑکی کا شانہ جھنجھوڑ کر اسے گہری نیند سے جگایا اور جب وہ جاگ کر حیران اور پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگی تو اسے کمرے میں جانے کی ہدایت کی۔ اسی وقت ایک اندرونی دروازہ کھلا اور مردان خان تیز قدموں سے چلتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے جلدی سے اپنے زخمی ہاتھ چھپا لیے۔ شاید میرے مکوں کی دھم دھم نے اسے جگا دیا تھا تاہم اس کا حد سے بڑھا ہوا اظہار عقیدت مجھے ایک اور شبہے میں ڈال رہا تھا۔ غالباً لڑکی کے باہر آنے کے ساتھ ہی وہ بھی جاگ گیا تھا اور دروازے کی اوٹ سے میری حرکات ملاحظہ کرتا رہا تھا..........

اگلے روز دوپہر تک میرا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ مردان خان رات والے واقعہ سے آگاہ تھا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے اس حوالے سے بستی میں میری پارسائی کا خوب ڈھنڈورا پیٹا' کچھ لوگوں کے دل میں میرے پیر کامل ہونے میں اگر کوئی شبہ تھا تو وہ بھی دور ہو گیا۔ اردگرد کی کئی بستیوں میں بھی اس واقعہ کا چرچا ہوا اور لوگ جوق در جوق مجھے دیکھنے اور "نیاز" حاصل کرنے آنے لگے۔ یہ سلسلہ' ایک بار شروع ہوا تو طویل ہوتا چلا گیا' دو تین ہفتوں میں اردگرد کی کئی بستیوں میں میری شہرت پہنچ چکی تھی۔ میں بہت

کہتا کہ میں پیر فقیر کچھ نہیں' اچھا بھلا شیطان آدمی ہوں' لیکن لوگ کب چھوڑتے ہیں.......... ایک دوبار میں نے وہاں سے نکل بھاگنے کا بھی سوچا لیکن برف باری اور راستوں کی دشواری کا خیال کر کے عملی قدم نہیں اٹھایا۔

O-------------☆-------------O

ایک روز دوپہر کے وقت ایک ادھیڑ عمر عورت کہیں دور سے سفر کرتی ہوئی مجھ سے ملنے پہنچی۔ وہ تھی تو مقامی لیکن لباس اور اطوار سے دیہاتن نہیں لگتی تھی۔ ہاتھ میں طلائی چوڑیاں اور انگوٹھیاں اس کی امارت ظاہر کرتی تھیں' دوسرے عقیدت مندوں کی طرح وہ بھی اپنا ایک دکھڑا لے کر آئی تھی۔ تنہائی میں اس نے فریاد کی کہ اس کے بیٹے کی شادی کو ایک سال ہو چکا ہے لیکن بچے کی امید نہیں بندھی' اس سلسلے میں اسے کوئی "انسٹنٹ" قسم کا نقش درکار تھا۔ مجھے عورت میں کچھ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی' مخصوص درویشانہ انداز میں میں نے پوچھا۔

"مائی! کہاں سے آئی ہے؟"

اس نے ایبٹ آباد کے ایک مضافاتی علاقے کا نام لے کر بتایا کہ وہاں ان کی زمینیں وغیرہ ہیں۔ یہ جگہ وہاں سے کوئی بیس میل مشرق کی سمت تھی۔ عورت پہاڑی رستے سے آئی تھی جو سڑک کی نسبت بہت مختصر تھا۔ عورت کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا بیٹا پڑھا لکھا ہے اور زمینداری کے علاوہ اپنے جنگلات سے بھی اسے کافی آمدنی ہے۔ عورت نے بتایا کہ وہ اپنی بہو کو بھی ساتھ لائی ہے اور اگر میری اجازت ہو تو وہ اسے اندر بلا لے۔ میں نے اجازت دے دی تو ایک سرو قد لڑکی کریم کلر چادر میں لپٹی' ٹھٹکتی جھجکتی اندر آ گئی۔ اس نے آدھا گھونگٹ نکال رکھا تھا اور خوبصورت پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں کچھ دیر اسے محویت سے دیکھتا رہا۔ میں منتظر تھا کہ شاید وہ اپنی پلکیں اٹھائے۔ اور میں اس کی حسین آنکھوں میں جھانک سکوں لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ میں عورتوں کے ساتھ ایک چق کی اوٹ سے بات کرتا تھا۔ اسی چق میں سے مجھے تو سب کچھ نظر آتا تھا لیکن عورتیں بغور دیکھنے پر ہی میری صورت سے آشنا ہو سکتی تھیں۔

میں اس لڑکی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کون تھی یہ میں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا.......... میں نے منہ میں کچھ بدبدا کر اس پر پھونکا اور باہر بھیج دیا۔ تب میں کچھ دیر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا ادھیڑ عمر عورت فرط احترام سے پتھر کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ میرا مراقبہ طویل ہو گیا تو عاجزی سے بولی۔ "سرکار کوئی تعویذ لکھ دیں' میرے بچے

کی خوشیاں پوری ہو جائیں۔"

میں نے سر اٹھایا اور گھمبیر لہجے میں پوچھا۔ "مائی، تعویذ چاہیے یا فائدہ؟"

وہ گڑگڑا کر بولی۔ "فائدہ.......... میرے سرکار.......... فائدہ!"

میں نے کہا۔ "تو پھر.......... مجھے تیرے ساتھ چلنا ہو گا۔ یہ کام اتنی جلدی ہونے والا نہیں۔ کم از کم آٹھ دس روز لگیں گے۔"

عورت کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

"میرے اتنے بخت کہ آپ میرے ساتھ چلیں! میں نے تو سوچا بھی نہ تھا' مجھے اور کیا چاہئے سرکار' حکم دیجئے کب چلنا ہے؟"

میں نے کہا "جب فیصلہ ہو گیا تو پھر ابھی چلیں گے' فقیروں کی کوئی تیاری نہیں ہوتی۔" میں نے گدڑی اٹھائی جھولا جھاڑ کر کندھے سے لٹکایا اور لٹھ نما عصا تھام کر تیار ہو گیا۔ میں باہر نکلا تو عقیدت مندوں نے گھیر لیا' وہ میری روانگی پر حیران و پریشان تھے۔ کئی جوشیلے مریدوں نے میری ٹانگوں سے لپٹنے کی کوشش کی۔ میں نے چیڑ کے ڈنڈے سے ٹھوکے دے دے کر انہیں پیچھے ہٹایا۔ ایک آدھ کو ڈنڈا رسید بھی کرنا پڑا۔ مردان خان نے دست بستہ کہا۔

"سرکار' کیوں چھوڑ رہے ہیں مجھ بد قسمت کو؟"

میں نے کہا۔ "مردان' ہم جیسوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا' چل ہٹ آگے سے۔"

وہ بولا۔ "میں جانتا ہوں سرکار' آپ کو یہ بھیڑ بھاڑ اچھی نہیں لگی' میں ابھی سب کو ڈنڈے مار مار کر یہاں سے بھگا دیتا ہوں۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا.......... آپ یہاں سے نہ جایئے۔"

میں نے میلی کچیلی غضبناک آنکھوں سے اسے گھورا تو وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا.......... کچھ ہی دیر بعد میں ادھیڑ عمر عورت' اس کی بہو اور ملازم کے ساتھ خچر پر سوار مشرق کی طرف محو سفر تھا' بستی دم بدم پیچھے رہتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ دست غیبی کس طرح ہمیں ان دیکھے راستوں کی طرف دھکیلتا رہتا ہے۔ کہاں کرن کی گلی اور کہاں یہ برف پوش وادیاں' کہاں فلسفہ اور کہاں جوڈو کراٹے' کہاں پیری فقیری اور کہاں میں۔ جیسے دن میں سے رات پھوٹتی ہے اور غلاظت میں سے پھول برآمد ہوتا ہے' اسی طرح شمال کے راستوں سے جنوبی منازل کی راہیں پھوٹ نکلتی ہیں اور مغرب کی طرف جانے والا مشرق سے نمودار ہو سکتا ہے۔ ہاں' ایک بات ہے' توانائی کبھی فنا نہیں

ہوتی.......... اور اعمال کبھی ضائع نہیں ہوتے۔

سردی اپنے عروج پر تھی' ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی وہ ایبٹ آباد کے نواح میں ملک پوری پہاڑ کا دامنی علاقہ تھا۔ آرام دہ کمرے میں آتشدان دہک رہا تھا اور میں بڑی شان سے گھٹنوں پر کامدار کشمیری شال ڈالے صوفے پر بیٹھا تھا۔ (میرے زخمی ہاتھ اب قریباً ٹھیک ہو چکے تھے) میرے سامنے جو شخص تھا اس کا نام رحمت خان تھا۔ وہ مجھے یہاں لانے والی عورت کا بیٹا تھا۔ عمر چوبیس پچیس سال رہی ہو گی۔ سرخ و سپید رنگ' تیکھے نقوش اور مضبوط جسم' اسے دیکھتے ہی فلموں کے رومانی ہیرو کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ نجانے کیوں اسے دیکھتے ہی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ میری ہی طرح کوئی عاشق دل فگار ہے۔ کسی نے درست کہا ہے' ایک روگی دوسرے کو پہچان لیتا ہے۔ رحمت خان سے اب تک میری جو گفتگو ہوئی تھی اس سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایک شائستہ اور روشن خیال آدمی ہے۔ وہ سینٹ ڈینیز اسکول اور لارنس کالج مری کا تعلیم یافتہ تھا' زمینداری اور لکڑی کے کام کو جدید خطوط پر چلا رہا تھا۔ اس کی یہ رہائش گاہ برف پوش پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک بستی میں تھی مگر اس نے ہر شہری سہولت یہاں فراہم کر رکھی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے کہنے پر میرے پاس مہمان خانے میں آیا تھا۔ اول اول تو اس نے مجھ سے ایک طرح کی بیزاری کا اظہار کیا مگر جب اسے اندازہ ہوا کہ میں روایتی پیروں فقیروں سے مختلف ہوں تو وہ دلچسپی سے گفتگو کرنے لگا۔

رحمت خان سے میری یہ پہلی ملاقات خاصی طویل اور حوصلہ افزا رہی۔ میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بظاہر یہ صحت مند اور مطمئن جوڑا اولاد کی نعمت سے محروم کیوں ہے۔ باتوں باتوں میں میں نے رحمت خان کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کی تو وہ بری طرح بدک گیا۔ اس کے انداز نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ اس موضوع پر کوئی گفتگو پسند نہیں کرے گا.......... تاہم اس کا یہ گریز تادیر برقرار نہیں رہ سکا۔ میری آمد کے ٹھیک چوتھے روز اسی کمرے اور اسی آتشدان کے سامنے ویسی ہی برفانی رات میں بیٹھے ہوئے اس نے دھیرے دھیرے اس راز پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔ اس وقت تک وہ مجھ سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا اور شاید ذہنی طور پر مجھ سے کچھ مرعوب بھی تھا۔ اس نے کہا۔

"پیر صاحب' جو بات میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں وہ اب تک کسی کو نہیں بتائی' حتیٰ کہ میرے قریب ترین دوستوں کو بھی معلوم نہیں۔ یہ آپ کی ذات کا سحر ہے کہ میں زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا ہوں.......... پیر صاحب' میں ایک نظریاتی آدمی ہوں' رسم و

رواج اور سماج کی لگائی ہوئی پابندیوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اپنی والدہ کے بے پناہ اصرار پر میں نے شادی ضرور کر لی ہے لیکن اپنی بیوی سے کبھی میرے ازدواجی تعلقات نہیں رہے.........."

رسمت کے انکشاف نے مجھے حیران کر دیا۔ میرے اوٹنگے بوٹنگے تعویذ تو درکنار' امریکا کے طبی ماہر بھی سردست مسز رسمت خان کی گود ہری نہ کر سکتے تھے' میں نے اپنی حیرانی پر قابو پا کر پوچھا۔

"لیکن کیوں؟"

رسمت نے ایک طویل اور گہری سانس لی' اپنے سامنے آتشدان کے شعلوں کو گھور کر تھری کیسل سگریٹ کا کش لیا اور بولا۔ "پیر صاحب' مجھے ایک لڑکی سے بے پناہ محبت تھی اس کا نام درخو تھا' وہ چندال قبیلے کے سردار باز خان کی اکلوتی لڑکی ہے۔ وہ یہاں سے چار پانچ میل دور مشرق کی طرف ترائی میں رہتے ہیں۔ آبی نالے کے پار کی ساری زمنیں ان کی ہیں۔ ہماری پہلی ملاقات آج سے کوئی چار برس پہلے ہوئی تھی۔ میں ایک دوست کی برات کے ساتھ باز خان کے گاؤں گیا تھا۔ یہاں ہمارے ہاں ایک رسم نن کہلاتی ہے' اس رسم کے مطابق لڑکی والے براتیوں پر کوئی شرط عائد کر دیتے ہیں کہ یوں کرو گے تو برات آگے بڑھنے دیں گے' کبھی نشانے بازی کا امتحان لیا جاتا ہے اور کبھی ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر دی جاتی ہے۔ اس برات کے راستے میں گاؤں والوں نے ایک تناور درخت کاٹ کر ڈال دیا تھا اور کہا تھا کہ برات میں سے کوئی اکیلا شخص اس درخت کو ہٹائے گا تو برات کو گاؤں میں داخل ہونے دیا جائے گا۔ میں نے زور لگا کر اس درخت کو ہٹایا تھا' اس روز پہلی بار میں نے درخو کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ ایک چھت پر سہیلیوں کے ساتھ کھڑی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس کی یہ مسکراہٹ میرے دل کا روگ بن گئی.......... اور میرے دل کا روگ اس کے دل کا روگ بن گیا۔

اس خوبصورت علاقے کی بھول بھلیوں میں ہماری محبت جوان ہونے لگی۔ ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور ایک دوسرے کے لیے سب کچھ قربان کرنے کا عہد کر لیا' میرے والد مرحوم پر میرا یہ راز کھل چکا تھا' وہ سمجھتے تھے میں آگ سے کھیل رہا ہوں..........اور جب بھی سردار باز خان کو اس چکر کا پتا چلا' وہ ایک مصیبت کھڑی کر دے گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ایک وقت آیا کہ درخو کے اہل خانہ حقیقت حال سے آگاہ ہو گئے۔ تاہم سردار باز خان نے کوئی شدید رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ویسے بھی وہ ایک پڑھا لکھا

روشن خیال شخص ہے۔ اس نے والد مرحوم کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور عندیہ ظاہر کیا کہ وہ بچوں کی خواہشات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رشتہ کر سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اب والد صاحب فوراً حامی بھر لیں گے' یہ رشتہ ہر لحاظ سے ہمارے لائق تھا مگر اس وقت مجھے سخت کوفت ہوئی جب انہوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ سردار باز کی بٹی سے تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو اور وہ اس معیار پر پوری نہیں اترتی' فی الحال تم اپنی تعلیم پر توجہ دو اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو والد صاحب کے رویے نے مجھے اس قدر دل برداشتہ کیا کہ میں لارنس کالج میں پڑھائی ادھوری چھوڑ کر ایک دوست کے ساتھ تفریحی سفر پر بیرون ملک نکل گیا۔ کوئی چھ ماہ ہم یورپ کے مختلف ملکوں میں گھومتے رہے' اس دوران مجھے یہ جانکاہ خبر ملی کہ ٹریفک کے ایک حادثے میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے.......... میں فوری طور پر وطن واپس پہنچا' نتھیا گلی سے ایبٹ آباد جاتے ہوئے والد صاحب کی ٹویوٹا جیپ ایک گہری کھائی میں گر کر نذر آتش ہو گئی تھی والد صاحب کے علاوہ ان کا ڈرائیور بھی حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔

اس حادثے نے کئی ماہ تک میرے حواس کو معطل رکھا۔ آخر دھیرے دھیرے مجھے کاروبار زندگی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مجھے لاابالی پن اور بے پروائی کا چلن چھوڑ کر ذمے داری کا بار گراں کاندھوں پر اٹھانا پڑا۔ تین چار ماہ کی سخت محنت کے بعد میں نے اپنے تباہ حال کاروبار کو سنبھالا دیا۔ زندگی کچھ معمول پر آئی تو دھیان خود بخود درخو کی طرف جانے لگا حالانکہ اس حادثے سے پہلے سردار باز خاں سے میرے رشتے کی بات چل رہی تھی مگر حادثے کے بعد اس نے ایک بار بھی مڑ کر ہماری خبر نہیں لی.......... ایک روز میں ایک کاروباری معاملہ لے کر سردار باز خان کے ہاں پہنچا اور اس بہانے درخو سے ملنے کی کوشش کی۔ اس سے ملاقات بھی ہوئی مگر یہ جان کر میں ششدر رہ گیا کہ وہ بالکل بدل چکی ہے۔ اس نے کہا۔

"رسمت' ہماری راہیں جدا ہو چکی ہیں' مجھے اپنے والدین کی عزت جان سے زیادہ عزیز ہے اور انہیں اب تمہارا مجھ سے ملنا پسند نہیں.......... بہتر ہے' آئندہ کبھی اس غرض سے ہمارے ہاں نہ آنا..........!"

میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ رخ پھیر کر چلی گئی۔ میں بھی اپنا سا منہ لے کر واپس آگیا۔ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ درخو اور اس کے اہل خانہ کی یہ بے رخی تادیر برقرار نہیں رہے گی اور حالات جلد ہی سدھر جائیں گے تاہم یہ

میری خام خیالی نکلی۔ درخو نے اپنی طرف آنے والے تمام راستے مجھ پر بند کر دیئے تھے۔ باز خان کا رویہ بھی روایتی باپوں جیسا ہو چکا تھا۔ میں دن رات اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ ایک رات والدہ محترمہ کو دل کا دورہ پڑا' سول اسپتال مری کے ایک کمرے میں والدہ محترمہ نے مجھ سے ایک وعدہ لیا کہ میں ان کی بات مان لوں گا اور درخو کو بھول کر کسی موزوں لڑکی سے شادی کر لوں گا............

وعدے کی اس زنجیر نے مجھے یوں جکڑا کہ مفر کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ باپ کے بعد اب میں ماں کو بھی کھونا نہیں چاہتا تھا لہٰذا انہیں کوئی صدمہ پہنچانے کے بجائے میں نے تمام صدمے اپنے دل پر جھیل لیے اور............ یوں میری شادی ہو گئی............ پیر صاحب' اب میں آپ کو وہ بات بتانے جا رہا ہوں جو اس سارے واقعے میں آپ کو عجیب ترین لگے گی اور جس کے متعلق میں نے آپ کو شروع میں اشارہ دیا تھا۔ آپ اسے میری روشن خیالی بھی کہہ سکتے ہیں' پاگل پن بھی اور سماج سے کھلی بغاوت کا نام بھی دے سکتے ہیں............ میں آپ کو سیدھے سچے لفظوں میں بتاؤں گا' شادی سے پہلے ہی مجھے کسی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ میری بیوی کسی اور کی محبت کا دم بھرتی ہے............ سہاگ رات کو اس کا گھونگٹ اٹھا کر میں نے کہا تھا۔ "محترمہ' اکیلی تم ہی گناہگار نہیں' میں بھی گنہگار ہوں۔ ہم مشرقیوں کی سہاگ راتیں شاذونادر ہی ان ندامتوں سے خالی ہوتی ہیں۔"

وہ لرز کر اور چونک کر میری طرف دیکھنے لگی پھر میں نے دھیرے دھیرے بڑی آہستگی لیکن بڑی بے رحمی سے' بڑی نرمی لیکن بڑی سفاکی سے اس کے اور اپنے پھپھولوں پر الفاظ کے نشتر چلانا شروع کیے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں ایک عاشق نامراد ہوں اور میرا دل کسی اور کی مٹھی کا جگنو ہے............ بالکل اسی طرح جیسے اس کی سوچیں کسی اور کے تصور سے بندھی ہوئی ہیں............ وہ کانپتی رہی اور سنتی رہی' سسکتی رہی اور بے حال ہوتی رہی۔ دلہن کے حوالے سے اس کے جسم کو کوئی تکلیف پہنچتی تو وہ خوش ہوتی لیکن میں تو اس کی روح کو چھید رہا تھا۔ سہاگ رات کو یہ گفتگو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ جب وہ سب کچھ سن چکی تو میں نے نرمی سے کہا "عزیزہ' ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہمارے دکھ سانجھے ہیں' سماج اور رسم و رواج نے ہمیں ایک ہی طرح لوٹا ہے۔" آؤ' ہم دونوں عہد کریں' محبت کی دشمن دنیا کا یہ آخری وار بھی ناکام بنا دیں گے' اچھے دنوں کی امید کرنا نہیں چھوڑیں گے۔ ہم میاں بیوی ہونے کے باوجود میاں بیوی نہیں ہوں گے' اپنی اپنی نیند سوئیں گے اور اپنے اپنے خواب دیکھیں گے............"

میری بیوی بہت روئی تھی۔ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے' میرے پاؤں پڑی تھی تاہم میں جانتا تھا' وہ میرے پاؤں نہیں' سماج کے پاؤں پڑ رہی ہے' وہ میری رفاقت کو نہیں اپنے خدشوں کو رو رہی ہے۔ مجھے اس پر رحم آرہا تھا' میں نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا............ اور فیصلہ آج تک برقرار ہے۔ میری بیوی اب میرے مزاج کو اچھی طرح سمجھ چکی ہے اور چارو ناچار حالات سے سمجھوتا کر چکی ہے۔"

سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر رحمت خان نے دھواں فضا میں چھوڑا اور کرسی سے ٹیک لگالی۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی بات مکمل کر چکا ہے۔ کچھ دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر میں نے پوچھا۔ "رحمت' یہ صورت حال کب تک جاری رہے گی؟"

"جب تک............ جب تک کوئی انہونی نہیں ہو جاتی پیر صاحب' انہونی کی خواہش آخری ہچکی تک انسان کے سینے میں دفن رہتی ہے............ میں بھی کسی انہونی کا منتظر ہوں شاید کچھ ہو جائے............ شاید!"

میں نے پوچھا۔ "درخواب کہاں ہے؟"

"اپنے باپ کے گھر' ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔"

"کبھی ملاقات ہوئی؟"

"نہیں' کبھی نہیں۔"

"تمہاری شادی کے بعد اس کے خیالات میں کیا تبدیلی آئی؟"

"کچھ معلوم نہیں۔"

"کیا تم نے کبھی ملنے کی خواہش کی؟"

"ایک آدھ بار لیکن ناکامی ہوئی۔"

"اسے بھول سکتے ہو؟"

"ناممکن بات ہے پیر صاحب۔"

"اچھا' ایک بات بتاؤ' اس کی اچانک بے رخی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

میرے اس سوال پر رحمت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "یہی وہ معما ہے پیر جی' جو کسی طرح حل ہونے میں نہیں آتا۔ میرے بیرون ملک جانے سے پہلے وہ ہر طرح میرے ساتھ تھی' سردار باز خان بھی مجھے بیٹا کہتا تھا۔"

"اچھا............ اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ معلوم نہیں۔"

"کوئی انہونی؟"

"شاید.........!"

میں کچھ دیر گہری نظروں سے اس کی طرف اور وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ میں اس کے جذبات سے آگاہ تھا لیکن شاید اسے میرے دل کا احوال معلوم نہیں تھا۔ میرے اندر ایک امنگ پیدا ہو چکی تھی' اس کی مدد کرنے کی امنگ' میں ہجر کا عذاب چکھ چکا تھا اور اب رسمت کی اذیتوں کو سمجھنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "رسمت' میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" اچانک رسمت کی خواب دیکھتی آنکھوں میں امید کے دیئے جل اٹھے۔

☆-----------O-----------☆

یہ بستی دریائے جہلم میں گرنے والی آبی نالے کے شمالی رخ پر مشک پور کے نواح میں واقع تھی۔ یہاں زیادہ آبادی چندال قبیلے سے تعلق رکھنے والوں کی تھی۔ سرما کے سبب چاروں طرف برف کا تسلط تھا' ورنہ آثار بتاتے تھے کہ بہار میں جھرنے' آبشاریں اور گل بوٹے اس جگہ کو بہشت نظیر بنا دیتے ہوں گے۔ سردار باز خان کو جب پتا چلا کہ ایک فقیر کہیں سے آیا ہے اور دوپہر سے اس کے گھر کے سامنے دھرنا مارے بیٹھا ہے تو وہ خود مجھ سے ملنے چلا آیا۔ گنجے سر اور گھنی مونچھوں والا وہ ایک دراز قامت شخص تھا اس کا رنگ زیادہ سفید نہیں تھا اور جبڑوں اور کنپٹیوں کی بناوٹ اسے ایک سخت گیر شخص ظاہر کرتی تھی۔ اس کے کندھے سے ایک ریوالور لٹک رہا تھا' دو محافظ قسم کے آدمی اس کے ساتھ تھے پہلے تو اس کا کرخت چہرہ دیکھ کر مجھے اپنی پیری فقیری خطرے میں نظر آئی مگر جب اس نے جھک کر مصافحہ کیا اور اس کے بعد اپنے بھدے ہاتھوں کو اپنے زیادہ بھدے چہرے پر ملا تو میری جان میں جان آئی۔

"کہاں سے آئے ہو بابا لوک؟" اس نے نیاز مندی سے پوچھا۔

میں نے دور میرا جانی کی چوٹیوں کی طرف اشارہ کیا جیسے سیدھا وہاں سے اسکینگ کرتا ہوا وارد ہوا ہوں۔ میرے انداز نے اسے اور بھی مرعوب کر دیا۔ وہ بڑے احترام سے مجھے اٹھوا کر اپنے حویلی نما مکان میں لے گیا۔ یہ ایک وسیع احاطہ تھا۔ جس کی ایک جانب مردان خانہ اور دوسری طرف زنان خانہ تھا۔ مردان خانے کے کمرے کشادہ تھے۔ وہاں جہازی سائز چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور چھوٹی چلم والے حقے رکھے تھے۔ اپنی گدڑی سنبھالتا ہوا میں ایک چارپائی کی طرف بڑھا اور وہاں بیٹھے ہوئے شخص کو ایک طرف دھکیل کر اطمینان سے دراز ہو گیا۔ میری بدتمیزی کو دیکھ کر دو افراد میری طرف بڑھے اور آستین چڑھا کر نہایت عقیدت سے میرے پاؤں دبانے لگے۔ ایک شخص

چائے پانی کا انتظام کرنے بھاگ گیا۔ باز خان کی حویلی میں یہ میرا پہلا دن تھا۔

چند ہی روز میں باز خان کی حویلی کے اندر اور باہر میری فقیری کا خوب سکہ جم گیا۔ بستی میں ایک دو افراد پہلے سے میرے جاننے والے نکل آئے۔ انہوں نے فرط محبت میں میری ایسی ایسی کرامات بیان کیں کہ میں خود سن کر حیران رہ گیا بلکہ کئی بار تو دل چاہا کہ خود ہی اپنی ہاتھ پر بیعت کر لوں......... اب میں آزادانہ مردانے اور زنانے میں قدم رنجہ فرما سکتا تھا۔ زنانے میں دوسری عورتوں کے علاوہ باز خان کی دو بیویاں اور ان کے بچے بھی تھے۔ ان بچوں میں لڑکی ایک ہی تھی یعنی درخو۔ میں اسے پہلی نگاہ میں ہی پہچان گیا تھا' واقعی وہ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ رحمت خان کا اس پر فریفتہ ہونا سمجھ میں آتا تھا۔ میں نے گھونگٹ کی اوٹ سے اس کے چہرے کا صرف ایک حصہ دیکھا لیکن چاند جتنا بھی ہو چاند ہی کہلاتا ہے۔ عورتیں بے تکلفی سے میرے پاس بیٹھ جاتی تھیں اور اپنے اور اپنے بچوں کے مسائل کا حل پوچھتی تھیں' کالی کھانسی' بستر پر پیشاب' کھٹی ڈکاریں' فضول وسوسے' مالیخولیا......... غرض ہر مرض کے تعویذ گنڈے مجھے دینے پڑے۔ باز خان بے حد مذہبی آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے اہل و عیال پر بھی دین داری کا اثر نمایاں تھا۔

ایک روز جب زنان خانے کے دالان میں درخو اکیلی میرے پاس بیٹھی تھی' میں نے پلکیں اٹھا کر اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا اور ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "تیرے من پر روگ کا سایہ ہے' کسی کو چاہتی ہے نا تو؟"

درخو کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا پھر اس نے کانپ کر سر جھکا لیا۔

میں نے کہا۔ "اس کا نام "ر" سے شروع ہوتا ہے اور تیرا "د" سے۔ تم دونوں کا میل ہو سکتا ہے لیکن......... تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے۔"

"نہیں پیر سائیں' وہ مرجائے گا۔" درخو نے تڑپ کر کہا۔ پھر اپنی بے ساختگی پر خود ہی پشیمان ہو کر سر جھکا لیا۔

"کیوں مرجائے گا؟" میں نے بے پر کی چھوڑی۔ "اس کے نام کا آخری حرف "ت" ہے اور تیرے نام کا آخری حرف "و" یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"درخو نے اشکبار نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر ہاتھ جوڑ کر دھیمی آواز میں بولی۔" پیر سائیں' بس دعا کریں......... دعا کریں کہ اللہ میرے......... اللہ میرے باپ کو سیدھے راستے پر چلائے' ان کی مشکلیں آسان کرے۔"

میں نے وجد میں سر ہلا کر دائیں بائیں جھولنا شروع کیا۔ "مشکلیں آسان ہوں گی ضرور ہوں گی لیکن مشکلیں بہت ہیں ہر کام باری پر ہوگا۔ تو بتا' پہلے کونسی مشکل آسان کرانا چاہتی ہے؟"

درخو کے ہونٹ تھرائے وہ کچھ بتانا چاہتی تھی مگر پھر رک گئی۔ وہ میری توقع سے زیادہ ذہین تھی بات بدل کر بولی۔ "پیر سائیں' آپ تو سب کچھ جانتے ہیں' بس آپ دعا کریں' آپ کی دعا سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ لڑکی کو مزید کریدنا اسے شبہے میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ میں نے جلالی طبیعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامنے رکھی ڈرائی فروٹ کی پلیٹ کو ٹانگ ماری اور "حق ہو" کا نعرہ لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"سنئے تو۔" درخو نے میرا بازو تھامنے کی کوشش کی مگر میں پاؤں پٹختا اور جھومتا ہوا مردانے میں واپس آگیا۔

درخو سے میری یہ ملاقات انکشاف انگیز ثابت ہوئی تھی۔ باز خان کا رہن سہن دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس شخص کے کردار کا کوئی تاریک پہلو بھی ہے مگر درخو کے ایک فقرے نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا' درخو کے فقرے سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے باپ کو سیدھے راستے پر نہیں سمجھتی......... پھر وہ ٹیڑھا راستہ کیا تھا؟ یہی بات میرے سوچنے کی تھی۔ آخر کیا وجہ تھی کہ درخو نے رحمت کی موت کا خوف ظاہر کیا تھا۔ کیا اس خوف کا تعلق کسی طرح باز خان کے ٹیڑھے راستے سے تھا؟ بہت سے سوال ذہن میں سرسرانے لگے۔ باز خان کے ساتھیوں میں ایک شخص ایسا تھا جس پر شروع سے مجھے کچھ شبہ سا تھا' اس نوجوان کا نام میراں جان تھا' سرخ و سپید رنگ اور چوڑے چکلے جسم والا یہ نوجوان باز خان کا ہونے والا داماد تھا۔ مجھے یہاں آکر پتا چلا تھا کہ میراں جان سے درخو کا رشتہ ہونے والا ہے۔ باز خان کے چال چلن پر شک ہونے کے بعد میں نے میراں جان پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی اور میرے لیے یہ کام مشکل بھی نہیں تھا۔ ایک مست حال فقیر کی حیثیت سے میں باز خان کی حویلی میں ہر جگہ دندناتا پھرتا تھا۔ میرے حلیے اور اطوار نے کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

کوئی آٹھ دس روز بعد کا واقعہ ہے' رات کے دس گیارہ کا عمل تھا' میں حویلی کے حجرے یعنی نشست گاہ کی بغل میں ایک چھوٹے سے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ میرے سر پر ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جو حجرے میں کھلتی تھی۔ حجرے میں دو تین افراد لیٹے ہوئے

تھی ان میں میراں جان بھی تھا۔ شاید انہوں نے کوئی نشہ وغیرہ کر رکھا تھا' بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ کل مجھے میراں جان کے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ مزدا پک اپ نظر آئی تھی' غالبا اسی کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔

"کیا باڈی ہے' کیا چمک ہے! دیکھ کر ہی بھوک ختم ہو جاتی ہے۔" میراں جان نے کہا۔

ایک دوست نے شریر لہجے میں پوچھا۔ "اوئے میراں جان' سچ بتا' یہ بات کس کی کر رہا ہے تو؟"

"گاڑی کی اور کس کی؟" میراں جان نے تاؤ کھا کر کہا۔

"اوہ' میں سمجھا شاید............" اس بات پر ہلکا سا قہقہہ پڑا پھر میراں جان کی آواز آئی۔

"ظالم نیچے سے پھسلتی جاتی ہے۔ چڑھائی چڑھاتے جاؤ' مجال ہے ہانپے یا کانپے۔"

قدرت خان نے کہا۔ "ہاں بھئی' ہانپے کانپے گی کیوں' نئی گاڑی ہے............ اچھا یار چھوڑ ان باتوں کو یہ سنا' کب چاول کھلا رہا ہے شادی کے؟"

میراں جان چمک کر بولا۔ "خدائی خوار' تیرا دھیان وہیں اٹکا ہوا ہے' بن جائے گا تو ماماں بھی' اتنی جلدی کیا ہے۔" اس پر پھر ایک قہقہہ پڑا۔

قدرت خان نے کہا۔ "ویسے یار گاڑی تجھے اچھی مل گئی ہے قسمت سے لیکن سنبھال کر چلانا۔ تو مدہوش ہے اور رستے بڑے خراب ہیں۔" میراں جان نے شاید اسے گھور کر دیکھا تھا پھر قدرت خان کی آواز آئی۔ "یار' اب میں گاڑی کی بات کر رہا ہوں اور تو خواہ مخواہ دوسری طرف جا رہا ہے' قسم سے میرا مطلب یہی تھا۔"

تیسرے دوست کی آواز آئی۔ "بھئی اس بات کا تو میں بھی گواہ ہوں' میراں اچھا ڈرائیور ہے۔"

قدرت نے کہا۔ "بس ایک بار اس نے غلط ڈرائیونگ کی اور پکڑا گیا۔ بے چارہ رحمت کا باپ............" پھر ایک قہقہہ پڑا۔ یہ قہقہہ ایک دھماکے کی طرح میرے کانوں میں گونجا۔ ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ قدرت خان کا معنی خیز لہجہ ایک خاص سمت اشارہ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے رحمت نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ نتھیا گلی سے ایبٹ آباد جاتے ہوئے جیپ کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا تو کیا............ کیا اس کی موت میں باز خان کا کوئی ہاتھ تھا! اندر ہونے والی گفتگو کچھ دیر مزدا جیپ اور درختوں کے گرد گھومتی رہی

پھر تینوں دوست خاموشی سے سو گئے۔

☆............O............☆

لمبی مزدا پک اپ ہچکولے کھاتی ہوئی تیزی سے پتھریلے راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ شام کے چار بجے تھے لیکن سورج ابھی سے نتھیا گلی کی چوٹیوں میں غروب ہو رہا تھا۔ میں جیپ کے عقبی جانب پائیدان پر بیٹھا ہوا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود میراں جان میری موجودگی سے قطعی بے خبر تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میرا یہ سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوگا۔ گاڑی چلاتے ہوئے میراں جان کو میری موجودگی کا احساس ہو جائے گا یا ہو سکتا ہے' میرے ہاتھوں کے آہنی کڑوں یا مالاؤں کی کھڑکھڑاہٹ اسے میری طرف متوجہ کر دے' ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اس نے مجھے بہلا پھسلا کر دوبارہ حویلی میں چھوڑ آنا تھا یا ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بھیج دینا تھا تاہم ایسا نہیں ہوا تھا۔ میراں جان بہت جلدی میں لگتا تھا۔ وہ اندھا دھند گاڑی بھگا رہا تھا۔ میں کیکڑے کی طرح گاڑی کے عقب سے چمٹا ہوا تھا ورنہ زیادہ دیر "شجرے پیوستہ رہ کر امید بہار رکھنا۔" ممکن نہیں تھا۔ ایک دو جگہ تو اتنے زور سے جھٹکا لگا تھا کہ باقاعدہ شاخ ہستی پر خزاں طاری ہوتے ہوتے رہی۔ نیچے زمین پتھریلی تھی اور میں جانتا تھا' دانہ خاک میں مل کر بھی گل و گلزار نہیں ہو سکے گا۔

میراں جان کے معمولات کئی دنوں سے میری نظر میں تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز دوپہر کے کھانے کے بعد پک اپ لے کر کسی طرف نکل جاتا تھا' وہ ہمیشہ تنہا جاتا تھا اور اس کی واپسی اگلے روز دوپہر کے وقت ہوتی تھی وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں جاتا ہے............ آج دوپہر جب وہ اپنے پراسرار سفر پر روانہ ہوا تو میں پہلے سے اس کی تاک میں تھا' جونہی گاڑی حویلی سے نکل کر قریبی درختوں میں آئی میں اچک کر عقبی پائیدان پر سوار ہو گیا تھا اور اب ہمیں اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں سوچنے لگا اگر میں واقعی مست حال فقیر ہوتا اور اپنی ترنگ میں اس پائیدان پر آبیٹھتا تو میراں جان کی اندھا دھند ڈرائیونگ مجھے اترنے کا موقع دیئے بغیر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی۔

تقریباً پانچ بجے گاڑی ایک خشک آبی نالے میں سے گزری اور گھنے درختوں میں رکی۔ گاڑی کے رکتے ہی میں پائیدان سے اترا اور گدڑی سنبھالتا ہوا دیودار کے ایک تناور درخت کی اوٹ میں جا چھپا۔ انجن ابھی بند نہیں ہوا تھا اور مجھے خدشہ تھا کہ میراں جان پھر روانہ نہ ہو جائے۔ جب انجن بند ہوا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ کچھ کھٹ پٹ کی

آوازیں آئیں پھر گاڑی کا دروازہ کھلا اور بند ہوا اور خشک پتے قدموں کے نیچے چرچرانے لگے۔ میں نے تنے کی اوٹ سے دیکھا' میراں جان تیز قدموں سے ایک طرف جا رہا تھا۔ جب فاصلہ مناسب حد تک بڑھ گیا تو میں بھی اوٹ سے نکلا اور پرچھائیں کی طرح اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ ٹھٹھرے ہوئے خاموش جنگل میں شام کسی تاریک دھند کی طرح' بے آواز اتر رہی تھی۔ میں حتی الامکان احتیاط سے میراں جان کا تعاقب کرتا رہا۔ یہ ایک طویل اور دشوار گزار تعاقب تھا۔ اندھیرا گہرا ہونے کے ساتھ ہی میراں جان نے ایک ٹارچ روشن کر لی تھی۔ یہ روشنی میری مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ کوئی دو میل چلنے کے بعد آخر کہیں دور سے کچھ مدہم مدہم آوزیں آنے لگیں پھر ایک جگہ تاریکی میں کٹی ہوئی لکڑی کے انبار نظر آئے۔ میں اس لکڑی کا جائزہ لیتے ہوئے احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا جب اچانک میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی' محاورتاً بھی اور حقیقتاً بھی۔ بے دھیانی میں پاؤں کسی خلا میں چلا گیا تھا میں ہوا میں ہاتھ پاؤں چلاتا کوئی بیس فٹ نیچے پختہ زمین پر گرا اور پھر لڑھکنیاں کھاتا ہوا کوئی پندرہ فٹ اور نیچے چلا گیا تھا۔ معجزانہ طور پر جسم شدید چوٹوں سے محفوظ رہا تھا صرف ایک کندھے اور گردن کے پچھلے حصے پر کچھ ضربیں آئی تھیں۔ حواس قدرے بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک تنگ کھائی میں پایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے پاؤں کے نیچے جھاڑ جھنکار' درختوں کی پتلی شاخیں اور چھال وغیرہ بچھی ہوئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ احساس بھی ہوا کہ میں ٹھوس زمین کے بجائے کسی لکڑی وغیرہ پر کھڑا ہوں۔ نیچے جھک کر میں نے درختوں کی نیم خشک شاخیں ادھر ادھر ہٹائیں اور یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ میرے قدموں کے نیچے عمارتی لکڑی کے سلیپر ہیں جنہیں خاص ترتیب سے کھائی کے اندر جوڑا گیا ہے۔

کھائی کی بناوٹ سے ظاہر تھا کہ وہ تنگ ہونے کے باوجود کافی گہرائی تک چلی گئی ہے۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہاں لاکھوں روپے مالیت کی مسروقہ لکڑی کو کیموفلاج کر کے رکھا گیا ہے۔ میں محتاط قدموں سے کچھ آگے گیا اور میری حیرانی دوچند ہو گئی۔ کھائی کافی دور تک چلی گئی تھی اور یہ پورا خلا لکڑی کے شہتیروں سے بھرا ہوا تھا' درحقیقت یہ کھائی ان لکڑی چوروں کے لیے بہت بڑے گودام کا کام دے رہی تھی۔ کھائی کا ایک سرا جو زیادہ تنگ تھا' ایک مسطح زمین پر کھلتا تھا' یہاں پہنچ کر میں نے احتیاط سے جائزہ لیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہاں باربرداری کے جانوروں کی آمدورفت رہتی ہے' تاریکی میں پاؤں کے نشانات تو نظر نہیں آئے مگر جانوروں کا فضلہ وغیرہ شاید آس پاس بکھرا ہوا

تھا۔ غالباً اس مقام سے لکڑی کو جانوروں پر لاد کر چور راستوں سے محفوظ مقام تک پہنچایا جاتا تھا۔ میں محتاط قدموں سے ڈھلوان طے کر کے اوپر پہنچا' یہاں گھنے درختوں کے اندر چند بڑی بڑی آرا مشینیں لگی ہوئی تھیں اور چاروں طرف لکڑی کا برادہ اور پرزہ جات بکھرے ہوئے تھے۔ "چوری" کا یہ کام وسیع پیمانے پر ہو رہا تھا اور مجرموں کی دیدہ دلیری سے صاف ظاہر تھا کہ سرکاری اہلکار ان سے ملے ہوئے ہیں۔

میں ان مناظر میں اتنا محو تھا کہ جب اچانک میرے کندھے پر ایک ہاتھ آیا تو میں بری طرح چونک گیا' مڑ کر دیکھا تو ایک دراز قد شخص دستی آرا کندھے سے ٹکائے سامنے کھڑا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے خطرناک لہجے میں پوچھا۔

"فف......... فقیر۔" میری منہ سے نکلا اس وقت میری نگاہ چند گز دور آرا مشینوں کی طرف اٹھ گئی۔ میراں جان چند افراد کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا اسی طرف آ رہا تھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ جلد ہی اس کی نظر میرے چہرے پر پڑنے والی ہے۔ میں جانتا تھا' میں خطرناک مقام پر کھڑا ہوں اور یہاں میری موجودگی میری موت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے فوری فیصلہ کیا' اپنی جگہ سے حرکت کی اور ایک پتھر کو پھلانگ کر بھاگ نکلا میرے عقب میں دراز قد شخص کی تیز آواز سنائی دی۔

"پکڑو......... پکڑو۔"

یکلخت جیسے خاموش جنگل جاگ اٹھا' بلندی پر بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں' میں نے اپنی گدڑی کسی بڑے مفلر کی طرح گلے میں لپیٹ لی اور تاریکی میں ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ میرے ہاتھوں کے کڑے اور گلے کی مالائیں جھنجھنا کر ایک پرخوف موسیقی پیدا کر رہی تھیں۔ عقب میں بلند ہوتا ہوا شور اس موسیقی کو اور بھی دہشتناک بنا رہا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے اس علاقے کی بھول بھلیوں سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے ہمارا درمیانی فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا' ہمت کر کے میں نے عقب میں دیکھا کئی ٹارچیں آسیبی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ چیخ و پکار کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں' وہ لوگ پھیل کر بڑھ رہے تھے۔

تعاقب کرنے والوں کے ساتھ میری آنکھ مچولی رات کوئی گیارہ بجے تک جاری رہی اونچی نیچی گھاٹیوں اور گھنے درختوں میں حتی الامکان تیزی سے سفر کرتے ہوئے میں نے کوئی پانچ میل کا سفر طے کر لیا لیکن اس وقت جب میں ایک بستی کے بالکل قریب پہنچ

چکا تھا اور مجھے امید ہو چلی تھی کہ بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے گی' میں پکڑا گیا' تعاقب کرنے والوں کی ایک ٹولی اچانک سامنے سے نمودار ہوئی اور میری طرف لپکا' میں بستی کی گلیوں میں "بچاؤ............ بچاؤ" کا شور مچاتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔ یہ بستی سات آٹھ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ آدھی رات کو میری چیخ و پکار نے لوگوں کو مضطرب کر دیا' گھروں کے دروازے کھلنے لگے' چند ہوائی فائر بھی ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی پوری بستی کے کتے زور و شور سے بھونکنے لگے۔ مجھے اپنے عقب میں ٹارچوں اور لالٹینوں کا جمگھٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ آخر جونہی میں ایک گلی میں مڑا' چند افراد نے لپک کر مجھے دبوچ لیا۔ اس دوران میرے اصل دشمن بھی پہنچ گئے۔ یوں تو ان کی تعداد کافی تھی مگر وہ ٹولی جس نے سب سے پہلے مجھ تک رسائی حاصل کی' تقریباً سات افراد پر مشتمل تھی۔ وہ سب کے سب بری طرح ہانپتے ہوئے' آنکھوں سے چنگاریاں برسا رہے تھے۔ اس یخ بستہ شب میں انہیں کئی گھنٹے تک خوار کر کے میں نے اپنی بدقسمتی پر مہر ثبت کر لی تھی۔ مجھ تک پہنچتے ہی انہوں نے میری ٹھکائی شروع کر دی۔ شاید وہ سارے ارمان اسی جگہ نکال کر مجھے مرحوم کر دیتے۔ مگر بستی کے لوگ آڑے آئے۔ انہیں اصل صورت حال معلوم نہیں تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی فریق کے ساتھ زیادتی ہو جائے۔ میرا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ مالائیں ٹوٹ گئی تھیں اور جسم کے مختلف حصے خونچکاں تھے۔ جوں ہی مجھے کھینچ تان کر روشنی کی طرف لایا گیا' کئی افراد چیخ اٹھے۔ "یہ تو پیر صاحب ہیں۔"

مجرموں میں سے ایک تیم شحیم شخص غرایا۔ "پیر نہیں شیطان کہو! یہ بہروپیا ہے۔"

سانس میرے پیٹ میں نہیں سما رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے لبوں کو حرکت دینا چاہی تو دو مشٹنڈے پھر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ مار مار کر میرا انجر پنجر ڈھیلا کر دیا پھر گالیاں دیتے اور گھسیٹتے ہوئے بستی کے چوراہے میں لے آئے۔ میری مشکیں کس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا گیا۔ بستی کے لوگ حیرت سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے چہروں پر اضطراب تھا۔ شاید وہ مجھے اس سلوک کا مستحق نہیں سمجھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو نے اس بات پر احتجاج بھی کیا۔ مجرموں میں سے دراز قد شخص نے بارعب لہجے میں کہا۔ "تم لوگ وہ بات مت کرو جو تمہیں معلوم نہیں۔ یہ شخص سراسر فراڈ ہے۔ ہم اسے سردار کے سامنے پیش کریں گے۔ خود کوئی سزا نہیں دیں گے۔"

اس دوران میرا تعاقب کرنے والوں کی دو ٹولیاں اور پہنچ گئیں۔ ان میں سے

ایک ٹولی پک اپ سوار اور دوسری پیدل تھی۔ پک اپ سوار ٹولی میں میراں جان بہ نفس نفیس موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں قہر کی بجلیاں چمکنے لگیں' اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ وہ مجھے یہیں مار کر گاڑ دینا چاہتا ہے مگر چونکہ یہ سارا معاملہ اب بستی والوں کی نظر میں آ چکا تھا اس لیے وہ کوئی جلد بازی کرنا نہیں چاہتا تھا' اس نے اپنے پیش رو کے فیصلے کی تائید کی اور کہا کہ مجرم کو سردار کے سامنے پیش کیا جائے۔ نہایت توہین آمیز طریقے سے مجھے اٹھا کر پک اپ میں پٹخ دیا گیا' پک اپ آہستہ روی سے روانہ ہو گئی تو بستی کے چند جوشیلے لالٹین تھامے ایک جلوس کی طرح ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ڈرائیور نے دشوار راستے پر رفتار پکڑنا مناسب نہیں سمجھی اور یوں میں سو ڈیڑھ سو آدمیوں کی معیت میں' ملک پوری کی جانب روانہ ہوا۔

راستہ بھر میراں جان اور اس کے ساتھی مجھے شاندار قسم کی گالیوں سے نوازتے رہے۔ ان کی باتوں سے علم ہوا' جس سردار کے سامنے مجھے پیش کیا جا رہا ہے وہ سردار باز خان ہی ہے۔ یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ میں شارٹ کٹ راستوں کو استعمال کر کے باز خان کی بستی کے بالکل قریب آ نکلا تھا' صرف ڈھائی تین میل کا سفر باقی رہ گیا تھا۔

میری سواری باد بہاری باز خان کی حویلی کے سامنے پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری بستی بیدار ہو گئی۔ لوگ حیرت زدہ نگاہوں سے پک اپ کے اندر جھانک رہے تھے۔ میں چلا چلا کر انہیں اپنے "جرائم" سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر منہ میں کپڑا تھا اور ناک سے صرف گوں گوں کی صدا ہی نکل سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد باز خان اپنے ہونے والے داماد' میراں جان اور دیگر افراد کے ساتھ پک اپ کی طرف آتا دکھائی دیا' ہاتھ میں تسبیح تھی' یوں لگتا تھا تہجد پڑھتا پڑھتا ادھر چلا آیا' اس کے انداز و اطوار دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص نہ صرف کالے دھندے میں ملوث ہے بلکہ سفاک قاتل بھی ہے۔ اس کی چمکیلی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی تھیں اور چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ میری کارگزاری سے آگاہ ہو چکا ہے۔ جب اس کے چوڑے جبڑے باہر کو ابھرے اور پھولی ہوئی کنپٹیوں کی چمک نمایاں ہوئی تو مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ مجھے وحشت ناک انداز میں گھورنے اور دانت پیسنے کے بعد باز خان واپس چلا گیا۔ حویلی کے سامنے چند چارپائیاں بچھا کر گیس لیمپ روشن کر دیئے گئے تھے۔ سردی کم کرنے کے لیے ایک بڑا الاؤ بھی دہکا دیا گیا تھا۔ بستی کے چند بڑے بوڑھوں کے ساتھ باز خان پراسرار مشوروں میں مصروف ہو گیا۔ لوگ چاروں طرف ٹولیوں میں کھڑے جیسے کسی فیصلے کے منتظر تھے۔ پک اپ کے ٹھنڈے فرش پر پڑے

پڑے میرے اعضاء اکڑنے لگے۔ آخر ہجوم میں ہل چل نظر آئی۔ میں نے لوگوں میں ایک بے قراری سے محسوس کی پھر میراں جان ایک نہایت بوڑھے شخص کے ساتھ میری طرف چلا آیا۔ یہ بوڑھا بھی مجھے کوئی اپنے ہی قبیل کا نظر آیا' اس کے بال جناؤں جیسے تھے اور گلے میں پتھروں کی مالائیں۔ قریب آکر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' وہ ایک مقامی پیر تھا اور اسے لوگ اللہ ہو والا' کے نام سے یاد کرتے تھے۔

جوں ہی پیر اللہ ہو والا میرے سر پر ہاتھ پھیر کر فارغ ہوا' پک اپ حرکت میں آئی اور مجھے ایک نامعلوم مقام کی طرف لے چلی۔ بستی کے لوگ اب پیچھے رہ گئے تھے۔ میں تاریکی میں ان کے تاثرات نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن مختلف آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس سارے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

پک اپ کوئی دو میل اونچے نیچے راستے پر چلنے کے بعد ٹھہر گئی۔ یہاں پہنچ کر میرے پاؤں رسی کی بندش سے آزاد کر دیئے گئے۔ منہ سے کپڑا بھی نکال لیا گیا میں نے دیکھا کہ میں دس پندرہ مسلح آدمیوں کے نرغے میں ہوں۔ ایک آدمی.......... نے مجھے جدید رائفل سے ٹھوکا دیتے ہوئے آگے بڑھنے کو کہا۔ میں جانتا تھا یہاں میری فریاد پر کان دھرنے والا کوئی نہیں اور چیخ و پکار بے کار ہے' کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ میرے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ اگر دل میں کوئی امید تھی تو یہی کہ شاید رحمت میری مصیبت سے آگاہ ہو جائے میری کچھ مدد کرے.......... لیکن کیسے؟ یہ لوگ تو شاید ابھی قصہ تمام کرنے کے موڈ میں تھے۔ یہ سارا علاقہ برف سے ڈھکا ہوا تھا اور تیز ہوا ہڈیوں میں سرایت کرتی محسوس ہوتی تھی۔ میرے پہرے دار مجھے دھکیلتے ہوئے بلندی کی طرف لے جانے لگے۔ ایک دشوار چڑھائی چڑھا کر وہ مجھے ایک برفانی کھوہ میں لے آئے' ایک جانب بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ کھوہ مکمل طور پر برف کے اندر تراشی ہوئی تھی مجھے کھوہ میں دھکیل دیا گیا۔ یہاں ایک وزنی پتھر میں دو آہنی کنڈے نصب تھے۔ ان کنڈوں کی موجودگی کی وجہ میری سمجھ میں اس وقت آئی جب ایک مضبوط رسی کے ذریعہ مجھے اس پتھر سے باندھ دیا گیا۔ باندھنے کے بعد جب مسلح افراد باہر جانے لگے تو میں نے نہایت عاجزی سے کہا۔ "بھائیو! کچھ تو بتاتے جاؤ.......... یہ سب کیا ہو رہا ہے!"

مجھے اندر لانے والے دو افراد تو ناک بھوں چڑھا کر باہر نکل گئے لیکن تیسرا جو نسبتاً باتونی تھا' کڑے لہجے میں بولا۔

"اس جگہ کو "پیر کھوہ" کہا جاتا ہے.......... یہاں پر جھوٹے بچے کی پہچان ہوتی

ہے۔ پیر اللہ ہو والا کے حکم کے مطابق تجھے اب آٹھ پہر یہاں رہنا ہوگا۔ اگر تو سچا ہے تو بچ جائے گا ورنہ کل اسی وقت آکر ہم تیری لاش اٹھا لے جائیں گے۔"

اچانک مجھے صورت حال کی اصل سنگینی کا احساس ہوا' جیسا کہ اس کھوہ میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا' یہ دو اطراف سے کھلی تھی یعنی ایک راستہ تو وہ تھا جہاں سے مجھے لایا گیا تھا لیکن کوئی دوسرا راستہ بھی تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ نہایت تیز ہوا فرانے بھرتی ہوئی کھوہ میں سے گزر رہی تھی۔ ایسے بلند اور تنگ دروں میں ہوا ویسے بھی تیز ہوتی ہے اور یہ تو تھا ہی برفانی علاقہ' میرے جسم پر ایک تار تار لباس تھا اور جسم زخموں سے چور' میں سمجھ گیا کہ اس سرد ترین مقام پر میں چند گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکوں گا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ امتحان وغیرہ کچھ نہیں' مجھے سیدھا سیدھا موت کے منہ میں دھکیلا گیا ہے۔ معلوم نہیں سردار باز خان کے ایماء پر پیر اللہ ہو والا اس سے پہلے کتنے بدنصیبوں کو اس عذاب سے دو چار کر چکا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی ایسا دور دراز علاقہ بھی نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا ان بستیوں میں اس طرح کے حادثے رونما ہوتے رہے ہیں اور رسم و رواج اور عقائد کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے لوگ کبھی تھانے کچہری تک نہیں پہنچے۔ عجب طرفہ تماشا تھا جب میں جھوٹا تھا تو لوگ مجھے سچا ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میرے پاؤں چھوتے تھے اور ہاتھ چومتے تھے.......... اور اب جبکہ میرے پاس بولنے کے لیے ایک دھماکا خیز سچ تھا' مجھے جھوٹا گردانا جا رہا تھا اور ایک بااثر مجرم ہمیشہ کے لیے میری زبان بندی کا انتظام کر رہا تھا.......... کر کیا رہا تھا کر چکا تھا.......... اور اب موت میرے روبرو تھی۔

O------------☆------------O

رات کے تقریباً بارہ بج چکے تھے۔ مجھے برف کی اس قبر میں موت کا عذاب جھیلتے کوئی بیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ مجھے خود پر حیرت تھی کہ میں ابھی تک زندہ ہوں شاید میں صرف زندگی کا خواب دیکھ رہا تھا' پچھلے آٹھ دس گھنٹوں سے کئی عجیب و غریب مناظر میری خوابناک آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ کبھی میں حرارت بخش آگ کا الاؤ روشن دیکھتا' یہ آگ اپنے شعلوں کی زبانوں سے میرے زخم زخم' عریاں جسم پر گدگدی کرتی' پھر مجھے محسوس ہوتا کہ یہ مہرباں آگ دراصل کرن ہے' میری بچھڑی محبت' مجسم شباب اور رعنائی میرے اوپر جھکی ہوئی ہے۔ اپنے نرم ہونٹوں سے میرے زخم کو چوم رہی ہے مجھے اس کے جسم سے گرم قہوے کی مہک آتی۔ میں سوچتا یہ کرن ہے یا قہوے کی پیالی' پھر یہ

ہج وہ قہوے کی پیالی بن جاتی' میں اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیتا' اچانک قہوے کی پیالی
پھیلتی جاتی اور سمندر بن جاتی۔ اس کی اندر مجھے درخو اور رسمت کے چہرے نظر آتے۔
میں دیکھتا' وہ ڈوب رہے ہیں' ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں' فریاد کر رہے ہیں "پیر جی! ہمیں بچاؤ
تم جھوٹے پیر ہو یا سچے پیر ہو...... لیکن تم ہمیں بچا سکتے ہو...... اپنی کرن کا صدقہ'
ہمیں بچاؤ......"

نہ جانے وہ کیا کیا الٹے سیدھے خواب تھے جو میں نے نیم بے ہوشی کی حالت میں
دیکھے۔ ان بیس گھنٹوں کی اذیتیں' حسرتیں اور تڑپ بیان کر کے میں کہانی کو مزید طول
نہیں دینا چاہتا' بس یہ سمجھ لیں کہ وہ بیس گھنٹے سرد جہنم کی بیس ہزار تمیں تھیں جن سے
میں گزرا تھا۔ میرے لیے خوشی کی صرف ایک ہی بات تھی کہ میں ابھی زندہ تھا۔ شاید
پچھلے ایک برس کی نفس کشی اور سخت کوشی میری موت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تھی'
اب مجھے امید ہو چلی تھی کہ میں باقی کے تین چار گھنٹے بھی کسی نہ کسی طرح گزار لوں گا۔

اچانک مجھے قریب ہی کہیں آہٹ سی محسوس ہوئی' کھوہ کے دہانے پر دو سائے
نظر آئے' وہ ایک پتھر کی اوٹ سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید اس سے پہلے بھی وہ
مجھے اسی طرح دیکھ کر گئے تھے مگر اس وقت مجھ پر غشی سی طاری ہو رہی تھی اور میں نے
ان سایوں کو وہم سے تعبیر کیا ہو گا۔

ایک غصیلی آواز کھوہ میں گونجی۔ "زندہ ہے حرامزادہ۔" دوسری آواز آئی۔
"ٹھیک ہے کھول دو۔"

یہ آواز میراں جان کی تھی یعنی درخو کے ہونے والے شوہر کی' اس نے مجھے
کھولنے کا حکم دیا تھا' تین آدمی میری طرف بڑھے۔ تیز ہوا میں ان کے لباس پھڑپھڑا رہے
تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ روشنی میں انہوں نے بغور میرا چہرہ دیکھا پھر
کسی نے غرا کر ایک ٹھوکر میری پسلیوں میں ماری' ایک دراز قد شخص میری طرف جھک
آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریزر بلیڈ تھا' بلیڈ کے ذریعے اس نے میری رسیاں کاٹنا شروع
کر دیں۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ رسیاں کھولنے کے بجائے کاٹ کیوں رہا ہے؟ اور اگر
کاٹنا بھی ہے تو کوئی چاقو وغیرہ استعمال کیوں نہیں کرتا؟ تقریباً دس منٹ میں اس نے میری
رسیاں کاٹ کر مجھے آزاد کر دیا۔ ایک خودکار رائفل میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"چلو باہر نکلو...... ذرا تمہاری جاسوسی نکالیں۔" میراں جان نے حسب معمول
ایک گالی دے کر مجھے باہر کی طرف دھکیلا۔ میں لنگڑاتا اور لڑکھڑاتا ہوا کھوہ کے دہانے کی

طرف بڑھا' کھوہ سے باہر نکلتے ہی میں جیسے دوزخ سے برزخ میں آ گیا۔ ہوا کی ہلاکت خیز
کاٹ نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میرے کرم فرما مجھے دھکیلتے ہوئے کھوہ سے کوئی پچاس
گز نیچے لے گئے' پھر اچانک...... کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ مجھ پر پل پڑے'
جبڑے پر چند زور دار مکے پڑے تو کھوپڑی روشن ہو گئی اور اس کی ساتھ ہی ساری
حقیقت میری سمجھ میں آ گئی...... میری سخت جانی سے مایوس ہو کر باز خان نے کھوہ سے
میرے فرار کا ڈرامہ رچایا تھا۔ اب میں ایک مفرور شخص تھا اور پہرے داروں کو مجھے
جان سے مارنے کا پورا حق حاصل ہو گیا تھا۔ چند ساعتوں میں مستقبل کا نقشہ میری
آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اپنی لاش میرے تصور میں آئی۔ ٹوٹی ہوئی پسلیاں' تقسیم شدہ
سر' پچکا ہوا پیٹ اور سینے میں گولیوں کے سوراخ!

مارنے والے مجھے بے دریغ مار رہے تھے لیکن ایک بات سے وہ یکسر بے خبر تھے۔
ان کی مار کھانے والا اور ان کے ہاتھوں زخم زخم ہونے والا ماضی کا ایک نامور فائٹر تھا۔
ملک کے صف اول کے کھلاڑیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا...... اس کے فقیری چولے میں
ایک پروفیشنل لڑاکا ابھی تک زندہ تھا...... میں نے خود کو سفاک قاتلوں میں گھرا ہوا پایا
تو زندگی کی خواہش قوت بن کر میرے ہاتھ پاؤں میں دوڑ گئی۔ میں نے سنبھالا لے کر
خود کو دفاع کے لیے تیار کیا۔ میرے مقابل میراں جان سمیت کوئی چھ افراد تھے۔ انہوں نے
مجھے تین اطراف سے گھیر رکھا تھا...... میں لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا......
رکا...... سیدھا ہوا...... اور برفیلی تاریکی میں اپنا ہدف تلاش کرنے لگا۔

اس رات' اس تاریک ڈھلوان پر چیڑ' دیودار اور شاہ بلوط کے درختوں کے
درمیان میں نے اپنی زندگی کی یادگار لڑائی لڑی۔

برسوں کی ناکامی اور لاحاصل ریاضتیں ان چند لمحوں سے خراج وصول کر گئیں۔
میں نے خالی ہاتھ ان چھ افراد کو پرانی روئی کے مانند دھنک کر رکھ دیا۔ میں نے ان کے
پھٹے ہوئے سر' ٹوٹے ہوئے بازو اور خونچکاں چہرے نہیں دیکھے لیکن اندھیرے میں خوفزدہ
چیخوں اور کراہوں کا زیر و بم سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچ گیا۔ یہ حملہ اتنا شدید
اور اچانک تھا کہ کم از کم پانچ افراد وہیں پر کھیت رہے' صرف ایک شخص موقع سے بھاگ
سکا...... چند لمحے بعد میں نے ایک خودکار رائفل اٹھائی اور سمت کا تعین کر کے تاریکی
میں دوڑتا چلا گیا۔

درختوں اور دشوار گزار گھاٹیوں میں پیدل سفر کرتا میں تقریباً دو گھنٹے میں رسمت

خان کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ رحمت تک میری رسائی میری بہت بڑی کامیابی اور باز خان کی زبردست شکست تھی۔ اس رات اور اگلے روز یکے بعد دیگرے بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے۔ ان میں باز خان کی خفیہ آرا مشینوں پر پولیس کی بھاری جمعیت کا چھاپا بھی شامل تھا۔ باز خان خطرے کی بو سونگھ کر یہ اڈا خالی کر چکا تھا مگر وہاں کچھ ایسے شواہد باقی رہ گئے تھے جن سے پولیس کو باز خان کے ایک اور ٹھکانے کا سراغ مل گیا اور اس ٹھکانے سے باز خان اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار ہوا۔ گرفتار ہونے والوں میں ہٹا کٹا میراں جان بھی شامل تھا۔ پیر کھوہ کے قریب میرے ہاتھوں پٹنے اور ناک تڑوانے کے بعد وہ باز خان کی بغل میں جا چھپا تھا۔ درحقیقت میراں جان ہی نے رحمت کے والد سلطان خان اور اس کے ڈرائیور کو قتل کیا تھا' تھانے میں پہنچ کر جب بڑے مجرم باز خان اور اس کے ساتھیوں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی تو اچانک باز خان کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ تھانے سے سیدھا سول اسپتال مری جا پہنچا۔ وہاں سے اسے راولپنڈی منتقل کیا گیا۔ پانچ روز کی مسلسل کوشش کے بعد ڈاکٹروں نے اس کی جان بچالی مگر اس کا نصف دھڑ بدستور بے حس تھا۔ قوت گویائی بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ موت کو اس قدر قریب اور زندگی کو اتنا گریزپا دیکھ کر باز خان نے چند کاغذات منگوائے اور ان پر اپنا طویل اقبالی بیان اپنے ہاتھ سے لکھا۔ اس بیان سے جو حالات سامنے آئے وہ یوں تھے۔

باز خان ایک عرصے سے جنگل کی غیر قانونی کٹائی میں مصروف تھا۔ اسکے علاوہ مختلف اوقات میں وہ اسلحے کی اسمگلنگ میں بھی ملوث رہا تھا۔ یہ کالے کام وہ اتنی صفائی سے کرتا تھا کہ ایک عرصہ گزرنے کے باوجود کسی کو اس کے کردار پر شبہ نہیں ہوا تھا لیکن کب تک؟.......... آخر رحمت کے والد سلطان خان کو باز خان کے کرتوتوں کی بھنک پڑ گئی' باز خان کو بھی پتا چل گیا کہ سلطان خان اس کے راز سے آگاہ ہو چکا ہے.......... نہایت ہوشیاری سے اس نے سلطان خان کو ترغیب دی کہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں چونکہ دونوں کا کام لکڑی کا ہے اور متعلقہ لوگوں سے تعلقات ہیں لہٰذا دونوں کو ایک دوسرے سے فائدہ ہوگا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ باز خان کی نظر سلطان خان کے ایک برادر نسبتی پر تھی۔ یہ شخص ہائی وے پولیس میں ایک کلیدی عہدے پر فائز تھا اور باز خان مال کی ترسیل میں اس سے مستقل فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجوہات تھیں کہ اس نے سلطان خان سے رشتے داری بنانے کی کوشش کی' دوسری طرف سلطان خان' باز خان کے عزائم سمجھ چکا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک نہایت خطرناک شخص ہے اور

دہشت گرد لوگوں سے اس کا رابطہ ہے لہٰذا وہ اس سے دور رہنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب رحمت نے درخو سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو اس نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا' بعد میں رحمت بیرون ملک چلا گیا' اس دوران باز خان نے اپنے راستے کا کانٹا ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا۔ اس نے سلطان خان کو قتل کرا دیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے میراں جان کو استعمال کیا' میراں جان اس کا ایک دور کا رشتے دار تھا اور ہر خطرناک کام کر گزرتا تھا۔ اس نے دوران سفر پہاڑی سڑک پر سلطان خان کی جیپ کو سائڈ ماری اور اسے دونوں سواروں سمیت سیکڑوں فٹ گہری کھائی میں پہنچا دیا۔ اس کارنامے کے عوض باز خان نے اسے درخو کا ہاتھ سونپ کر عزت بخشی اور اپنا دست راست بنا لیا۔ اس وقت اسے کہاں گمان تھا' ایک روز میراں جان کو مقدمہ قتل کا سامنا کرنا ہو گا۔

درخو بھی اپنے باپ کے دھندے اور اس کے گھناؤنے کردار سے آگاہ ہو چکی تھی لیکن وہ اس سے سخت خوفزدہ بھی تھی۔ رحمت کی وطن واپسی پر اس نے باپ سے بغاوت کی ایک کمزور سی کوشش کی لیکن باز خان نے اسے بری طرح سہما دیا۔ اس نے کہا کہ اس کی شادی اب میراں جان ہی سے ہوگی اور اگر اس نے رحمت سے ملنے کی کوشش کی تو باپ کی طرح اس کی جلی ہوئی لاش بھی کسی گہری کھائی سے ملے گی.......... ذہین درخو جانتی تھی یہ محض دھمکی نہیں لہٰذا اس نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے ہونٹ ہمیشہ کے لیے سی لیے۔ وہ دن رات جدائی کی آگ میں جلتی رہی مگر حرف فریاد زبان تک نہیں آنے دیا۔ یہاں تک.......... یہاں تک کہ اس سہ پہر کو میں نے اپنی میل بھری آنکھوں سے اس کی شفاف آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ "تیرے من پر کسی روگ کا سایہ ہے' کسی کو چاہتی ہے نا تو؟ اس کا نام "ر" سے شروع ہوتا ہے اور تیرا "د" سے.........."

پنڈی کے اسپتال میں چند روز بعد باز خان پر بیماری کا ایک اور حملہ ہوا۔ موت سے چند گھنٹے قبل اس نے وکیل کو جو وصیت نامہ لکھوایا اس میں ایک پیرا یہ بھی تھا "میں اپنی اکلوتی بچی کے ساتھ اب تک بہت ظلم کرتا رہا ہوں۔ وہ ایک مجرم باپ کی بیٹی ضرور ہے لیکن خود فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔ اگر سلطان خان کا بیٹا رحمت خان اب بھی اس سے شادی کا خواہاں ہے تو میں اس کا ہاتھ بخوشی رحمت خان کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ پرانے رواجوں کی وجہ سے ان دونوں خاندانوں میں بھی کوئی جان لیوا دشمنی چل نکلے' جس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے۔"

.... باز خان کی موت کے بعد اس کے اقبالی بیان کی روشنی میں پولیس نے

وسیع پیمانے پر کاروائی کی۔ کراچی سے خیبر تک کئی مجرم اور ان کے معاونین پکڑے گئے اور یوں جرائم کی ضخیم کتاب میں سے کم از کم ایک ورق پھاڑ لیا گیا......... میں رسمت اور درخو کی شادی تک وہاں رکنا چاہتا تھا لیکن میرے لیے بڑی مصیبت کھڑی ہو چکی تھی۔ میری شہرت اردگرد کی تمام بستیوں میں پہنچ چکی تھی۔ لوگ جوق در جوق اس پیر باکمال کو دیکھنے آرہے تھے جس نے راتوں رات پھونک مار کر جرائم کے ایک بہت بڑے برج کو الٹا دیا تھا اور پیر کھوہ کے امتحان میں بھی اس کی سچائی ثابت ہوئی تھی۔ کھوہ کے قریب باز خان کے چھ گماشتوں کی ہڈیاں پسلیاں توڑنے کو بھی میری ایک زبردست کرامت سمجھا جا رہا تھا۔

اس رات میرے منع کرنے کے باوجود رسمت خان دیر تک میری ٹانگیں دباتا رہا۔ آتش دان کے شعلے اس کے پر تفکر چہرے پر منعکس ہو رہے تھے۔

"کیا بات ہے رسمت؟" میں نے پوچھا۔

اس نے طویل سانس بھر کر کہا۔ "میں سوچتا ہوں پیر جی! درخو ایک لڑکی تھی۔ اسنے تو مجھ شادی شدہ کو قبول کر لیا مگر......... مگر اس عورت کا کیا بنے گا جسے لوگ میری بیوی کے طور پر جانتے ہیں میں اس سے علیحدگی ضرور اختیار کرنا چاہتا ہوں لیکن اسے بے سہارا کر کے پھینکنا نہیں چاہتا۔ میں اسے منزل پر پہنچانا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اس کے محبوب کو تلاش کروں اور اسے سب کچھ بتا کر اس بات پر راضی کروں کہ وہ اسے قبول کر لے۔ آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟ کیا وہ اسے قبول کر لے گا......... اور کیا دنیا والے اس صورت حال کو تسلیم کر لیں گے.........؟"

میں نے کہا۔ "میرے بھائی! میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟......... تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ بولا۔ "میری کشتی کنارے لگی ہے تو میں اس مظلوم کی کشتی بھی کنارے ضرور لگاؤں گا' چاہے کیسی بھی قربانی دینا پڑے۔"

میں نے روانی میں کہا۔ "میرا خیال ہے' کسی بڑی قربانی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر تم چاہو تو میں اس سے شادی کر لیتا ہوں۔"

"آ......... آپ پیر جی!" رسمت حیرت سے گنگ ہو رہا تھا۔

"ہاں میں......... بقلم خود۔" رسمت کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر پاؤں آگ کے پاس کیے اور ٹیک لگا کر کہا۔ "رسمت! تم اکثر پوچھتے ہو

کہ میں نے تم پر اتنی عنایت کیوں کی......... کیوں تمہارا اور درخو کا راستہ ہموار کرنے کے لیے خود کو شدید خطروں میں جھونکا اور باز خان سے ٹکر لی۔ اس سوال کا جواب چاہتے ہو نا؟"

"ہاں......... ہاں۔" رسمت نے کسی معمول کی طرح سر ہلایا۔

میں نے ابھی داڑھی کو لمبے ناخنوں سے کھجایا اور کہا۔

"تمہاری بیوی......... جو تمہاری بیوی نہیں ہے......... میری محبوبہ ہے میری محبوبہ کرن' میں اسی کے نام کا جوگ لے کر کئی مہینوں سے ان پہاڑوں میں بھٹک رہا ہوں........."

رسمت خان کرسی سے اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔ وہ حیرت ناک نگاہوں سے مجھے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے چولے کے اندر سے اخباری کاغذ کا وہ ٹکڑا نکالا جو ڈھائی ماہ پہلے مجھے مردان خان کے گھر پکوڑوں کے نیچے سے ملا تھا۔ "یہ دیکھو' یہی تمہاری بیوی ہے نا؟" میں نے تیل آلود تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" رسمت خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "پچھلے سال جنوری میں ہماری شادی ہوئی تھی۔"

درحقیقت یہ اخبار کوئی سوا برس پہلے کا تھا۔ میری معلومات کے بالکل برعکس کرن کی شادی پچھلے سال ہی ہو گئی تھی۔ میرے گھر چھوڑنے کے دو ہفتے بعد ہی کرن کے چچا فوت ہو گئے تھے اور اس کی چچی نے عجلت میں جیسے تیسے کرن کا بار سر سے اتار دیا تھا۔ اخباری کاغذ پر چونکہ صرف مہینہ اور تاریخ درج ہوتی ہے اس لیے میں یہی سمجھا کہ کرن کی شادی اسی برس ہوئی تھی۔

میں نے رسمت سے کہا۔ "میں ہی وہ شخص ہوں' جسے تم تلاش کرنے کی بات کر رہے تھے۔ اب کہو' تمہیں کرن کی کشتی کنارے لگانے میں زیادہ مشقت تو نہیں کرنا پڑے گی؟"

وہ منہ پھاڑے میری صورت دیکھے چلا جا رہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر برفانی ہوا سرپٹخ رہی تھی اور شب کی تیرگی وادی وادی اور چوٹی چوٹی ان کہی کہانیوں کا فسوں پھونک رہی تھی۔

☆.........O.........☆

ٹھیک ایک ماہ بعد جب اس پہاڑی بستی میں رسمت اور درخو رشتہ ازدواج میں

منسلک ہو رہے تھے' میں اپنی نوبیاہتا بیوی کرن کے ساتھ اسلام آباد کے بین الاقوامی ائر پورٹ پر کھڑا تھا۔ کرن کی شرمیلی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ میں کلین شیو اور تھری پیس سوٹ میں ہمیشہ سے زیادہ اسمارٹ نظر آرہا ہوں۔ ستاروں بھری چمکیلی ساڑھی میں وہ بھی کوئی حسین ساحرہ دکھائی دیتی تھی۔ یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ کرن اسی روز میری موجودگی سے باخبر ہو گئی تھی جب میں' کرن اس کی ساس اور اس کا ملازم خچروں پر سوار ان کے گاؤں روانہ ہوئے تھے۔ اس نے عقلمند عورت کی طرح اپنے لبوں پر مہر ثبت کرلی تھی اور خاموشی سے حالات کا اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی تھی۔ اپنے گھروالوں سے ملنے کو بہت دل چاہتا تھا لیکن ابھی میرا وہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ میں فی الحال انگلینڈ جارہا تھا جہاں رسمت کے ایک دوست کو میری رہائش اور روزگار کا انتظام کرنا تھا۔ وہاں سیٹل ہونے کے بعد ہی میں اپنے بچھڑے ہوؤں سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا جہاں تک کرن کا سوال تھا اس بیچاری کا اب دنیا میں اور کون تھا؟ چچی اور چچی کی اولاد سے اس کے روابط اتنے ہی تھے جتنے ایک دور پار کے ناپسندیدہ رشتے دار سے دوسرے رشتے دار کے ہو سکتے ہیں۔ کرن کی کچھ جائیداد تو چچا چچی ہتھیا چکے تھے' باقی اسلام آباد میں تھی ہمارا ارادہ تھا کہ ہم اسے فروخت نہیں کریں گے اور وطن واپسی کے لیے کسی اچھے وقت کا انتظار کریں گے۔ کسی ایسے وقت کا جب ہمارے معاشرے میں محبت کرنے والوں کے لیے حالات اتنے سخت نہیں رہیں گے' جب مہرو وفا کی رسم چلے گی اور جب اندھے سماج کے باغیوں کو معاف کرنے کا وتیرہ رواج پا جائے گا۔ یہ ہے تو انہونی خواہش لیکن رسمت کی زبان میں' جب انہونیاں تاج محل کی صورت ڈھل جاتی ہیں تو پھر انہونیاں نہیں رہتیں۔ ایک زمانہ آگرہ جا کر انہیں دیکھ سکتا ہے.......... انہیں چھو سکتا ہے۔

یہ اداس صبحیں
یہ اداس شامیں

محبت کرنے کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی یہ پھول لڑکپن میں ہی کھل اٹھتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی سحرانگیز محبت کی کہانی ہے۔ اس جیتی جاگتی کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسا نوجوان ہے جو اپنی محبت میں ہر حد سے گزر جانا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسی خوبرو عورت کی کہانی بھی ہے جس نے پارسائی اور گناہ کے درمیان ایک خود ساختہ حد بنا رکھی ہے۔ اپنے آپ سے اس کا وعدہ ہے کہ اس کا محبوب جب بھی یہ حد عبور کرنے کی کوشش کرے گا وہ اس سے دور چلی جائے گی..... یہ انہی گلی کوچوں کی کہانی ہے جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں' جہاں پابند جذبوں کی کونپلیں' پتھر سماج کا سینہ پھاڑ کر نمو پاتی ہیں۔

وہ پیدائشی عاشق تھا۔ اس نے پہلی محبت صرف تین سال کی عمر میں کی تھی "بلوکی" کے نزدیک سرکاری کوارٹرز میں وہ اپنے نانا نانی اور ماں کی ساتھ رہتا تھا۔ ایک چمکیلی آنکھوں والی ننھی گڑیا سی لڑکی اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن حامد اسے جوجی پکارتا تھا۔ حامد کو صرف اتنا یاد ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے پر مٹی اچھالتے تھے، پانی میں کھیلتے تھے اور کیچڑ میں لت پت ہو جاتے تھے۔ پھر جب حامد کے والد کو لاہور میں ملازمت مل گئی تو انہوں نے لاہور کے مضافات میں کرائے کا مکان لے کر حامد اور اس کی والدہ کو بلا لیا۔ لاہور آکر حامد ایک دم اداس ہو گیا تھا۔ وہ پہروں چارپائی پر لیٹا نیلے آسمان کو تکتا رہتا اور توتلی زبان میں پکارتا رہتا "گاؤں کی بہالیں تلی گئیں" (گاؤں کی بہاریں چلی گئیں) پھر کبھی کبھی وہ جوجی کا نام لیتا اور اس کا دل گہری اداسی سے بھر جاتا۔

لاہور میں حامد کو نئے ہمجولی ملے۔ نیا ماحول اور نئی مصروفیات میسر آگئیں۔ دھیرے دھیرے اس کا دل بہل گیا۔ وہ فطری طور پر شرمیلا اور کم آمیز تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز دوسروں سے مختلف تھا۔ ہر خوب صورت چیز اس کی کمزوری تھی۔ خوبصورتی کو دیکھ کر اس کے دل میں عجیب سا حزن و ملال بھر جاتا تھا۔ وہ ایک دم اداس اور غم زدہ ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر کی رومانیت ابھر کر سامنے آتی اور اس کے پورے وجود کو ڈھانپ لیتی۔ درحقیقت اس کے رومانی جذبوں پر انوکھے پن کی چھاپ تھی۔ اس کو انوکھا پن نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ ساڑھے پانچ سال کی عمر میں اس نے دوسری اہم محبت کی......... اور یہ محبت کسی ایک فرد سے نہیں تھی، پورے ایک گروہ سے تھی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اس نے اپنے ہی ہم عمر قریباً چار درجن بچوں سے محبت کی......... حامد کے گھر کے سامنے

سبزی کے کھیت تھے۔ کھیتوں سے آگے کھلا میدان تھا۔ یہاں اِکا دُکا نیم پختہ مکان موجود تھے۔ جہاں میدان ختم ہوتا تھا وہاں ایک اسکول کی دیوار شروع ہو جاتی تھی۔ دیوار کوئی پانچ فٹ اونچی ہو گی۔ بستی کے وہ بچے جو اسکول نہیں جاتے تھے وہ اس دیوار پر چڑھ کر بیٹھ رہتے اور اسکول کے وسیع احاطے کا نظارہ کرتے۔ حامد بھی ان بچوں میں شامل تھا (وہ اسکول کے بجائے سہ پہر کے وقت مسجد میں پڑھنے جاتا تھا) اسکول کے احاطے میں بچے "پی ٹی" کرتے تھے۔ کسی فنکشن کی تیاری ہو رہی تھی۔ رنگ برنگی وردیاں، چمکتے بوٹ، دمکتے چہرے، وہ ڈھول کی تھاپ پر ایک ساتھ پاؤں حرکت میں لاتے، ایک ساتھ جھکتے اور بدم کھڑے ہوتے۔ کبھی کبھی جب ٹیچر کسی کام سے اندر جاتے تو یہ شوخ و شنگ بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور اٹھکیلیاں کرتے۔ حامد کو یہ سارے ہنستے کھیلتے اور صحت مند بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کا دل اداسی اور غم سے لبریز ہو جاتا تھا۔ وہ گھنٹوں دیوار پر کسی مغموم پرندے کی طرح بیٹھا رہتا اور ان لڑکوں کو تکتا۔ وہ ان کے پاس جانا چاہتا تھا۔ ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا، انہیں چھونا چاہتا تھا لیکن وہ سب اس سے بہت دور تھے۔ وہ ماڈل اسکول میں پڑھنے والے امیر بچے تھے، وہ آریا نگر کا رہائشی گندہ اور غریب حامد تھا۔ وہ بس انہیں دور سے دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہی دوری تھی جو حامد کے دل میں کسک جگاتی تھی۔ وہ خوب صورت چیز سے اپنی دوری کو محسوس کر کے دن رات جلنے لگتا تھا اور اس کے عشق میں گرفتار ہوتا چلا جاتا تھا۔

اب یہ بھی کوئی بات تھی، وہ شب و روز ان چار درجن بچوں کے غم میں میں گھل رہا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے تصور میں سمائے رہتے۔ ان کی دید کا انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں پتھرانے لگتیں۔ وہ رات بھر خوابوں میں اپنے ان پیارے دوستوں کے ساتھ گھومتا۔ ان کے ساتھ کھیلتا، ان کے ہجوم میں ڈوب جاتا۔ صبح بیدار ہوتے ہی وہ جلدی جلدی ناشتا کرتا اور گھر کے سامنے والا میدان پار کر کے اسکول کی دیوار پر مغموم پرندے کی طرح بیٹھ جاتا۔

چند ہفتے یہ مشق جاری رہی، پھر اسکول کی انتظامیہ نے دیوار پر سے آریا نگر کے گندے بچوں کو بھگانا شروع کر دیا۔ چوکی دار لمبی چھڑی سے ان پر حملہ آور ہوتا اور دیوار سے نیچے اتار دیتا۔ چند روز بعد اسکول کی وہ دیوار آٹھ فٹ اونچی کر دی گئی......... حامد جدائی کی آگ میں تپنے لگا۔ اب وہ قریبی میدان میں بیٹھ کر بس بینڈ باجے کی آواز سنتا تھا اور آنکھیں بھگوتا تھا۔

کچھ عرصہ اسی طرح بیتا پھر حامد کی بے چین فطرت نے غم کھانے کے لیے ایک اور خوبصورتی ڈھونڈلی۔ وہ اس کی ننھی منی تایا زاد بہن تھی۔ حامد بھی تو چھوٹا سا تھا۔ بمشکل آٹھ سال کا رہا ہوگا۔ حامد کی تایا زاد کا نام شمیم تھا۔ وہ اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ وہ گاؤں سے ان کے ہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔ شمیم کی والدہ گاؤں کے گرلز اسکول میں ٹیچر تھیں اور وہ اس کے ساتھ تھیں۔ حامد سارا دن شمیم کے ساتھ کھیلتا۔ وہ ہاتھوں میں ہاتھ دے کر کھیتوں میں گھومتے، پگڈنڈیوں پر بھاگتے۔ مٹی کے گھروندے بناتے اور ان میں مٹی کے کھلونے رکھتے۔ شمیم اسے اچھی لگتی تھی لیکن کبھی کبھی وہ اس سے ناراض ہوجاتا اور اسے خوب پیٹتا تھا۔ ایسی مار کٹائی کے بعد وہ چند گھنٹے روٹھے رہتے مگر جلد ہی مان جاتے۔ بچپن کے کھیلوں کے نام بھی عجیب عجیب تھے۔ آنکھ مچولی، کیڑی کاڑا، روڑا چھپائی، اونچ نیچ، برف پانی اور پتا نہیں کیا کیا۔ جس کرائے کے مکان میں وہ رہتے تھے وہ اب ان کا اپنا ہو چکا تھا۔ حامد کے والد صاحب نے وسیع صحن میں ایک درمیانے سائز کا کمرا بھی بنوا لیا تھا۔ یہ دادا دادی کا کمرا تھا۔ دادا جی جب گھر سے باہر ہوتے حامد اور شمیم اس کمرے میں گھس جاتے اور پہروں ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے۔ یہ بڑی معصوم محبت تھی۔ خالص اور شفاف اس میں کسی طرح کی ملاوٹ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

○-----------☆-----------○

دو تین ماہ ان کے گھر رہ کر شمیم جب چلی گئی تو حسب توقع حامد ایک بار پھر غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ بستی کے در و بام ویران ہو گئے۔ گلیوں میں زرد اداسی رینگنے لگی۔ گھر کے آنگن میں چھوٹی چھوٹی یادوں کی کرچیاں بکھر گئیں۔ یہ کرچیاں آتے جاتے حامد کے چھوٹے چھوٹے پیروں میں چبھتیں اور وہ بے چین ہو جاتا۔ وہ اس بات پر کڑھتا کہ وہ شمیم کو کیوں مارتا تھا، کیوں اس سے لڑتا جھگڑتا تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ اور اپنی زیادتی کی تلافی کے لیے اسے ڈھیروں چیزیں کھلانا چاہتا تھا۔ آئس کریم، گول گپے، بسکٹ اور سب کچھ اپنے جیب خرچ سے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ دور جا چکی تھی اور خبر نہیں دوبارہ کب اس سے ملنا ہوتا۔

اس نے اپنے جیب خرچ میں سے کچھ پیسے اپنی والدہ کے پاس جمع کرانے شروع کر دیے "یہ کیوں جمع کر رہے ہو حامدی؟" والدہ نے پوچھا۔

"امی جب گرمیوں میں بھائی حسنات کی شادی پر گاؤں جائیں گے تو وہاں شمیم بھی ہوگی نا؟"

"ہاں ہوگی، کیوں نہیں ہوگی؟" حامد کی والدہ نے شلجم چھیلتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"بس، میں ان پیسوں سے ایک بہت خوبصورت، بہت ہی خوبصورت گڑیا خریدوں گا اور اسے دوں گا۔"

"تو بڑا خبطی ہے حامدی۔" والدہ نے پیار سے اسے چپت لگائی تھی "بس کوئی نہ کوئی دھن سوار رہتی ہے تیرے سر پر۔"

"شمیم بڑی اچھی ہے نا......... امی؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"ہاں بہت اچھی ہے۔" امی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولیں۔ "تم بڑے ہوگے تو تمہاری شادی اسی سے کر دیں گے۔"

شادی کا لفظ حامد کے لیے بے معنی تھا۔ اس نے یہ لفظ بڑی بے پروائی کے ساتھ سنا اور شلجم کے چھلکوں کو گھورتا رہا جو سردیوں کی اس سرد شام کو کچے صحن میں بکھرے پڑے تھے۔ اسے یاد آنے لگا کہ اسی جگہ ایسے ہی دو تین ہفتے پہلے بھی شلجم کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے اور شمیم اور وہ انہیں دھو دھو کر کھا رہے تھے۔

حامد کی طبع میں مستقل مزاجی بہت تھی۔ یا شاید یہ بھی ضد یا انا ہی کی کوئی قسم تھی جو عاشقوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے گلے میں آٹھ نو ماہ پیسے جمع کرتا رہا، یہاں تک کہ پورے ایک سو روپے ہو گئے۔ اب وہ شمیم کے لیے کوئی بہت ہی......... بہت ہی اچھی گڑیا خرید سکتا تھا۔ بالکل ویسی، جیسی شمیم نے ایک روز پسند کی تھی۔ سردیاں بھی گزر چکی تھیں۔ بہار کے دن آنے والے تھے۔ انہیں ایک دو ہفتوں کے اندر گاؤں جانا تھا۔

لیکن پھر ہوا کا رخ حالات کو کسی اور ہی طرف لے اڑا۔ ۷۱ء کی جنگ شروع ہو گئی۔ حامد کے تایا اور ان کے اہل خانہ ضلع نارووال کے ایک گاؤں مرشد پور میں رہتے تھے۔ یہ علاقہ جنگ کی زد میں تھا۔ وہ جوان رعنا جس کی شادی ہونے والی تھی، ایک اندھی گولی کا شکار ہو کر راہی عدم ہوا۔ بھاگ دوڑ کے دوران میں حامد کے تایا بھی (شمیم کے والد) شدید زخمی ہوئے۔ وہ لوگ نارووال سے فیصل آباد چلے گئے۔ یہاں دو تین ماہ بیمار رہ کر حامد کے تایا بھی انتقال کر گئے۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ حامد کے سب سے بڑے تایا نصیر الدین ان کو اپنے پاس کوئٹہ لے گئے ہیں جہاں وہ سول اسپتال میں ملازم ہیں۔ حامد کے گھر والوں کے تعلقات چونکہ بڑے تایا نصیر الدین سے ٹھیک نہیں تھے اور وہ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے نہیں تھے، حامد کے دل میں شمیم سے ملنے کی تمام

امیدیں دم توڑ گئیں۔ وہ مٹی کا گلہ اور اس میں جمع شدہ سو روپے اسی طرح گھر کی پرچھتی پر پڑے رہ گئے' اور حامد کے دل میں غم کی گرہ سی پڑ گئی۔

دھیرے دھیرے شمیم کی معصوم شبیہہ اس کی نگاہوں میں دھندلاتی چلی گئی۔ وقت کی گرد میں یادوں کے نقش مدہم ہونے لگے۔ اور نئی مصروفیات اپنی تمام تر تازگی اور قوت کے ساتھ اسے اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ والد صاحب کی مالی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ وہ سرکاری نوکری کے علاوہ ایک پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہے تھے۔ وہ خاص مذہبی ذہن کے شخص تھے۔ حامد کو دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے لیکن حامد کا ذہن اس طرف چلتا نہیں تھا۔ وہ چھپ چھپ کر کہانیاں اور رسالے پڑھتا۔ اس نے چھت پر برساتی میں ایک قلم اور کاپی بھی چھپا رکھی تھی۔ فارغ وقت میں وہ برساتی پر پہنچ جاتا۔ یوں ہی بیٹھ کر شعر جوڑتا یا کسی خیالی ہستی کے نام بے تکے خط لکھتا۔ والد صاحب نے مایوس ہو کر حامد کو ساتویں کلاس میں داخل کرا دیا۔ اس نے اسکول میں پہنچ کر اپنے جوہر دکھائے اور ایک سال میں دو جماعتیں پاس کر کے نویں میں پہنچ گیا۔

یہ بات نہیں تھی کہ مذہب کی طرف حامد کا رجحان ہی نہیں تھا۔ وہ نماز باقاعدگی سے پڑھتا' جمعے کے خطبات بڑی توجہ سے سنتا اور قیامت کا خوف تو اس کے دل میں یوں جاگزیں تھا کہ تیز ہوا بھی چلتی تو وہ اس خوف سے کانپ جاتا کہ کہیں یہ قیامت کی شروعات تو نہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ دنیا میں تو نہیں لیکن اس کی زندگی میں واقعی ایک قیامت آنے والی ہے۔ ایک ایسا چہرہ اس کی نگاہوں میں چمکنے والا ہے۔ جو اس کے دل و دماغ کو تہ و بالا کر دے گا اور اس کی زندگی ایک نہ ختم ہونے والے طوفان کی زد میں آجائے گی۔ ہاں جیسے شکر خورے کو شکر مل جاتی ہے' ایسے ہی غم خور کو غم اور "عاشق دل" کو تڑپنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ حامد کو بھی یہ بہانہ مل گیا۔

وہ اپریل کے دن تھے۔ وہی بہار کا موسم جب برف پگھلتی ہے' پھول کھلتے ہیں' جب پیڑوں پر بور آتا ہے اور دلوں میں انجانے میٹھے جذبوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ حامد نویں کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک روز وہ اوپر چھت پر بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ گلی میں کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے منڈیر کے جھرکوں میں سے جھانکا۔ ایک پیلی کالی ٹیکسی عبدل کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر ٹیکسی کے دروازے کھلے۔ اگلے دروازے سے عبدل نکلا' پچھلے دروازے سے ایک سیاہ برقع پوش وجود۔ برقع کے اندر سے دو گورے گورے ہاتھ جھانک رہے تھے۔ گورے ہاتھوں کے پیچھے کلائیاں تھیں۔ کلائیوں

میں چاندی کی چوڑیاں تھیں۔ چوڑیوں سے پیچھے سرخ چمکیلی قمیص کی آستینیں تھیں۔ یوں لگا جیسے کوئی نئی نویلی دلہن چھم سے ان کی سونی اور ویران گلی میں اتر آئی ہے۔ گورے ہاتھوں نے نقاب الٹا۔ وہ واقعی دلہن تھی۔ گلاب کا پھول' چودھویں کا چاند' خورشید تاباں یہ سارے استعارے اس چہرے کے سامنے حامد کو ہیچ محسوس ہوئے۔ وہ مسکرائی تو جیسے اس کے اردگرد کی ہر شے دمک اٹھی۔ حامد مبہوت اسے دیکھتا رہ گیا۔

عبدل کے ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس تھا۔ اس نے ٹیکسی والے کو کرایہ دیا اور سرخ پراندے اور مہندی لگی ایڑیوں والی دلہن کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ محلے میں جیسے ہلچل سی مچ گئی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں بھاگم بھاگ عبدل کے گھر پہنچ رہی تھیں۔ وہ اس کی دلہن دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ حامد کے گھر سے بھی اس کی والدہ اور دادی دلہن دیکھنے کے لیے لپک کر گئیں۔ شام تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ عبدل راج گیری کرتا تھا۔ عمر قریباً چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک معمولی شخص تھا۔ ایک معمولی گھر میں اپنے معمولی اہل خانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی تعلیم بھی معمولی تھی' یعنی صرف پرائمری پاس۔ پہلے وہ معماروں کے پیچھے ٹوکری ڈھوتا تھا۔ پھر کسی نہ کسی طرح اس نے اینٹیں لگانا سیکھ لیا۔ اب وہ پچاس روپے.......... دہاڑی کماتا تھا اور اس معمولی کمائی کے ساتھ معمولی دال روٹی کھا کر سو رہتا تھا۔ والدہ کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ یہی سبب تھا کہ گزر بسر ہو رہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے عبدل کی شادی کا چرچا تھا۔ ایک مہینہ پہلے معلوم ہوا تھا کہ عبدل کی منگنی مریدکے میں اپنے کسی رشتے دار کے ہاں ہو گئی ہے۔ مریدکے میں عبدل کا بڑا بھائی رہتا تھا۔ پروگرام کے مطابق عبدل کو اپنے بڑے بھائی کے گھر سے برات لے کر دلہن لینے جانا تھا اور یہ شادی وہیں پر انجام پانا تھی۔ یہ سب کچھ سن کر حامد کو یقین نہیں آیا تھا کہ عبدل جیسے شخص کی شادی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ دیکھنے میں ہی گاؤدی نظر آتا تھا۔ اوپر سے جسمانی ساخت بھی اس کی تمام دوسری صفات کی طرح معمولی تھی۔ کوتاہ قد' منحنی جسم' سانولا رنگ اور آگے کو جھکے ہوئے کندھے' جیسے اپنے معمولی ہونے کے سبب خود ہی شرمسار ہوں۔ عبدل کا سر پچکا ہوا تھا اور پیشانی چوڑائی میں بہت چھوٹی نظر آتی تھی۔ حامد نے کئی بار سوچا تھا' شاید ٹوکری اٹھا اٹھا کر اس کا سر واقعی پچک چکا ہے "ایسے پچلے ہوئے سر والے کو دلہن کون دے گا؟" وہ سوچتا۔

پھر اس نے خیال کیا تھا' شاید عبدل کی دلہن بھی اسی کی طرح بس ایویں ہو گی لیکن آج اس کے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ عبدل الف سے ے تک

معمولی تھا مگر اس کی دلہن معمولی نہیں تھی۔
چند دن تک تو حامد کو عبدل کی دلہن دکھائی نہیں دی پھر ایک دن وہ یوں "چھن"
سے اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی، جیسے گھپ اندھیرے میں ایک دم ہزار پاور کا بلب جل
اٹھے۔ حامد برساتی میں بیٹھا تھا اور علامہ اقبال کی نظم شکوہ کی تشریح کر رہا تھا۔ دروازے
سے اس کی والدہ اور دادی کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اچانک
اسے محسوس ہوا کہ دادی اور والدہ دروازے پر کھڑی ہیں، ان کے ساتھ کوئی اور بھی
موجود ہے اور وہ سب اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس نے سر اٹھایا تو اس کے سامنے
ہزار پاور کا قمقمہ روشن تھا۔ وہ سبز ریشمی جھلملاتے سوٹ میں تھی اور اس سبزے میں اس
کا چہرہ گلابی پھول کی طرح دمک رہا تھا۔ والدہ بولیں "یہ ہماری برساتی ہے اور یہ ہے میرا
بیٹا حامد۔ کل میں نے تم سے اسی کا ذکر کیا تھا۔"
"السلام علیکم۔" دلہن نے دلنشین تبسم کے ساتھ کہا۔
ایک گولا سا حامد کے گلے میں اٹک گیا۔ اس نے بھی جواباً السلام علیکم ہی کہا لیکن
آواز اتنی پھنسی ہوئی تھی کہ خبر نہیں کسی کے کان تک پہنچی یا نہیں۔ دلہن کے ہونٹوں
سے ہنسی کا ایک آبشار چھوٹا اور حامد جیسے بھیگتا چلا گیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر بے
تکلفی سے حامد کے سر پر ہاتھ رکھا اور بالوں کو بکھیر دیا "بڑا پیارا بچہ ہے۔" اس نے کہا۔
"اور شرمیلا بھی۔" حامد کی والدہ نے لقمہ دیا۔
حامد کچھ اور شرما گیا۔
"کس کلاس میں پڑھتے ہو؟" دلہن کی آواز نے اس کے کانوں میں جلترنگ
بجائے۔
"نائینتھ میں۔" حامد نے سنبھل کر کہا۔
"ماشاء اللہ" دلہن بولی اور پھر حامد کی والدہ کے ساتھ باتیں کرتی باہر نکل گئی۔
حامد کتنی ہی دیر اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ اس کے بالوں میں جیسے ابھی تک
پانچ حنائی انگلیاں رینگ رہی تھیں۔ چاندی کی چوڑیوں کی چھن چھن اس کے کانوں میں
تھی اور ایک دیوانی خوشبو اس کے دل و دماغ میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے
نظم "شکوہ" کی طرف دیکھا۔ لیکن "نظم" کتاب کے صفحے پر سے صاف غائب ہو چکی تھی۔
وہاں ایک دلنشین متبسم چہرہ چمک رہا تھا۔ یہ عبدل کی دلہن کا چہرہ تھا۔
عبدل کی دلہن نے محلے میں بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ جگہ بنائی۔ اس کا

نام فرخندہ تھا۔ وہ میٹرک پاس تھی۔ والد "مریدکے" میں سلمے ستارے کا کام کرتے تھے۔
پتا نہیں عبدل کی قسمت میں کیسی چمک تھی کہ اس گاؤدی کو فرخندہ جیسی دلہن مل گئی
تھی۔ یا پھر یہ شاید ان.......... مجبوریوں کا شاخسانہ تھا جو بیٹیوں کے سلسلے میں غریب اور
متوسط گھرانوں کا مقدر ہوتی ہیں۔ بہرحال اب یہ ایک حقیقت تھی کہ اونچی لمبی، خوب رو
اور ذہین فرخندہ کوتاہ قد، سانولے اور گاؤدی عبدل کی بیوی تھی۔ ان دونوں کی عمروں میں
کچھ زیادہ فرق نہیں تھا بلکہ ذہانت اور متانت کے اعتبار سے دیکھا جاتا تو فرخندہ شوہر سے
بڑی ہی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ایک خوش اخلاق، ہنس مکھ اور ہمدرد لڑکی تھی۔ اس کے
کردار کی سب سے اہم صفت یہ تھی کہ وہ ہر کسی کی بات بڑے غور سے دھیان سے سنتی
تھی اور بات کرنے والے کے غم یا خوشی میں شریک ہو جاتی تھی۔
یہی وجہ تھی کہ وہ آناً فاناً محلے بھر کی عورتوں میں مقبول ہو گئی تھی۔ کسی دانا کا یہ
قول سچ ثابت ہو رہا تھا کہ زیادہ سننے والے اور کم بولنے والے کی پذیرائی ہر محفل میں
ہوتی ہے۔
عبدل کا گھر حامد کے گھر کے بالکل سامنے واقع تھا۔ فرخندہ اکثر حامد کے گھر بھی
آجاتی تھی۔ حامد کی والدہ سے اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ محلے کی اکثر عورتیں حامد کی
والدہ کو آپا کہتی تھیں، فرخندہ بھی بڑی اپنائیت سے آپا کہنے لگی تھی۔ وہ گھنٹوں ان کے
ساتھ باتیں کرتی اور جب ان کے پاس بیٹھی ہوتی تو یوں لگتا جیسے وہ بھی کوئی بڑی بوڑھی
ہے لیکن کچھ ہی دیر بعد جب وہ اپنے گھر کے آنگن میں عبدل کے ساتھ باتیں کرتی نظر
آتی تو اس کے انگ انگ سے شباب اور شوخی کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوتے۔ ان
دونوں کو باتوں میں محو پا کر نجانے کیوں حامد کا سینہ سلگنے لگتا۔ اسے عبدل کی قسمت پر
رشک آتا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی اداسی اس کے دل میں بھری جاتی۔
اسے یوں لگتا جیسے وہ ماڈل اسکول کی دیوار پر بیٹھا ہے اور بے وجہ بے سبب غم کے سمندر
میں غرق ہوتا جا رہا ہے۔
ان دنوں برسات شروع ہونے والی تھی۔ جن مکانوں کی چھتیں کچی تھیں وہ مٹی
وغیرہ ڈال رہے تھے اور لیپ کر رہے تھے۔ عبدل کے گھر کی چھت پر بھی لیپ ہونے والا
تھا۔ فرخندہ نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ایک روز حامد نے اپنی چھت پر سے ان کے
آنگن میں جھانکا، تو وہ کمر سے دوپٹا باندھے کمر بستہ نظر آئی۔ صحن میں کسی اور کڑاہیاں
وغیرہ نظر آرہی تھیں اور مٹی کو بھگو کر "گانی" کی جا رہی تھی۔ محلے کی دو تین ہوا ان

لڑکیاں بھی رضاکارانہ طور پر فرخندہ کا ساتھ دے رہی تھیں۔ آخر وہ بھی تو اسی طرح دوسروں کے کام آتی تھی۔ چھت پر لیپ کرنے کا کام بڑے خوش گوار ماحول میں جاری تھا۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی چل رہا تھا۔ حامد بڑی محویت سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ بڑی محویت سے فرخندہ کو دیکھنے لگا۔ جب فرخندہ سامنے ہوتی تو وہ صرف فرخندہ کو ہی دیکھتا تھا۔ ایک عجیب سی خود فراموشی اس پر طاری ہو جاتی تھی......
اس کی نظر مستقل فرخندہ کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ جھکتی تو نظر بھی جھک جاتی، وہ اٹھتی تو نظر بھی اٹھتی، وہ مسکراتی تو حامد کی نظر بھی مسکرانے لگتی۔ اپنی اس کیفیت کا اسے خود بھی علم نہیں تھا۔ پختہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک لڑکی کا پاؤں پھسلا اور کڑاہی اس کی سر پر ڈول گئی۔ پتلا پتلا گارا پیچھے آتی فرخندہ پر الٹ گیا "ہائے تیرا بیڑا غرق سکینہ۔" فرخندہ چیخی اور اپنے سر اور چہرے سے گارا پونچھنے لگی۔

حامد کے حلق سے بے اختیار ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ لڑکیوں نے چونک کر اوپر منڈیر کی طرف دیکھا۔ سکینہ نے چیخ کر کہا "اوئے حامدی، تو یہاں کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟"

ثریا بولی "لگتا ہے کسی کو تاڑ رہا ہے۔"

سکینہ بولی "تجھی کو تاڑ رہا ہوں گا۔ ہم تو بھئی شادی شدہ ہیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے کسی شادی شدہ کو ہی تاڑ رہا ہے۔" ثریا نے جواب دیا۔

"تو پھر ضرور فرخندہ کو تاڑتا ہو گا۔" سکینہ نے لقمہ دیا۔

"مجھے کیوں تاڑے گا۔ میرا تو چھوٹا سا منا سا بھائی ہے۔" فرخندہ نے بلند آواز میں کہا پھر حامد سے مخاطب ہو کر بولی "اے حامدی! سچ بتا مجھے تو نہیں دیکھ رہا تھا؟"

حامد کا چہرہ شرم سے سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ بڑبڑا کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور چارپائی پر آبیٹھا۔ قریباً چار فٹ اونچی پختہ منڈیر کے اندر چھوٹے چھوٹے مستطیل رخنے موجود تھے۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر بھی ان رخنوں میں سے فرخندہ کے آنگن کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ فرخندہ اور دونوں لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ حامد نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اب کسی اور بات پر ہنس رہی ہیں۔ فرخندہ کا سر، چہرہ اور گریبان کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا۔ اس نے بالٹی میں ڈونگا ڈبویا اور کھڑے کھڑے اپنا منہ سر دھونے لگی۔ سر اور چہرے سے کیچڑ صاف ہو گئی۔ اندر سے دھلا دھلایا سفید گلاب نکل آیا۔ بالائی جسم دھونے کی کوشش میں اس کے سارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ حامد کے لیے یہ نظارہ اور دلکش ہو گیا۔ بھیگے لباس کے ساتھ سیڑھیاں

چڑھتی اور اترتی ہوئی فرخندہ اسے بہت اچھی لگی۔ بالکل جل پری، جس کا جسم نیلی جھیل میں تیرتے کنول کی طرح ڈولتا تھا۔ تاہم حامد کے ان محسوسات میں کسی طرح کی بداخلاقی کو دخل نہیں تھا۔ وہ بس اسے خوب صورت لگ رہی تھی۔ بالکل جیسے جو.جی اچھی لگتی تھی۔ ماڈل اسکول کے بچے اچھے لگتے تھے۔ اس کی محبت میں محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بالکل خالص محبت تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ لڑکیوں کی فقرے بازی کا غصہ بھول کر پھر منڈیر پر جا کھڑا ہوا۔ وہ بھی اب قدرے سنجیدہ نظر آتی تھیں۔ فرخندہ نے ناز سے کہا "اے حامدی! تھوڑا سا کام تو کر دے ہمارا۔"

"کیا کرنا ہے؟" اس نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔

اندر سے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ فرخندہ نے پہلی بار اسے کسی کام کے لے کہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ سرتاپا اطاعت بن جائے اور اگر وہ اسے دنیا کے آخری کونے تک بھی بھیجے تو سرپٹ بھاگتا چلا جائے۔

فرخندہ بولی "ہائے ہائے، ذرا نیچے تو آ۔ ہم تجھے کھا تو نہیں جائیں گے۔"

سب کھلکھلا کر ہنس دیں "اچھا آتا ہوں۔" حامد نے کہا۔

اس نے اپنی دھڑکنیں سمیٹیں۔ زینے اترا اور گلی پار کر کے فرخندہ کے آنگن میں پہنچ گیا۔ فرخندہ نے اوڑھنی کے پلو سے چند روپے کھول کر اس کے ہاتھ میں تھمائے "حامدی! ذرا چوک تک جانا ہو گا۔ حاجی کی دکان سے چار کلو سفیدی اور ایک کوچی لے آؤ۔"

"اور تھوڑا سا نیل بھی۔" سکینہ نے لقمہ دیا۔

"کیا کرو گی اتنی سفیدی؟" حامد نے پوچھا۔

"بھئی ہمارا پروگرام بنا ہے کہ لگے ہاتھ کمروں میں سفیدی چونا اور رنگ و روغن بھی کرڈالیں۔" فرخندہ نے جواب دیا۔

"یہ سب کچھ تم خود کرو گی؟"

"تو اور کیا نوکر کریں گے۔ اپنا گھر ہے۔ اپنا کام خود کرنے میں کیا حرج ہے۔" وہ بولی۔

اس نے جس اپنائیت سے "اپنا گھر" کہا تھا وہ حامد کو کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس کے دل میں پھر عبدل اور اس کے گھر کے بارے میں حسد جاگ اٹھا۔ بہرطور اس نے روپے

تھامے اور بھاگم بھاگ بازار پہنچ کر مطلوبہ سامان لے آیا۔

ایک بڑے ٹب میں سفیدی بھگو دی گئی۔ سفیدی کو رات بھر بھیگنا تھا۔ فرخندہ لڑکیوں کے ساتھ مل کر کمروں کا مختصر سامان برآمدوں میں رکھنے لگی...... کرسیاں' میز' بستر' برتن' کپڑے۔ غیرارادی طور پر حامد بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اسے یہ سب کچھ بہت...... بہت دلچسپ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا یہ مصروفیت کبھی ختم نہ ہو۔ سامان اسی طرح کمروں سے نکل نکل کر برآمدے میں ڈھیر ہوتا رہے۔ فرخندہ کی مخصوص مہک بار بار اس کے قریب آتی رہے اور دور جاتی رہے لیکن وہ ایک غریب گھر کا سامان تھا۔ کتنی دیر کمروں سے نکلتا رہتا۔ جلدی ختم ہو گیا اور حامد کو برے دل کے ساتھ گھر لوٹنا پڑا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ فرخندہ میں حامد کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے پاس گزارنے کی کوشش کرتا۔ بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتا۔ کبھی وہ اس کے گھر چلا جاتا' کبھی وہ ان کے گھر آجاتی۔ وہ نویں کلاس میں پڑھتا تھا اور فرخندہ دسویں کر چکی تھی لیکن حامد میں ایک خاص قسم کا ادبی ذوق موجود تھا اور اس ذوق کی موجودگی میں وہ خود کو فرخندہ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور لائق سمجھتا تھا۔ اکثر وہ شعر جوڑتا تھا۔ اس کے شعر ویسے ہی ہوتے جیسے نویں' دسویں کلاس کے اردو کورسز میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنے یہ شعر فرخندہ کو دکھاتا اور اس پر اپنی علمی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتا۔ فرخندہ ناک چڑھا کر کہتی "حامدی! تیرے شعر بڑے روکھے پھیکے ہوتے ہیں۔" پھر ایک دم پینترا بدلتی۔ "ویسے ٹھیک ہی ہے۔ چھوٹی عمر میں ایسے ہی اچھے اچھے شعر لکھنے چاہئیں' خراب شعر لکھنے کو تو ابھی عمر پڑی ہے۔"

حامد کو یہ بات بڑی بری لگتی تھی' اسے فرخندہ کی ہر وہ بات بری لگتی تھی جو اسے یہ احساس دلاتی کہ وہ بچہ ہے' معصوم ہے' ننھا منا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فرخندہ اسے ننھا منا سمجھے۔ وہ ایک دم ناراض نظر آنے لگتا۔ فرخندہ فوراً کانوں کو ہاتھ لگاتی "اچھا علامہ صاحب! میری توبہ' مجھے معاف کیجئے۔ اب آپ کے شعروں کو روکھا پھیکا نہیں کہوں گی۔"

اس کا انداز حامد کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیتا۔ ایسے میں حامد کی والدہ کہتیں "فرخندہ! یہ تو بالکل عاشق ہے تیرے اوپر۔ مجھے پہلے پتا ہوتا تو عبدل کی جگہ اسے تیرا دلہا بنا دیتی۔"

فرخندہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ حامد غصے سے ماں کی طرف دیکھتا "امی کیا

الٹی سیدھی باتیں کرتی ہیں آپ۔"

"اور تم جو الٹی سیدھی کرتے ہو۔" امی کہتیں "ہر وقت امی کے پاس گھسے رہتے ہو۔ میرے چاند' اب ماشاءاللہ جوان ہو تم اور جوان مرد عورتوں کے پاس نہیں بیٹھتے۔"

"ہائے آپا' آپ بھی کیا کرتی ہیں۔" فرخندہ کہتی "یہ جوان ہے؟ یہ تو ہمارا ننھا سا بلونگڑا ہے۔"

ایسے خطابات پر حامد کا موڈ ایک بار پھر بگڑ جاتا۔ حامد کی والدہ اور فرخندہ لگاتار ہنسنے لگتیں۔

ایک ایسے ہی موقع پر عبدل کھنکھارتا اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر فرخندہ سنجیدہ ہو گئی اور اس نے سر اوڑھنی کے پلو سے ڈھانپ لیا۔ عبدل نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے اور بولا "فرخندہ جی! تم یہاں ہو' میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈ رہا تھا۔"

"پھوپا بشیر آیا ہے کراچی سے۔ وہاں اس نے ایک بڑی کوٹھی کا ٹھیکا لیا ہے۔"

"تو کیا یہی خوش خبری سنانے آیا ہے؟" فرخندہ نے پوچھا۔

"نہیں اور بات بھی ہے۔ چل گھر آ بتاتا ہوں تجھے۔"

"اچھا تو چل' میں ابھی آتی ہوں" فرخندہ نے شوہر سے کہا۔

"ذرا جلدی آنا فرخندہ جی۔ پھوپا کو چائے پانی بھی پوچھنا ہے۔"

"اچھا......... اچھا۔" فرخندہ نے قدرے بے زاری سے کہا۔

اس کی بے زاری محسوس کر کے عبدل جلدی سے اٹھ گیا۔ جیسے وہ کوئی غلام ہو اور اسے اپنی ملکہ کی خفگی کا ڈر ہو۔ فرخندہ کے سامنے وہ ایسے ہی دبا دبا اور گھٹا گھٹا رہتا تھا۔ فرخندہ ہر اعتبار سے عبدل پر فوقیت رکھتی تھی اور اس کی یہی فوقیت غالباً عبدل کو احساس کمتری میں مبتلا کر چکی تھی' ورنہ فرخندہ کی طرف سے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ حتی الامکان اس کی عزت کرتی تھی بلکہ اتنی عزت کرتی تھی کہ عبدل کو ہضم ہی نہیں ہو پاتی تھی اور عبدل کے ساتھ ساتھ شاید حامد کو بھی ہضم نہیں ہوتی تھی۔ وہ عبدل جیسے گاؤدی کی یہ عزت افزائی دیکھ کر جل کڑھ جاتا اور نجانے کیوں شدید حسد محسوس کرنے لگتا۔

اس شام عبدل نے فرخندہ سے کیا خاص بات کہی تھی' اس کا انکشاف تیسرے روز سہ پہر کو ہوا۔ حامد پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ عبدل اور اس کی بیوی فرخندہ کراچی جا رہے ہیں اور اب کچھ عرصہ وہیں رہیں گے۔ دراصل عبدل کا پھوپا اسے لینے کے لیے ہی

لاہور آیا تھا۔ اس نے کراچی میں کسی رہائشی عمارت کا ٹھیکا لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی قابل اعتماد کارندہ اس کے پاس ہو' جو تعمیر کا کام بھی کرے اور دیگر مزدوروں کے کام کی نگرانی بھی کرے۔ اس سلسلے میں اس کی نگاہ کرم اپنے رشتے دار عبدل پر پڑی تھی۔ اب وہ مفت رہائش اور خوراک کی یقین دہانی پر اسے اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔ ظاہر ہے فرخندہ کو بھی ساتھ جانا تھا۔

حامد یہ خبر سن کر جلدی سے چھت پر گیا اور منڈیر کے جھروکوں میں سے فرخندہ کے گھر جھانکنے لگا۔ وہاں چارپائی پر ایک تنومند شخص بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی مونچھیں گھنی اور کلف زدہ تھیں۔ یہی عبدل کا پھوپا تھا۔ نجانے کیوں یہ شخص حامد کو اچھا نہیں لگا تھا۔ عبدل اپنے مچھیل پھوپا کے پاس ہی زمین پر بیٹھا تھا اور ایک سوٹ کیس بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرخندہ اندر برآمدے میں تھی اور ضروری سامان باندھ رہی تھی۔ حامد کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ وہ ایک ٹک فرخندہ کو دیکھتا چلا گیا۔ ماں کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ نجانے کب اس کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔ "حامد! جا بیٹا' جاکر مل آ عبدل اور فرخندہ سے۔ وہ جا رہے ہیں۔"

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔" وہ جل کر بولا تھا۔

"اچھا چل' فرخندہ سے مل آ۔"

"میں کیوں جاؤں؟"

"ہائے ہائے' اتنا پیار کرتی ہے تجھ سے۔ اب جا رہی ہے۔ پتا نہیں کب آئے گی۔ اسے خدا حافظ تو کہہ آ۔"

"جا وہ رہی ہے۔ میں تو نہیں جا رہا۔ وہ خود خدا حافظ کہنے آجائے۔"

"بگلے' آئی تھی وہ .... تو غسل خانے میں گھسا ہوا تھا' بیٹھ کر چلی گئی۔ کہتی تھی حامد کو بھیجنا۔"

"میں نہیں جاتا۔" اس نے کھٹاک سے کہا اور نیچے اتر گیا۔ نہ صرف نیچے اترا بلکہ ڈیوڑھی طے کر کے دروازے پر آیا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ گلی کے آخری سرے پر پہنچا تو اس نے ایک تانگا دیکھا۔ وہ فرخندہ کے گھر کے سامنے رک رہا تھا۔

حامد چلتا رہا اور بستی سے باہر نکل آیا۔ بستی سے آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ کھیتوں سے آگے جامن اور امرود کا چھوٹا سا باغ تھا۔ بڑی ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ وہ باغ کے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا اور شاخوں کی اوٹ سے اس راستے کو دیکھنے لگا جو

بستی سے نکل کر وسطی شہر کی طرف جاتا تھا۔ آدھ پون گھنٹے بعد اسے وہ تانگا نظر آیا جو عبدل اور فرخندہ کو اسٹیشن کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس نے دور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے صرف فرخندہ کی سبز اوڑھنی نظر آئی۔ وہ عبدل کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ ساتھ عبدل کی ماں بھی تھی۔ اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ مچھیل پھوپا براجمان تھا۔ حامد تانگے کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ حامد کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔

اندھیرا گہرا ہونے پر وہ گھر واپس لوٹا تو عبدل کے مکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ حامد گھر میں داخل ہوا تو ہر شے ویران اور سونی نظر آئی۔ باورچی خانے کی زرد روشنی میں اس کی والدہ روٹی پکا رہی تھیں۔ والد کمرے میں بیٹھے صبح کا باسی اخبار دیکھ رہے تھے۔ دادی اماں نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ حامد نے کھنکار کر اپنی واپسی کا اعلان کیا اور پھر سیدھا اوپر برساتی میں چلا گیا۔

O------------☆------------O

فرخندہ کے جاتے ہی آریا نگر ایک دم ویران ہو گیا تھا۔ حامد پہروں چھت پر لیٹا رہتا اور اس سنسان آنگن کو دیکھتا جہاں فرخندہ کا رنگین آنچل لہراتا تھا اور اس کی کھنکتی آواز گونجتی تھی۔ اس آنگن میں اب اداسی کی زرد دھول پھیلی تھی۔ اور تنہائی مکڑی کے جالوں کی طرح لٹک رہی تھی۔ وہ انگور کی بیل جسے فرخندہ روز اپنے ہاتھ سے پانی دیتی تھی' کملائی ہوئی تھی۔ فرخندہ کی ایک ایک بات حامد کو یاد آتی اور اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ وہ بڑے درد کے ساتھ سوچتا۔ کیا فرخندہ بھی اسے یاد کرتی ہے۔ کیا وہ بھی اس کے بارے میں سوچتی ہے۔ کبھی کبھی اسے افسوس ہونے لگتا کہ اس نے جاتے وقت فرخندہ اور عبدل کو الوداع کیوں نہیں کہا تھا۔ آخر اسے کیا ناراضگی تھی عبدل اور فرخندہ سے اور خاص طور سے فرخندہ نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے کہنے پر اس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے کیا جرم کیا تھا لیکن جلد ہی غم و غصہ پھر اس پر غالب آجاتا۔ نجانے کیوں اس کے ذہن میں بے معنی شکوے چیخنے چلانے لگتے۔ یہاں سے جانے کے بعد عبدل اور فرخندہ کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ ٹیلی فون کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی خط پتر بھی نہیں تھا۔

کوئی دو ماہ بعد جب ایک روز حامد اسکول سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ فرخندہ کے گھر کا مقفل رہنے والا دروازہ کھلا ہے اور اندر کوئی گھوم پھر رہا ہے۔ مسرت کی ایک

بلند لہراس کے سینے سے اٹھی اور پورے جسم کو سنسنا گئی "تو کیا فرخندہ واپس آگئی ہے؟"
اس نے بے چین ہو کر سوچا اور دروازے کی طرف لپکا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوا' اس کی نگاہ عبدل پر پڑی۔ وہ انگور کی بیل کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے قریب حامد کی والدہ اور محلے کی دو تین دوسری عورتیں بھی موجود تھیں۔ وہ سب باتیں کر رہے تھے۔ حامد کی نظر برق کی طرح گھر کے طول و عرض میں لہرا گئی۔ اسے فرخندہ کہیں نظر نہیں آئی۔

حامد کی والدہ نے کہا "لو حامد بھی آگیا۔"

"السلام علیکم۔" حامد نے ٹھٹھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وعلیکم السلام علیکم ورحمتہ اللہ حامد باؤ۔" عبدل نے اپنے مخصوص انداز میں دانت نکالے "اور سناؤ کیا حال شال ہے۔ امتحان کب شروع ہو رہا ہے تمہارا؟"

"بس ہونے ہی والا ہے۔" حامد نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ "اور......... تم......... سناؤ اکیلے ہی آئے ہو؟"

"ہاں باؤ یار۔ کچھ ضروری سامان رہ گیا تھا وہ لینے آیا ہوں۔ دراصل وہاں کام کچھ لمبا ہو گیا ہے نا......... پھوپے بشیر کو دو کوٹھیوں کا ٹھیکہ اور مل گیا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ سردیاں تو ہمیں کراچی میں ہی گزارنا پڑیں گی۔"

حامد کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اڑنے لگی تھیں۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ کندھے پر بستہ اسے منوں وزنی محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے بستہ اتار کر آہستگی سے چارپائی پر رکھ دیا۔ محلے والیاں عبدل سے باتوں میں مصروف تھیں۔ وہی کراچی کی باتیں۔ کام کاج کی باتیں۔ روز افزوں مہنگائی اور محدود آمدن کی باتیں۔ حامد بڑے دھیان سے یہ باتیں سنتا رہا اور منتظر رہا کہ ان باتوں میں کہیں فرخندہ کا ذکر بھی آئے اور اسے فرخندہ کا حال احوال معلوم ہو لیکن یوں لگتا تھا کہ یہ ذکر اس کے آنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ وہ مایوس سا ہونے لگا اور اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر چل دے اور عبدل کو خدا حافظ کہے بغیر بیرونی دروازے سے نکل جائے لیکن عین اسی وقت عبدل کی آواز نے اس کے قدم تھام لیے۔ وہ بولا "حامد باؤ! فرخندہ تو بڑا یاد کرتی ہے تجھے۔ ہر وقت تیری باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ ہی یہاں کا ایک چکر لگا جائے مگر وہاں ماں کے پاس بھی تو کسی کو رہنا تھا نا۔"

حامد کے سینے میں انجانی مسرت کے ہزاروں شادیانے بج اٹھے۔ اس کے کان کچھ

اور سننے کے لئے یوں بے تاب ہو گئے جیسے غوطہ خور ایک طویل کٹھن غوطے کے بعد سانس لینے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔

حامد کی والدہ نے پوچھا۔ "وہ ٹھیک ٹھاک تو ہے نا عبدل؟"

"اب تو ٹھیک ہے' بس پچھلے دنوں کچھ بیمار ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا۔ گم صم پڑی رہتی تھی۔ دس بارہ روز دوائی کھائی۔ دوائی سے تو ٹھیک نہیں ہوئی لیکن جب دوائی چھوڑ دی تو بھلی چنگی ہو گئی۔"

حامد کے سینے میں گونجتے ہوئے شادیانوں کی آواز فلک شگاف ہو گئی۔ اس کے جسم میں انبساط کی انجانی لہریں دوڑنے لگیں۔ نجانے وہ کب عبدل کے گھر سے نکلا اور کب اپنے گھر کے زینے طے کر کے برساتی میں پہنچ گیا۔ اس کے کانوں میں بار بار عبدل کے الفاظ گونج رہے تھے "بس پچھلے دنوں کچھ بیمار ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا۔ گم صم پڑی رہتی تھی......... پتا نہیں کیا تھا۔" نجانے کیوں حامد کا دل گواہی دینے لگا کہ فرخندہ بھی اسے یاد کرتی ہے۔ اس کے گم صم رہنے کی وجہ وہ خود تھا......... وہ خود تھا۔

اگلے روز عبدل واپس چلا گیا۔ فرخندہ کے گھر کا آنگن پھر ویران تر ہو گیا لیکن حامد کے لئے اس ویرانی میں اب ایک پہلو اطمینان کا بھی تھا۔ فرخندہ کے لیے اس کا بے معنی غم و غصہ اب دور ہو چکا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جیسے وہ فرخندہ سے محبت کرتا ہے' فرخندہ بھی اس سے کرتی ہے۔ انہی دنوں اس کی نگاہ الماری میں مٹی کے اس گلے پر پڑی جو چھ سات برسوں سے جوں کا توں رکھا تھا۔ ایک مرتبہ حامد نے اس گلے میں سو روپے جمع کیے تھے۔ ان روپوؤں سے وہ اپنی تایا زاد شمیم کو کوئی تحفہ دینا چاہتا تھا۔ اب وہ تحفہ لینے والی کہیں دور جا چکی تھی۔ اس کی یاد بھی مٹتے مٹتے حامد کے ذہن سے مٹ چکی تھی لیکن یہ گلہ اسی طرح الماری میں پڑا تھا۔ حامد نے تایا زاد شمیم کے بارے میں سوچا اور اسے وہ کوئی اجنبی لڑکی محسوس ہوئی' جس کے لیے اس نے بے کار میں سنہری تاروں سے خواب بنے تھے۔ اسے اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا کہ وہ شمیم کے بارے میں ایسی دیوانگی سے کیوں سوچا کرتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گلے میں مزید رقم جمع کرے گا اور تب تک جمع کرتا رہے گا جب تک سردیاں گزر نہیں جاتیں اور فرخندہ واپس لاہور آ نہیں جاتی اور جب وہ واپس آجائے گی تو وہ اسے کوئی بہت اچھا......... بہت اچھا سا تحفہ پیش کرے گا۔ ایسا تحفہ جو حامد کی محبت ہی کی طرح قیمتی اور یادگار ہو گا۔ اس نے برسوں بعد ایک بار پھر گلے میں رقم جوڑنا شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ وہ منصوبے بھی بناتا رہا کہ

فرخندہ کو کیا تحفہ دے گا۔ کبھی وہ سونے کے جھمکوں کے بارے میں سوچتا۔ کبھی کسی بہت خوب صورت گھڑی کے بارے میں۔ کبھی کسی طلائی چین کے بارے میں جو حامد کی پر خلوص محبت کی نشانی بن کر ہمیشہ فرخندہ کے سینے سے لگی رہتی۔

انہی دنوں حامد کے میٹرک کے امتحان شروع ہو گئے۔ دو ڈھائی ماہ کے لیے وہ کتابوں میں کھو سا گیا۔ فرخندہ کے تصور کے سامنے اس نے ہاتھ باندھ کر اسے خود سے دور کھڑا کر دیا تھا........ لیکن جوں ہی امتحانات ختم ہوئے' یہ تصور ایک بار پھر پوری شدت سے اس پر حملہ آور ہو گیا۔ اس مرتبہ اس تصور میں ایک نئی کیفیت تھی۔ ایسی کیفیت جو حامد نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے حامد کی محبت کا تعلق تین حواس سے تھا۔ یعنی دیکھنا' سننا اور سونگھنا۔ وہ فرخندہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی شیریں آواز سننا چاہتا تھا اور اس مہک میں کھویا رہنا چاہتا تھا جو اس کے جسم اور اس کی ذات سے پھوٹتی تھی لیکن اب حامد کی محبت حواس خمسہ کی محبت بنتی جا رہی تھی۔ یعنی چھونے اور چکھنے کی حسیں بھی اس میں شامل ہو رہی تھیں۔ اس کا دل چاہتا جب فرخندہ واپس آجائے اور تنہائی میں اس کے قریب بیٹھے اور یہ کہے کہ وہ اسے بہت یاد کرتی رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں پیار کا سمندر کروٹ لیتا نظر آئے تو وہ اسے چھو لے۔ بڑی آہستگی اور بڑی ملائمت کے ساتھ' پھر اسے چھو کر وہ یوں ہی بیٹھا رہے۔ دیر تک' مدتوں تک' صدیوں تک۔ نہ اسے اپنے پاس سے اٹھنے کی اجازت دے۔ نہ خود اس کے پاس سے اٹھ کر کہیں جائے۔ ساری دنیا جن میں عبدل بھی شامل ہو' چیخ چیخ کر فرخندہ کو بلاتی رہے۔ لیکن فرخندہ یوں ہی بت بنی اس کے پاس بیٹھی رہے۔

عید کا چند عید سے پہلے نظر آتا ہے لیکن اس بار یہ چاند عید سے دو روز بعد نظر آیا تھا۔ یہ چاند دراصل وہ خط تھا جو کراچی سے فرخندہ کی سہیلی سکینہ کے نام آیا تھا۔ یہ فرخندہ کا خط تھا اور اس خط میں اس نے اطلاع دی تھی کہ وہ اور اس کا میاں جمعے کے روز کراچی ایکسپریس سے لاہور واپس پہنچ رہے ہیں۔ حامد پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے ایک دھماکے سے مٹی کا وہ گلہ پھوڑا تھا جس میں تقریباً پانچ سو روپے جمع ہو چکے تھے۔ کالج سے واپس آتے ہوئے وہ "سوہا بازار۔" کی طرف چلا گیا تھا اور وہاں سے اس نے ایک نہایت نفیس چھوٹا سا طلائی لاکٹ خریدا تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے نگینے لگے ہوئے تھے۔

جمعے کے روز حامد کی حالت دیدنی تھی۔ وہ صبح سے چھت پر بیٹھا تھا اور اس

راستے پر نظریں جمائے ہوئے تھا جو وسطی شہر سے آریا نگر کی طرف آتا تھا۔ سہ پہر کے وقت اس کی منتظر آنکھیں اپنے محبوب چہرے کی دید سے سیراب ہو گئیں۔ ایک ٹیکسی کے ذریعے فرخندہ اپنے میاں اور ساس سمیت بستی میں پہنچ گئی۔ اس نے بڑے دھیان سے فرخندہ کو دیکھا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں بدلی تھی۔ وہی لپک' وہی طمطراق وہی دل میں کھب جانے والی آنکھیں۔ محلے والیاں اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ اس کے مداحوں میں لڑکیاں ہی نہیں بڑی بوڑھیاں بھی تھیں اور یہی فرخندہ کی خوبی تھی۔

"ہائے ری' اتنی دیر کہاں رہی؟"

"اف اللہ! کتنی دبلی ہو گئی ہو۔"

"اور سناؤ کوئی بال بچہ ہوا یا نہیں۔"

"اب واپس جانے کا ارادہ تو نہیں؟"

اس طرح کے فقرے حامد کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ اب وہ اپنے دروازے پر کھڑا شرمایا شرمایا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر فرخندہ کی نگاہ اس پر پڑی۔ حامد کا خیال تھا کہ وہ لپک کر اس کی طرف آئے گی۔ سب کچھ بھول بھال کر اس کی طرف متوجہ ہو جائے گی لیکن اس کی اچٹتی سی نگاہ نے حامد کو مایوس کر دیا۔ اپنے میاں اور محلے والیوں کے ساتھ وہ صحن میں داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے حامد بھی چلا گیا۔ یہاں فرخندہ نے ایک بار پھر اسے دیکھا اور مسکرا کر حال چال پوچھا۔ حامد نے مختصر جواب دیا۔ اسے فرخندہ کی آنکھوں میں اپنے لیے کوئی خصوصی اہمیت نظر نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر ٹھہر کر گھر واپس آگیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس کی والدہ فرخندہ کے گھر سے واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ بولیں "یہ دیکھ رے حامدی! فرخندہ تیرے لیے کتنا پیارا تحفہ لائی ہے۔"

حامد نے بے تابی سے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک بڑے سائز کی خوب صورت لوڈو تھی۔ لوڈو کے تمام مہرے اسٹیل کے بنے ہوئے تھے اور ان پر بلوری ہیڈ تھے۔

"کیسی ہے؟" والدہ نے پوچھا۔

"اچھی ہے۔" حامد نے مختصر جواب دیا اور چھت پر اپنی پناہ گاہ یعنی برساتی میں چلا آیا۔

برساتی کا دروازہ بند کر کے وہ دھم سے بستر پر گر پڑا۔ اسے فرخندہ کے مبہم رویے سے اتنی کوفت نہیں ہوئی تھی جتنی اس تحفے سے ہوئی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ کہہ

رہی ہے "یہ لو میرے ننھے سے بلو ٹکڑے! اپنا کھلونا لو اور چھت پر جا کر کھیلو۔"
تو کیا میں اس کی نظر میں ابھی تک ایک بچہ ہوں؟ لوڈو سے بہل جانے والا۔ اس نے
بے زاری سے لوڈو ایک طرف رکھ دی اور بتی جلا کر خود کو کتابوں میں غرق کرنے کی
کوشش کرنے لگا۔

.... فرخندہ کو آئے دو روز ہو چکے تھے لیکن وہ ایک بار چند منٹ کے سوا ان
کے گھر نہیں آئی تھی۔ آنگن میں بھی وہ صرف دو تین بار نظر آئی تھی اور ہر دفعہ جلدی
میں دکھائی دیتی تھی۔ حامد کو یوں لگا جیسے وہ بدل چکی ہے یا پھر شروع سے ہی وہ غلط
اندازے لگاتا رہا ہے۔ فرخندہ کو اس سے کوئی خاص لگاؤ تھا ہی نہیں۔ جیسے وہ دوسروں
سے ہنس کر بات کرتی ہے اس سے بھی کرتی تھی۔ یقیناً یہی بات تھی۔ کم از کم وہ ایک بار
تو حامد کو بلاتی یا خود آکر اس سے ملتی۔ اس کے ذہن میں بار بار گھنی مونچھوں والے پھوپا
بشیر کا خیال بھی آتا تھا۔ نجانے کیوں پھوپا بشیر کے حوالے سے اس کے ذہن میں انجانے
اندیشے پروان چڑھ رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جہاں دیدہ اور زمانہ ساز پھوپا بشیر نے
کراچی میں فرخندہ کے ساتھ کوئی تعلق......... بنا لیا ہو۔ یہ ایک بے معنی سا رقیبانہ خیال
تھا لیکن وہ اسے اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پا رہا تھا......... اس روز شام تک حامد کی
مایوسی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے اور گلے میں پھندا سا
لگ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اس نے وہ لوڈو اٹھائی جو فرخندہ نے تحفے میں بھیجی تھی
اور کسی بپھرے ہوئے جانور کی طرح اس نے لوڈو کے ٹکڑے کر دیے۔ پھر اپنے تکیے کے
غلاف میں سے اس نے وہ چھوٹی سی سرخ ڈبیا نکالی جس میں جڑاؤ لاکٹ پڑا تھا۔ وہ کچھ دیر
تذبذب کے عالم میں اس لاکٹ کو دیکھتا رہا پھر اس نے لاکٹ زمین پر پٹخ دیا اور چارپائی کے
ایک ٹوٹے ہوئے پائے سے ضربیں لگا لگا کر اس کی شکل بگاڑ دی۔ جب وہ بالکل چرمر ہو گیا
تو اسے کاٹھ کباڑ کے پیچھے پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ چارپائی پر اوندھا گر گیا اور سسکنے
لگا۔ یہی وقت تھا جب سیڑھیوں پر مدھم چاپ سنائی دی پھر ماں کی آواز آئی۔ "ہاں اوپر ہی
ہے۔" وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔
اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک گونجی۔ حامد کا دل سینے میں اچھل گیا۔ یہ فرخندہ کے
قدموں کی چاپ تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر آگئی۔
"اوہو۔" "تو جناب یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔" وہ چہک کر بولی۔ حامد بے سدھ رہا "بنو
مت لاٹ صاحب! مجھے پتا ہے تم سو نہیں رہے۔"

پھر وہ دھم سے اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی جانی پہچانی خوش بو حامد
کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس کے ہاتھوں نے حامد کا شانہ جھنجھوڑا۔ اس کے جسم میں برق
دوڑائی مگر وہ بے حرکت پڑا رہا "بڑے ایکٹر ہو بھئی۔ ندیم اور وحید مراد وغیرہ تو کوئی شے ہی
نہیں۔" اس نے کہا۔
چند لمحے بعد حامد کو اپنے کان میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا
چلا' وہ جلدی کے بال پوائنٹ سے اس کے کان میں گدگدی کر رہی تھی۔ حامد نے یک دم
اس کی کلائی تھام لی اور غصے سے بازو دور ہٹا دیا۔
"ہائے ہائے کیا ہے۔ کیوں روٹھے ہوئے ہو؟" وہ ذرا چمک کر بولی "اتنے دنوں
بعد آئی ہوں اور ٹھیک سے سلام تک نہیں کیا تم نے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"
"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" حامد گلوگیر آواز میں بولا۔
"اگر یہ ٹھیک ہے تو پھر خراب کسے کہتے ہیں۔" اس نے حامد کی پسلیوں میں انگلی
چبھوئی۔ تب اس کی نگاہ لوڈو کے ان پھٹے ہوئے ٹکڑوں پر پڑی جو حامد نے چارپائی کے نیچے
پھینک دیے تھے۔ وہ ایک دم گم صم سی ہو گئی۔ اس نے نیچے جھک کر وہ ٹکڑے اٹھائے
اور خاموشی سے حامد کی طرف دیکھنے لگی۔ حامد آنکھوں پر بازو رکھے چت لیٹا تھا۔
"بہت ناراض لگتے ہو تم تو۔" وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کیا غلطی ہو گئی
ہے مجھ سے۔"
"غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔" وہ سسک کر بولا۔
یوں لگا جیسے کمرے کی فضا ایک دم بے حد سنجیدہ ہو گئی ہے اور وہ بات حامد کی
نوک زبان پر آنے والی ہے جو کسی وقت اسے بے حد......... بے حد مشکل محسوس ہوتی
تھی۔ اس ایک لمحے کو فرخندہ نے حیران کن تیزی سے سنبھالا۔ اس سے پہلے کہ حامد کچھ
بولتا' اس نے بات پلٹ دی "اچھا بھئی' مانا کہ تم ہی سے غلطی ہوئی ہے۔ اگر غلطی ہوئی ہے تو
پھر معافی مانگو۔ چلو اٹھو شاباش' چلو اٹھو۔"
وہ اسے گدگدانے لگی۔ اس کے پہلو' اس کی بغلیں' اس کی گردن' فرخندہ کی
انگلیوں کی زد میں تھے لیکن ہنسی اس کے ہونٹوں سے کوسوں دور تھی۔ فرخندہ کتنی ہی دیر
اسے ہنسانے اور منانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسی دوران میں
اقبال اپنے گھر کے صحن سے فرخندہ کو آوازیں دینے لگا۔
"بڑے ڈھیٹ ہو تم۔" وہ مصنوعی غصے سے دانت پیس کر بولی اور اس کے سر

کے بالوں کو زور سے جھٹک کر باہر نکل گئی۔

اگلے روز شام کو آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ پھر برساتی میں آگئی۔ اس مرتبہ وہ براہ راست چھت سے آئی تھی۔ دونوں مکانوں کی درمیانی گلی بہت تنگ تھی۔ مکانوں کے شیڈ ایسے آگے کی طرف بڑھے ہوئے تھے کہ گلی پر چھت سی پڑ گئی تھی۔ بس ڈیڑھ دو فٹ کا خلا باقی تھا۔ اس کو پھلانگنا قطعاً مشکل نہیں تھا۔ فرخندہ بھی اس خلا کو پھلانگ کر آئی تھی۔ اس روز بھی وہ آدھ پون گھنٹے تک اس سے سر کھپاتی رہی اور پوچھتی رہی کہ آخر کیا بات ہے جو وہ اس سے ناراض ہوا پڑا ہے۔ حامد اس روز بھی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ اس کے ساتھ کھینچا تانی کر کے سرخ ہو رہی تھی اور ہانپی ہوئی تھی۔ نو بجنے والے تھے اور حامد کے ابو کے گھر آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ تھکے ہارے لہجے میں بولی "اچھا تمہارا دماغ ٹھیک کرنے کے لیے میں کل پھر آؤں گی اور اس وقت تک آتی رہوں گی جب تک تمہارا دماغ ٹھیک نہ ہو جائے۔"

"تم نے میرا دماغ ٹھیک کرنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟"

"ٹھیکا نہیں۔ بس یہ ضد ہے میری۔"

"تم ہار جاؤ گی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیسے؟"

"مجھے یقین ہے کہ کل تم نہیں آؤ گی۔"

"کیوں نہیں آؤں گی۔ اتنی کم ہمت نہیں ہوں میں۔"

"میں دعویٰ کرتا ہوں کہ کل تم نہیں آؤ گی۔" وہ ڈرامائی لہجے میں بولا۔

"لیکن کیوں۔" وہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

ایک میکانکی حرکت کے تحت حامد نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور ایک تہ شدہ کاغذ فرخندہ کو تھما دیا "یہ کیا ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"پڑھ لینا۔" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"حامدی.......... حامدی!" وہ اسے پکارتی رہ گئی لیکن وہ بگولے کی طرح سیڑھیاں اتر کر باہر گلی میں آگیا اور پھر بستی سے باہر نکل کر چلڈرن پارک میں جا بیٹھا۔

اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ آج وہ بات اس نے تحریر کی زبانی فرخندہ تک پہنچا دی تھی جسے کہنے کے لیے وہ طویل عرصے سے مچل رہا تھا۔ شاید صدیوں سے، شاید زمانوں سے۔ اس نے سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر اپنے اس مختصر خط میں

لکھ دیا تھا "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ کسی بچے کی محبت نہیں۔ یہ ویسی محبت ہے جیسی ایک عورت سے ایک مرد کرتا ہے۔ تم کو معلوم نہیں میں اپنی محبت میں کتنا آگے جا چکا ہوں۔ میں دن رات، سوتے جاگتے ہر وقت صرف اور صرف تمہارے بارے میں ہی سوچتا ہوں۔

حامد۔"

ایک بہت بڑا.......... بوجھ حامد کے سینے سے اتر گیا تھا اور اسے سکون محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس سکون میں ایک بے سکونی بھی پنہاں تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ فرخندہ کا رد عمل کیا ہو گا۔ ممکن تھا کہ وہ آگ بگولا ہو جاتی اور اپنے خاوند عبدل کو سب کچھ بتا دیتی۔ یا پھر وہ یہ خط حامد کی والدہ کے سامنے رکھ دیتی اور ان سے کہتی کہ وہ اپنے بیٹے کو سنبھالیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرتی لیکن اس خط کے ٹکڑے کر دیتی اور آئندہ حامد اور اس کے اہل خانہ سے ناتا توڑ لیتی۔ جوں جوں حامد اس بارے میں سوچ رہا تھا، اس کے اندر ایک احساس گناہ نمو پا رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ خیال اس کے ذہن کو ڈسنے لگا کہ اس نے جلد بازی میں ایک غلط اور شرم ناک قدم اٹھا لیا ہے۔

وہ کافی دیر تک چلڈرن پارک میں بیٹھا رہا۔ جب پارک خالی ہو گیا اور اردگرد کے مکانوں کی بتیاں بجھنے لگیں تو وہ اٹھا اور مختلف گلیوں سے گزر کر خاموشی سے اپنے محلے میں داخل ہو گیا۔ اس نے بڑے ڈرے سہمے انداز میں اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ اسے لگ رہا تھا کہ والد صاحب ہاتھ میں جوتا لیے صحن کے بیچوں بیچ بیٹھے ہوں گے اور اندر داخل ہوتے ہی اس پر پل پڑیں گے۔ یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ صحن خالی تھا اور والد صاحب کے کمرے کی بتی بھی بجھی ہوئی تھی۔ والدہ برآمدے میں بیٹھی ایک پڑوسن سے باتیں کر رہی تھیں۔ حامد نے بغور والدہ اور پڑوسن کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہاں کسی قسم کے خطرات نظر نہیں آئے۔ وہ کچھ دیر صحن میں گھومنے پھرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے تین روز عجیب تذبذب میں گزرے۔ ماحول پر ایک گمبھیر سناٹا طاری تھا۔ فرخندہ ان کے گھر میں داخل ہوئی تھی اور نہ اپنے ہی آنگن میں اس کی صورت دکھائی دی تھی۔ پتا نہیں کہاں گم تھی وہ؟ تیسرے دن حامد نے اسے دیکھا۔ وہ گلی میں کھڑی ایک خوانچے والے سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی سہیلی سکینہ بھی پاس ہی موجود تھی۔ فرخندہ نے حامد کو دیکھا لیکن نظرانداز کر دیا جیسے دیکھ کر بھی نہ دیکھا ہو۔ حامد پاس سے گزرنے لگا

تو سکینہ بولی۔ "اے حامدی! آج کل بڑے نخرے ہیں تیرے۔ کسی چھوٹے موٹے سے بات ہی نہیں کرتا۔ کالج میں داخل ہو گیا ہے نا۔"

حامد جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ سکینہ نے فرخندہ کو بیچ میں گھسیٹنے کی کوشش کی "دیکھ رہی ہے فرخندہ۔ بات کا جواب بھی نہیں دیتا۔"

"تو بات بھی تو شرارت کی کرتی ہے۔" فرخندہ کی مدہم آواز ابھری۔ شاید کچھ اور بھی کہا گیا ہو لیکن حامد اپنے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔

O------------☆-------------O

روز و شب ایک دم بے کیف اور بے رنگ ہو گئے تھے۔ صبح سویرے کالج، سہ پہر کو واپسی پھر وہ دوستوں کے ساتھ قریبی گراؤنڈ میں چلا جاتا۔ پورے آریا نگر کے لڑکے وہاں جمع ہوتے۔ شام تک کرکٹ ہوتی۔ گھر واپس آتا اور کھانا وغیرہ کھا کر اوپر برساتی میں چلا جاتا۔ کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا۔ پڑھائی کس کو کرنا تھی۔ فرخندہ کے آنگن میں نگاہیں جمائے رہتا۔ وہ اب آنگن کی بتی بھی کم کم ہی جلاتی تھی۔ پورا گھر ایک خاموش تاریکی میں لپٹا نظر آتا تھا۔ اس تاریکی میں کبھی کبھی عبدل کی آواز گونجتی "فرخندہ جی! چائے کا پانی گرم ہے' آکر پتی ڈال دو۔" کبھی فرخندہ کی ساس اونچی آواز میں کھانستی اور بہو کو آواز دیتی "فرخندہ! ذرا مجھے کھانسی کی دوا پلا جا۔"

فرخندہ کو آواز دیتے ہوئے بڑھیا کے لہجے میں عجیب سا کرارہ پن آجاتا تھا۔ آج کل ساس بہو میں زیادہ سلوک نہیں رہا تھا۔ شادی کو پورے دو سال ہو چکے تھے اور ساس ابھی تک منتظر تھی کہ بہو کا جی متلائے اور وہ اچار وغیرہ ڈھونڈتی نظر آئے۔ بڑھیا کی اس محرومی نے اس کے لہجے میں غصے کی دھار تیز کر دی تھی........... اس روز برساتی میں بیٹھے بیٹھے اور فرخندہ کے آنگن میں نگاہ جمائے جمائے حامد کی اداسی اور قنوطیت عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سارے معاملے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لعنت بھیج دے گا اور یہ گھر چھوڑ کر کالج کے ہوسٹل چلا جائے گا۔ اسے اب ان در و دیوار سے وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ بھی کوئی جگہ تھی رہنے والی۔

یہ تیسرے یا چوتھی روز کی بات ہے۔ شام ہی سے آسمان گہرے تاریک بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ پہلے زوردار بارش ہوئی تھی اب مسلسل بوندا باندی ہو رہی تھی۔ کئی روز کے جاں گسل حبس کے بعد مون سون کی یہ مہربانی ہر دل کو باغ باغ کر گئی تھی مگر حامد کو یوں لگتا تھا جیسے اس کے دل کا باغ جڑوں سے سوکھ گیا ہے اور ایک دائمی گھٹن کا موسم

اس کی رگ جان میں ٹھہر گیا ہے۔ وہ برساتی میں نیم دراز تھا اور بوندوں کی ٹپ ٹپ سن رہا تھا جب فرخندہ ہولے سے اندر آگئی۔ اسے دیکھ کر حامد مبہوت رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے زرد لباس پہن رکھا تھا۔ لباس کی طرح اس کا چہرہ بھی زرد نظر آرہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں معمول سے کچھ زیادہ ابھری ہوئی تھیں۔ گردن کی جلد بہت زیادہ شفاف اور حساس نظر آتی تھی۔ ریشمی بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھے گئے تھے۔ وہ دروازے کے فریم میں ایک ایسی خوب صورت تصویر کی طرح دکھائی دیتی تھی جس میں مصور نے زرد رنگ فراخ دلی سے استعمال کیا تھا۔

حامد اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ وہ اپنے سر سے بارش کی بوندیں جھٹک کر بولی۔
"حامدی! کیوں ہم سب کو پریشان کر رہا ہے۔ کیوں کر رہا ہے ایسا؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"آپا (حامد کی والدہ) کا رو رو کر برا حال ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ تو ہوسٹل میں رہنا چاہتا ہے۔ گھر چھوڑ کر جا رہا ہے۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں دخل دینے والی کون ہو؟"

"ہاں سارے معاملے تیرے ذاتی ہیں۔ پھر بھی تو ان میں دوسروں کو گھسیٹتا ہے، کیا ہو گیا ہے تیرے دماغ کو؟"

"میں پاگل ہو گیا ہوں۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

وہ قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر لرزاں لہجے میں بولی "دیکھ حامدی! تیری سوچ بڑی غلط ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ بھائی حمید اور آپا سائرہ کا بیٹا ایسا نکلے گا۔ تو نے میری عزت کا ذرہ بھر خیال نہیں کیا۔ پتا نہیں تو نے مجھے کیا سمجھا ہے۔ کیا میں تجھے ایسی عورت نظر آتی ہوں۔ کیا تو مجھے ایسی عورت سمجھتا ہے۔"

اس کا گلا رندھ گیا اور وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے پر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ حامد کو یوں لگا جیسے سخت سردی میں اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہے۔ وہ چند لمحوں کے لیے سن رہ گیا۔ اگر ان لمحوں میں وہ خاموش رہ جاتا تو شاید حالات ایک بالکل مختلف سمت میں مڑ جاتے اور یہ روداد بھی یوں نہ ہوتی جیسے بیان کی جارہی ہے لیکن اس نے فوراً سنبھالا لیا۔ اس کی زبان کو گویائی ملی اور الفاظ خود بخود اس کے ہونٹوں سے اچھل پڑے "میں کیا کروں۔ کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ میری زندگی عذاب کر دی ہے۔ تم نے کیوں ملنا جلنا شروع کیا تھا مجھ سے؟ کیا گناہ تھا میرا جو مجھے یہ روگ لگایا تم نے؟ میں بہت رو چکا ہوں۔ خدا کے لیے اب مجھے معاف کر دو۔ مجھے کہیں دور چلا جانے دو۔ ہمیشہ کے لیے کہیں دفع ہو جانے دو............
مجھے مر جانے دو۔"

وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگا۔ وہ حیران تھا کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے۔ کیا واقعی یہ لفظ اس کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ اسکی شرم، ہچکچاہٹ اس کی بے زبانی ان سب کو کیا ہوا تھا۔ اپنے رویے کی اجنبیت محسوس کر کے اس کی ہچکیاں اور شدت پکڑ گئیں۔ وہ دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا کر زار و قطار رونے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی آواز بلند ہے۔ یہ آواز نیچے اس کی والدہ اور دادی تک پہنچ سکتی ہے لیکن کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ یکایک دو بازو اس کے کندھوں پر آگئے۔ اس کے کانوں میں چوڑیوں کی کھنک جاگی۔ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی فرخندہ کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی "چپ کرو حامدی! چپ کرو۔ میرے دل کو کچھ ہو جائے گا۔"

اس کی بے قرار بانہوں نے حامد کو گلے سے لگا لیا۔ حامد کا چہرہ اس کے گداز شانے پر تھا اور آنسو آبشار کی طرح بہہ رہے تھے۔ وہ فرخندہ سے اتنا قریب تھا کہ اس کے دل کی دھڑکن تک محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے جسم کی خوشبو ایک سحر انگیز گداز میں بس کر اس کی رگ جاں میں اتر رہی تھی۔ اس کی نازک بانہوں کا حلقہ حامد کے گرد قائم تھا۔ وہ دونوں رو رہے تھے اور روتے چلے جا رہے تھے۔ آنسو بہانے میں شاید آسمان بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ بارش کی بوچھاڑیں ایک دم زور پکڑ گئی تھیں۔ حامد نے محسوس کیا کہ اس کے تپتے ہونٹ فرخندہ کی شفاف گردن سے چھو رہے ہیں۔ یہ ایک جادوئی لمس تھا۔ وہ بے اختیار اس لمس کو چومنے لگا اور............ پھر چومتا چلا گیا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ آنسو بہا رہا تھا اور آنسو ہی چوم رہا تھا۔ نمکین پانی جو فرخندہ کی پیشانی، رخساروں اور ہونٹوں پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ اس پانی کو دیوانہ وار چوس رہا تھا۔ وہ حامد کے ہونٹوں کے سامنے ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اس کی بانہیں حامد کے شانوں پر دھری تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے بہ آہستگی خود کو حامد سے علیحدہ کیا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔

O------------☆------------O

رات کی ملاقات حامد کے لیے ایک خواب جیسی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے دنیا جہاں کی راحتیں اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی ہیں۔ اتنی خوشی تھی اس کے اندر کہ وہ سمیٹ نہیں پا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ارشمیدس کی طرح چیختا ہوا گلیوں میں نکل

جائے یا پھر ہواؤں میں اڑنے لگے............ اوپر بہت اوپر آرمسٹرانگ کے نقش پا سے بھی آگے۔ کسی ایسے خلا میں جہاں کروڑوں میل کے دائرے میں کوئی متنفس نہ ہو۔ وہاں وہ چیخ چیخ کر کہے "میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔ مجھے وہ مل گیا جو میں نے چاہا تھا۔ اب میرے دل میں کوئی حسرت نہیں۔ میں ابھی اور اسی گھڑی مرجانا چاہتا ہوں۔ اپنی بے مثال مسرتوں کو سینے سے لگا کر فنا کے گھاٹ اتر جانا چاہتا ہوں۔" برساتی بند کر کے وہ بہت دیر اپنی بے پناہ خوشی کے ساتھ دست و گریباں رہا۔

جب وہ برساتی سے باہر نکلا تو دن چڑھ چکا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ رات کی بارش کے بعد ہر شے اجلی اور نکھری ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے فرخندہ کے آنگن میں نگاہ دوڑائی تو وہ سامنے ہی نظر آگئی۔ شاید وہ برساتی ہی کی طرف دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ حامد نے ابھی تک دروازہ کیوں نہیں کھولا۔ حامد کو یوں سامنے دیکھ کر اس نے اچانک رخ پھیر لیا اور الگنی پر کپڑے پھیلانے لگی۔ آج وہ حامد کو بالکل اجنبی اور انجان نظر آرہی تھی............ ہاں یہ وہ فرخندہ نہیں تھی جسے حامد روز دیکھتا تھا۔ اس کی یہ اجنبیت بھی حامد کو اچھی لگی۔ اس اجنبیت میں ایک دل گداز راز پنہاں تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ نیچے اترا تو ماں نے کہا "کیا بات ہے حامدی! آج تو بڑا خوش نظر آرہا ہے۔"

"ہاں ماں! اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ خوش رہا کروں گا۔"

وہ بے اختیار بولا۔

"شاید اسی طرح تیرے جسم پر کوئی بوٹی آجائے۔" دادی ماں نے تسبیح پھیرتے ہوئے کہا۔

"ضرور آئے گی بوٹی۔ دادی ماں ضرور آئے گی۔" وہ چہکا۔

"میں تو کہتی ہوں ہوسٹل جانے کا خیال بھی دل سے نکال دے۔" ماں نے اسے خوش دیکھ کر بات چھیڑی۔

"ٹھیک ہے ماں! اس بارے میں بھی سوچ لیتا ہوں۔"

"ارے............ کیا واقعی۔" حامد کی والدہ کی آنکھیں حیرت آمیز خوشی سے وا ہو گئیں۔

"تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟" اس نے کہا

اسی دوران میں فرخندہ صحن میں داخل ہوئی "سلام آپا۔" اس نے حامد کی والدہ کو سلام کیا۔

"وعلیکم سلام۔" حامد کی والدہ بڑی محبت سے بولیں۔

"آپا' میں اور عبدل جا رہے ہیں۔"

"کہاں؟" حامد کی والدہ چونک گئیں اور ان سے کہیں زیادہ حامد چونکا۔ اس کے کانوں میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ کہیں وہ واپس کراچی تو نہیں جا رہے۔ ان دونوں کے بے طرح چونکنے پر فرخندہ ہولے سے مسکرائی "کہیں نہیں آپا! بس بابا جی کے مزار تک جا رہی ہوں۔ شام کو لوٹ آؤں گی۔ اماں باہر برآمدے میں لیٹی ہے۔ میں نے بڑے کمرے کو تالا لگا دیا ہے۔ یہ چابی آپ رکھ لیں۔"

فرخندہ کبھی کبھار بابا جی کے مزار پر جاتی تھی اور جب بھی جاتی تھی' چابی حامد کی والدہ کو دے دیتی تھی بلکہ اسے اور عبدل کو کہیں بھی جانا ہوتا تھا' چابی حامد کی والدہ کے پاس ہوتی تھی۔

حامد کے روز و شب میں بے حد رنگینی اور سرشاری آگئی تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار فرخندہ دل جوئی کے لیے اس کے پاس ضرور آتی تھی۔ حامد نے اب مستقل طور پر برساتی میں سونا شروع کر دیا تھا اور اپنی سب کتابیں برساتی میں ہی لے آیا تھا۔ رات آٹھ نو بجے کے بعد فرخندہ چھت کا راستہ استعمال کرتی اور اس کے پاس آجاتی۔ وہ دونوں باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتے اور یوں ہی بے وجہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی فرخندہ بڑے شفقت بھرے انداز میں اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیتی۔ جنم جنم کے بھوکے کو جیسے محبت کی خوراک مل جاتی۔ ایسے میں برساتی کے اندر قیامت خیز سناٹا چھا جاتا۔ حامد کے لرزاں ہونٹ فرخندہ کے چہرے اور گردن پر بھٹکنے لگتے۔ اسے لگتا جیسے اس کائنات میں اس گردن اور چہرے کے محبت بھرے لمس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اس لمس کے سوا اسے کچھ بھی درکار نہیں تھا۔ مرد و زن کی محبت کے اس پہلے زینے کو وہ آخری زینہ سمجھتا تھا۔ اس "زینے" سے آگے بڑھنے کی اسے خواہش تھی اور نہ وہ ایسا سوچ سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جس روز اس نے اپنی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کی' محبت کی دیوی اس سے روٹھ جائے گی اور یہ روٹھنا کوئی معمولی نہیں ہوگا۔ وہ کبھی............ کبھی بھی اسے اپنی صورت نہیں دکھائے گی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرخندہ اور حامد کا ملاپ دو جسموں کا نہیں' دو روحوں کا نہیں دو چہروں کا ملاپ تھا۔ یہ بات حامد کو کئی برسوں بعد معلوم ہوئی کہ یونانی فلسفے میں اس سے ملتی جلتی ایک

بات کہی جاتی ہے.......... کہا جاتا ہے کہ عورت کا بالائی جسم اس کے "چاہنے والے" کا ہوتا ہے جب کہ زیریں جسم اس کے "شوہر" کا۔

انہی دنوں حامد نے فرخندہ کو وہ طلائی لاکٹ بھی دے دیا تھا۔ جو ایک روز اس نے توڑ موڑ کر کاٹھ کباڑ کے پیچھے پھینک دیا تھا۔ اس مڑے تڑے لاکٹ کو دوبارہ سے بنوانے پر حامد کے ۷۵ روپے مزید لگ گئے تھے لیکن اس مرتبہ وہ پہلے سے بھی خوب صورت بنا تھا اور اسے خوب صورت بننا ہی چاہیے تھا۔ فرخندہ کے ساتھ حامد کا "کچ مچ" تعلق بھی تو پہلے سے زیادہ واضح اور خوب صورت ہو چکا تھا۔ فرخندہ کو لاکٹ بہت پسند آیا تھا لیکن اس نے اس تحفے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ حامد نے اسے لاکٹ کی ساری روداد بھی سنا دی تھی اور بتا دیا تھا کہ یہ لاکٹ اس نے کیسے اور کیوں توڑ پھوڑ دیا تھا۔ فرخندہ حیرت سے سنتی رہی تھی۔ آخر میں دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی "تم بہت ضدی اور غصیلے ڈیش ہو۔"

"ڈیش ہو؟ یہ کیا بات ہوئی۔" حامد نے پوچھا تھا۔

"ڈیش کا مطلب ہے' خالی جگہ.......... یہ خالی جگہ پر کر کے فقرہ تم خود مکمل کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

حامد کو غصہ آرہا تھا لیکن وہ مسکرانے پر بھی مجبور تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ خالی جگہ پر کیا لفظ آئے گا۔ وہ کہہ گئی تھی کہ تم بہت ضدی اور غصیلے بچے ہو۔ لیکن حامد کو چونکہ "بچے" کے لفظ سے بہت چڑ تھی لہٰذا وہ اسے شرارت سے چڑا گئی تھی۔

حامد نے ایک عجیب بات نوٹ کی تھی۔ جب بھی فرخندہ سے اس کی ملاقات ہوتی' اس سے اگلے روز یا اس سے اگلے روز فرخندہ بابا جی کے مزار پر ضرور جاتی تھی۔ اگر جمعہ ہوتا تو عبدل اس کے ساتھ ہوتا ورنہ وہ محلے کی کسی عورت کو ساتھ لے جاتی۔ شروع میں تو حامد نے اسے اپنا وہم خیال کیا لیکن جب اس نے معاملے پر دھیان دیا تو یہ وہم درست نکلا۔ ایک دوبار اس کا دل چاہا بھی کہ وہ فرخندہ سے اس بارے میں پوچھے لیکن ایک عجیب سی ہچکچاہٹ مانع ہو گئی۔

.... تین چار ماہ اسی طرح گزر گئے۔ دھیرے دھیرے فرخندہ کے ساتھ حامد کی ملاقاتوں میں آسودگی کی وہ ناقابل فراموش کیفیت باقی نہ رہی جو شروع میں موجود تھی۔ وہ اب تک چہرے کے لمس کو ہی سب کچھ سمجھے ہوئے تھا۔ بالفاظ دیگر اس ایک "زینے" میں ہی اس کے لیے ہزارہا زینے سمائے ہوئے تھے لیکن اب اس کے قدم اس "زینے"

سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ انہی دنوں حامد نے محسوس کیا کہ فرخندہ بڑے سلیقے اور دانائی سے اس کی توجہ کا رخ کسی اور طرف موڑ رہی ہے۔ ایک ایسی بھولی بسری کہانی کی طرف جو کسی وقت حامد کے دل میں میٹھا میٹھا درد جگایا کرتی تھی اور اس کے ذہن کو ہواؤں میں اڑایا کرتی تھی۔ وہ اس کی توجہ شمیم کی طرف مبذول کرا رہی تھی۔ وہی شوخ چنچل شمیم جس نے چند سال پہلے حامد کے دل میں گھر کیا تھا اور جس کے لیے اس نے مٹی کے گلے میں پیسے جوڑنا شروع کیے تھے۔ وہ شمیم اب پھر لاہور آگئی تھی اور لاہور آکر حامد کے گھر میں ہی مقیم ہو گئی تھی۔ وہ اب تک کوئٹہ میں اپنے تایا نصیرالدین کے پاس تھی۔ تائی کے ساتھ شمیم کی ماں کا زبردست جھگڑا ہوا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ حامد کی فیملی اور کوئٹہ والے تایا کی فیملی میں تعلقات اچھے نہیں تھے' لہٰذا کوئٹہ والے تایا سے شمیم کی والدہ کی بگڑی تو وہ خود بخود حامد کی فیملی کے قریب آگئیں۔ حامد کے ابو نے خود اصرار کر کے شمیم اور اس کی والدہ کو اپنے گھر میں رکھا اور شمیم کی والدہ کو' جو "بی ایڈ" تھیں' ایک اسکول میں ٹیچر بھی کرا دیا۔ اب وہ لوگ حامد کے گھر میں ہی مقیم تھے۔ دادا جان پچھلے سال وفات پا گئے تھے لہٰذا ان کا کمرا شمیم اور اس کی ماں کے تصرف میں آگیا تھا۔

شمیم اب وہ سات سال پہلے والی شمیم نہیں رہی تھی۔ وہ ایک نو دمیدہ پھول تھی جس کی پرشباب خوشبو اور جس کے الہڑ رنگ ہر شخص کو مسحور کرتے تھے۔ یہ پھول اچانک کوئٹہ سے لاہور پہنچا تھا اور حامد کی آنکھوں کے عین سامنے بہار دکھانے لگا تھا لیکن حامد تو کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ اسے فرخندہ کے ملیح چہرے کے سوا کچھ دکھائی دیتا تھا اور نہ بھاتی۔ اس نے شمیم کی آمد کو ذرہ بھر اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ ایک ماہ سے اس کے قریب تھا لیکن اس سے کوسوں دور تھا۔ فرخندہ کو نجانے کیسے علم ہو گیا تھا کہ چند سال پہلے حامد اپنی تایا زاد شمیم میں دلچسپی لیتا رہا ہے اور وہ دن رات ایک دوسرے میں مگن رہے ہیں۔ ظاہر ہے ماں کے سوا یہ بات فرخندہ کو اور کون بتا سکتا تھا۔ فرخندہ اب تنہائی میں حامد سے ملتی تو ہر بات میں سے شمیم کی بات نکالنے لگتی۔ وہ جا بے جا اس کی تعریف کرتی "کتنی شوخ ہے وہ.......... اور حاضر جوابی تو جیسے گھول کر پی گئی ہے۔ کل میں نے کہا شمیم.........."

"اچھا اچھا چھوڑو یہ تذکرہ۔" حامد اس کی بات کاٹتا "میں جانتا ہوں' بڑی ہوشیار ہے وہ۔"

"لیکن تمہیں تو پھر بھی وہ نہ پٹا سکی۔" وہ شوخی سے کہتی۔ "حالانکہ راہ چلتے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں اسے۔ وہ سامنے نکڑ پر شریف لوہار کا لڑکا فخری ہے ناں، ہروقت چھت پر کھڑا رہتا ہے۔" فرخندہ حامد کے دل میں رقیبانہ جذبات ابھارنے کی کوشش کرتی۔

شروع شروع میں تو اس نے فرخندہ کی باتوں کو قطعاً اہمیت نہ دی لیکن دھیرے دھیرے غیر محسوس طور پر وہ شمیم کو دیکھنے لگا۔ گھر میں اس کی موجودگی کو محسوس کرنے لگا۔ واقعی اس کا حسن خطرناک حد تک دعوت انگیز اور فتنہ سامان تھا۔ اوپر سے وہ کپڑے بھی بڑے بھڑکیلے اور خوب صورت پہنتی تھی۔ وہ جدھر جاتی تھی کشش کا ایک ہالہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ حامد نے غور سے شمیم کو دیکھا تو اسکی شربتی آنکھوں میں اسے اپنے لیے ایک خاموش بلاوا نظر آیا۔ حامد کا دل انوکھے انداز میں دھڑکا لیکن اس کے ساتھ ہی فرخندہ کا بے پناہ تصور اس کے ہر خیال کو آندھی کی طرح اڑا لے گیا۔ حامد کبھی بھی شمیم کی طرف متوجہ نہ ہوتا اگر ایک عجیب واقعہ رونما نہ ہوتا۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ جمعرات کی شام حامد کو ہمیشہ خوشگوار محسوس ہوا کرتی تھی۔ اگلے روز چھٹی ہوتی تھی اور وہ اطمینان سے دیر تک سو سکتا تھا۔ والد صاحب بھی جمعرات کی شام اندرون شہر ایک "درس" میں چلے جاتے تھے اور رات گئے واپس آتے تھے۔ اس شام بھی وہ درس پر جا چکے تھے۔ حامد چھت پر ٹہل رہا تھا اور ان رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھ رہا تھا جو سورج غروب ہونے کے بعد تیزی سے اپنے اپنے "ٹھکانوں" کی طرف کھنچتی چلی جا رہی تھیں..........
شمیم چھت پر آئی۔ حامد کو دیکھ کر شرمیلے انداز میں مسکرائی اور تپائی پر ایک کاغذ رکھ کر چلی گئی۔ حامد نے جلدی سے کاغذ اٹھایا۔ وہ چھوٹا سا پرزہ تھا۔ اس پر انگریزی میں صرف چار لفظ لکھے تھے۔ "I LOVE YOU TOO" یعنی میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔
"بھی" سے شمیم کی کیا مراد تھی؟ حامد نے اس سے کب کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے، جس کے جواب میں وہ لکھ رہی تھی کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس فقرے کا ایک مطلب اور بھی ہو سکتا تھا یعنی صرف فرخندہ ہی نہیں، میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ حامد کو یہی مطلب زیادہ قرین قیاس نظر آیا۔ یقیناً حامد کی والدہ اور کسی حد تک والد کی طرح شمیم بھی اس معاملے سے آگاہ ہو چکی تھی جو فرخندہ اور حامد کے درمیان چل رہا تھا۔ اب اس نے اپنے وجود کا احساس اس مختصر محبت نامے کے ذریعے دلایا تھا۔

حامد کے ذہن میں عجیب اتھل پتھل شروع ہو گئی۔ فرخندہ کا تصور اس کے دل و دماغ سے یوں پیوست تھا کہ اس کی گہرائی کا اندازہ لگانا محال تھا۔ وہ اس کے سوا کچھ سوچ

بھی نہ سکتا تھا۔ اگلے روز حامد کالج سے واپس آیا تو اس کا کمرا یعنی برساتی جگمگ کر رہی تھی۔ پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا کہ یہ وہ برساتی ہے۔ سب کاٹھ کباڑ غائب تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی۔ کتابیں، کپڑے، جوتے، ہر شے میں جاذب نظر ترتیب نظر آ رہی تھی۔ وہ فوراً پہچان گیا کہ یہ سب کام شمیم کا ہے۔ وہ مسکرا کر بستر پر لیٹ گیا۔
اچانک اسے ایک کتاب کا خیال آیا۔ یہ ایک انگلش ناول تھا۔ جو اس کے ایک کالج دوست نے پڑھنے کو دیا تھا۔ خاصا بولڈ اور جذبات انگیز قسم کا ناول تھا۔ یہ ناول اس نے تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے تکیہ اٹھایا، ناول موجود نہیں تھا۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ اسکی فاش غلطی تھی۔ صبح کالج جاتے ہوئے وہ ناول الماری میں مقفل کرنا بھول گیا تھا.......... اب وہ ناول کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ شمیم نے اٹھا لیا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ شمیم کے آنے سے پہلے امی، تائی جان یا پھر ابو کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ ابو یا تائی جان کے ہاتھ لگ جاتا تو بیڑا غرق تھا۔ وہ دونوں "انگلش دان" تھے اور ناول ہرگز ہرگز ان کے پڑھنے لائق نہیں تھا۔ حامد اپنے کمرے میں ناچ کر رہ گیا، پھر وہ گھبرایا ہوا نیچے پہنچا۔ شمیم حامد کی والدہ کے پاس بیٹھی گوبھی کاٹ رہی تھی۔ حامد ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا بیٹے؟" حامد کی والدہ نے چونک کر پوچھا۔

"مم.......... میری کوئی کتاب.......... تو نہیں دیکھی آپ لوگوں نے؟"

"کتاب؟ نہیں تو۔" والدہ نے کہا۔

"میں نے بھی نہیں دیکھی۔" شمیم پوری سنجیدگی سے بولی۔

"میرے کمرے کی صفائی تم نے کی تھی؟"

"ہاں۔" شمیم کے چہرے پر شرم کی سرخی لہرائی، "لیکن.......... کتاب تو میں نے کوئی نہیں دیکھی۔"

"چھوٹی سی کتاب تھی انگلش کی۔ بستر پر پڑی تھی۔"

"سرے سے کوئی کتاب تھی ہی نہیں بستر پر۔" شمیم نے کہا۔

"تمہارے ابو گئے تھے اوپر۔ کہیں وہ نہ لے آئے ہوں۔" والدہ نے خیال آرائی کی۔

حامد کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا واپس کمرے میں پہنچ گیا۔ زمین آسمان آنکھوں کے سامنے رقصاں تھے۔ وہ والد صاحب کی جلالی طبیعت سے اچھی طرح

آگاہ تھا۔ آج کل ویسے بھی وہ درس میں پابندی سے جاتے تھے۔ اسے اندازہ ہوا کہ کوئی سخت مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ بہرحال ایک موہوم سی امید ابھی باقی تھی۔ شاید وہ خود ہی کتاب کسی کونے کھدرے میں رکھ کر بھول گیا ہو.......... شام تک وہ اندھوں کی طرح پورے گھر میں ہاتھ پاؤں چلاتا رہا اور کتاب ڈھونڈتا رہا۔ کتاب کو تو خیر کیا ملنا تھا، پورا گھر کباڑ خانے کا نمونہ پیش کرنے لگا۔

رات نو بجے ابو آئے تو اسے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس کبوتر کی طرح جو بلی دیکھ لیتا ہے، اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنی پناہ گاہ یعنی برساتی میں گھس گیا۔ رات دس ساڑھے دس بجے تک وہ ہر آن کسی طوفان کا منتظر رہا، لیکن طوفان نہیں آیا۔ شاید ابو صبح تازہ دم ہو کر اس کا ریمانڈ لینا چاہتے تھے۔ وہ کانٹوں کے بستر پر تھا۔ اچانک چراں کی آواز سے برساتی کا دروازہ کھلا اور شمیم اندر آگئی۔ اس کا سرخ کامدار کرتا بلب کی زرد روشنی میں چمک رہا تھا۔ کرتے کے ساتھ اس نے پھول دار سیاہ شلوار اور سیاہ دوپٹے کی میچنگ کی تھی۔ اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے اور ان بندھے ہوئے بازوؤں کے درمیان وہی گم شدہ کتاب نظر آرہی تھی۔ شمیم کے ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ تھی۔ پہلے حامد کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی پھر اس کے جسم کا خون سر کو چڑھ گیا۔ شمیم نے کتاب اس کی طرف بڑھائی تو اس نے کتاب کے بجائے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"یو چڑیل۔ شیطان کی بچی، الو کی پٹھی۔" وہ اس پر جھپٹا۔

اس نے مصنوعی خوف سے ہلکی سی چیخ ماری اور اپنا آپ چھڑانے لگی۔ حامد نے اس کے لمبے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ ان لمحات میں حامد کو بالکل یوں لگا جیسے وہ دونوں ابھی لڑکپن کی سرحد پر کھڑے ہیں۔ گڑیا گڈا کھیل رہے ہیں اور کسی بات پر مشتعل ہو کر وہ شمیم کو پیٹنے پر تل گیا ہے۔ شاید اس کا ہاتھ شمیم کو مارنے کے لیے اٹھا بھی تھا لیکن پھر وہ ایک دم اپنی جگہ جامد رہ گیا۔ وہ ننھی منی شمیم پر نہیں، ایک جوان خوب رو دوشیزہ پر ہاتھ اٹھا رہا تھا۔ اس دوشیزہ کے سحر انگیز جسم کے خدوخال حامد سے قریب تر تھے۔ ایک دم جیسے اسے پسینہ آگیا۔ اس نے بہ آہستگی شمیم کے بال چھوڑ دیے۔ وہ بھی بھید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی پھر اس نے جلدی سے رخ پھیرا اور کوئی لفظ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

حامد بے دم سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے کتاب کھولی۔ کتاب پر کئی

جگہ "نازک" سطور کو پنسل سے انڈر لائن کیا گیا تھا۔ جہاں جہاں سطور انڈر لائن کی گئی تھیں وہاں وہاں لکھا تھا "توبہ ہے یااللہ۔"

"توبہ ہے یااللہ" کے الفاظ کتاب کے پہلے تین ابواب میں قریباً چالیس جگہ لکھے تھے۔ غصے کے باوجود حامد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ ربر لے کر ان نشانات کو مٹانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایک عجیب ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ شمیم کا ہیجان خیز سراپا بار بار اس کی نگاہوں میں آرہا تھا۔

اس روز کے بعد حامد اور شمیم میں ایک بے نام سا ربط قائم ہو گیا۔ ان کی آنکھیں باتیں کرنے لگیں اور باتوں میں سے لگاؤ جھلکنے لگا۔ نجانے کیوں حامد کو پھر وہی گڑیا یاد آگئی تھی جو سات آٹھ سال پہلے اسے شمیم کو دینا تھی۔ شمیم کو بھی وہ گڑیا ابھی تک یاد تھی۔ وہ گڑیا جو کہیں نہیں تھی لیکن جو دونوں کے حافظے میں محفوظ تھی۔ ایک روز حامد کا دل چاہا کہ وہ شمیم سے کیا ہوا اپنا وہ برسوں پرانا وعدہ پورا کر ڈالے۔ اس نے بازار سے ایک قیمتی گڑیا خریدی اور گھر لے آیا۔

"آج شام مجھ سے ملنا۔" اس نے ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے بہ آہستگی کہا۔

"کیوں" شمیم نے وحشت زدہ ہرن کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"ایک تحفہ دینا ہے تمہیں۔"

شمیم کی آنکھوں میں ایک دم سے سیکڑوں دیپ جل اٹھے۔ "اچھا میں آؤں گی۔" اس نے کہا۔

حامد! ایف ایس سی کر رہا تھا۔ شمیم فرسٹ ایئر میں تھی "میتھ" کا سوال سمجھنے کے بہانے وہ شام کو اس برساتی میں آگئی جو حامد کے اسٹڈی روم کے علاوہ اس کے بیڈ روم، ڈائننگ روم اور سٹنگ روم وغیرہ کی ضروریات بہ احسن پوری کرتی تھی۔

اس روز حامد نے شمیم کو گڑیا دی تو اسے یوں لگا جیسے یہ سلسلہ وہیں سے جڑ گیا ہے۔ جہاں سے برسوں پہلے ٹوٹا تھا۔ ایک دوسرے کی برسوں پرانی محبت نے انھیں مدہوش کر دیا اور وہ یکایک ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ شمیم کا سرکش شباب ایک تند لہر کی طرح حامد کو اپنے ریلے میں بہانے لگا۔

"فرخندہ باجی آپ سے بہت بے تکلف ہیں۔" شمیم نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"فرخندہ.......... ہاں.......... فرخندہ" وہ چونک سا گیا۔

ان لمحات میں فرخندہ اسے کوئی بہت دور کی چیز محسوس ہوئی۔ بھولی بسری اور دھندلائی ہوئی۔

"ویسے فرخندہ باجی بڑی اچھی ہیں۔" شمیم نے پھر سرگوشی کی۔

"وہ............ وہ کیوں؟"

"ارے وہ نہ ہوتیں تو ہمارے پتھر کے بتوں میں جان کیسے پیدا ہوتی۔ وہی تو جناب کا پہلا نامہ لائی تھیں۔"

"نن............ نامہ۔ ہاں............ ہاں۔" حامد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

شمیم نے خود کو حامد سے ذرا پیچھے ہٹاتے ہوئے اپنی قمیص کے گلے میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی پرچی حامد کو تھما دی "دیکھیے، آپ کی یہ تحریر ہم نے ابھی تک سینے سے لگا رکھی ہے۔"

حامد نے حیرانی سے اس تہہ شدہ پرچی کو کھولا۔ "انگلش کے بلاک لیٹرز میں لکھا تھا" آئی لو یو شمیم۔ حامد۔" تحریر حامد کی تحریر سے ملتی جلتی ہی تھی۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ یہ الفاظ اس نے نہیں لکھے تھے تو پھر کس نے لکھے تھے۔ یقیناً فرخندہ نے خود لکھے ہوں گے اور شمیم تک پہنچائے ہوں گے............ اب اس کی سمجھ میں وہ مختصر تحریر بھی آ رہی تھی جو شمیم نے اسے لکھی تھی "آئی لو یو ٹو۔"

دراصل یہ الفاظ اسی مختصر محبت نامے کا مختصر جواب تھے۔

اسی دوران میں نیچے صحن سے فرخندہ کی آواز آئی۔ وہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ شاید صحن میں بیٹھی دادی اماں سے............ پھر وہ بلند آواز میں بولی "آپا جی! بھائی جی آ رہے ہیں۔ چائے کا پانی رکھ دیں۔"

حامد کو محسوس ہوا کہ یہ آواز حامد کی والدہ کو سنانے کے لیے نہیں ان دونوں کو سنانے کے لئے تھی............ شمیم جلدی سے کھڑی ہو کر اپنے لباس کی شکنیں درست کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے "اچھا میں چلتی ہوں، چچا جان آ گئے ہیں۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ حامد گم صم بستر پر نیم دراز رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ فرخندہ اسے اور شمیم کو انگلی پکڑ کر چلا رہی ہے۔ ان کے لیے ملنے کے مواقع پیدا کر رہی ہے۔ انہیں ایک دوجے کے قریب لا رہی ہے۔ کئی بار حامد کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس جال کو توڑ دے لیکن شمیم سے مل بیٹھنے اور اس کے قریب آنے کے مواقع اتنے زیادہ اور

اتنے آسان تھے کہ وہ ایک ان چاہی سمت میں بہا چلا جا رہا تھا۔ فرخندہ اس سے دور ہو رہی تھی اور شمیم نزدیک تر آ رہی تھی۔

ایک نکھری ہوئی شام کو جب آسمان پر شفق کی سرخی پھیلی تھی، حامد نے فرخندہ کو آنگن میں دیکھا۔ وہ اپنی ساس کی چارپائی کی ادوائن کس رہی تھی۔ حامد کو لگا جیسے فرخندہ میں وہ پہلے جیسی چھب نہیں رہی۔ اس کا رنگ قدرے سانولا ہو گیا تھا اور جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ وہ چیتے جیسی کمر جو نازک شاخ کی طرح لچکتی تھی، بھاری ہو چکی تھی۔ اچانک حامد کو احساس ہوا کہ بات کچھ اور ہے۔ یہ موٹاپا بلاوجہ نہیں تھا۔ فرخندہ ادوائن کس کر سیدھی ہوئی تو اس کا دوپٹا خاص انداز میں سامنے کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ عبدل بچے کا باپ بننے والا ہے۔ ایک جلاپا سا اس کے سینے میں دھواں دینے لگا۔ اسے عبدل اور فرخندہ پر خواہ مخواہ طیش آنے لگا۔ وہ جانتا تھا یہ طیش بلا جواز ہے۔ میاں بیوی اپنی مرضی کے آپ مالک تھے مگر نجانے کیوں وہ لاشعوری طور پر یہ سمجھتا تھا کہ فرخندہ کو کچھ بھی کرنے سے پہلے اس سے اجازت لینی چاہیے یا کم از کم مشورہ کرنا چاہیے۔

O------------☆------------O

فرخندہ کا موٹاپا، پژمردگی اور اس کی بے اعتنائی دیکھ دیکھ کر حامد کا دھیان اس کی طرف سے ہٹتا جا رہا تھا۔ اس کی جگہ تیزی سے شمیم لے رہی تھی۔ ایک وقت تھا جب فرخندہ کراچی میں تھی اور اس سے بہت دور تھی لیکن وہ ہر آن اس کے بارے میں سوچتا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے والے گھر میں رہتی تھی لیکن ہفتوں اس کا خیال حامد کے ذہن میں نہیں آتا تھا۔

پھر ایک روز شمیم نے شوخ لہجے میں حامد کو بتایا کہ عبدل ایک بچی کا باپ بن گیا ہے۔

"چلو اچھا ہے، اب گھر میں کچھ تو عزت ہو گی بیچارے کی۔" حامد نے کہا تھا اور بات ختم کر دی تھی۔

انہی دنوں گھر میں حامد اور شمیم کی شادی کی بات چل نکلی تھی۔ حامد کے والد اس شادی کے حق میں تھے۔ امی بھی راضی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ گھر کی لڑکی گھر ہی میں رہے لیکن شمیم کی والدہ کچھ تذبذب میں تھیں۔ یوں تو حامد انہیں بہت پسند تھا لیکن وہ کسی اور انداز سے سوچ رہی تھیں۔ وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں اور ان کا نظریہ تھا کہ

خاندان کے اندر زیادہ شادیاں نہیں ہونی چاہئیں ورنہ اولاد پر اثر پڑتا ہے۔ کزن میرج کی
ایک مثال ہر وقت ان کے ذہن سے چمٹی رہتی تھی۔ یہ مثال حامد کے خاندان میں ہی
موجود تھی۔ حامد کی ایک پھوپو کی شادی ایک ماموں سے ہوئی تھی اور ان کے بچے نارمل
نہیں تھے۔

جب حامد کی شادی کی بات شروع ہوئی تو امی ابو نے تائی کو سمجھانے کی کوشش
شروع کر دی کہ ایب نارمل اولاد کا چانس ہزاروں میں ایک ہوتا ہے۔ اس کو اتنا اہم مسئلہ
نہیں بنانا چاہیے۔ تائی جان کبھی قائل نظر آنے لگتیں کبھی پھر تذبذب میں پڑ جاتیں۔
دوسری طرف حامد اور شمیم کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کا رومانس دن دونی رات
چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ یہ گھر کے اندر کا رومانس تھا اس لیے یہ خطرہ بھی نہیں تھا کہ اس کی
خوشبو اڑ کر گلی، محلے یا بستی میں پھیل جائے گی۔ چھت، سیڑھیاں، بالکونیاں غرض گھر کی ہر
جگہ۔ اس رومانس کے لیے سازگار تھی۔ فرخندہ سے اب کم کم ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ
بھی اپنے حال میں مگن نظر آتی تھی۔ اپنی ریں ریں کرتی سانولی بچی کو کندھے سے لگائے
برآمدے میں ٹہلتی رہتی۔ کبھی صحن میں کھرے پر اس کے پیلے پیلے پوتڑے دھوتی، کبھی
دیگچی میں بچی کا دودھ لیے کچن سے نکلتی اور تیزی سے کمرے میں داخل ہو جاتی۔ اس کی
ساس کی کھانسی بڑھ گئی تھی اور اس نے مستقل طور پر کھاٹ سنبھال لی تھی۔ فرخندہ کو
اس کی دیکھ بھال میں بھی اب کافی وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ ہفتے دو ہفتے بعد وہ عبدل کے
ساتھ بابا جی کے مزار پر بھی جاتی نظر آتی تھی۔ بہت دنوں سے فرخندہ سے بات نہیں ہوئی
تھی تاہم شمیم سے پتا چلا تھا کہ فرخندہ کبھی کبھار حامد کی والدہ سے ملنے آجاتی ہے۔ ایک
دن شمیم نے کہا۔ "میری اور آپ کی شادی کی بات چلی ہے تو فرخندہ باجی بھی بہت خوش
نظر آتی ہے۔ چچی جان کو اکثر اس سلسلے میں مشورے دیتی رہتی ہے۔"

"اس کے مشورے بھلا کس کتی میں آئیں گے۔" حامد نے بے پروائی سے کہا۔

"یہ بات نہیں۔" شمیم نے ٹوکا "بڑی سیانی ہے باجی۔ بڑی بوڑھیوں میں بیٹھتی
ہے تو ان سے بڑھ کر دانائی کی باتیں کرتی ہے اور پھر یہ کیوں بھولتے ہیں آپ کہ ان ہی
کی کوشش سے میں اور آپ.........."

"اچھا اچھا۔ بہت دفعہ سنی ہے یہ کتھا۔" حامد نے شمیم کی بات کاٹ دی اور
جھپٹ کر اس کی ہفت رنگ چوڑیوں والی کلائی پکڑ لی۔

شمیم کی والدہ پڑھی لکھی تو تھیں ہی لیکن روحانیت پر بھی گہرا یقین رکھتی تھیں۔

اکثر گھر میں میلاد کرواتیں۔ دادی جان کے ساتھ مل کر وظیفے کرتیں اور فال، استخارہ اور
چلہ جیسے الفاظ ان کی گفتگو میں موجود رہتے۔ پھر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جو بات ان کے
ذہن میں بیٹھ جاتی، آسانی سے نکلتی نہیں تھی۔ کبھی کبھی حامد یہ سوچ کر ڈر جاتا کہ کہیں
ان کے بے معنی خیالات اس کے اور شمیم کے درمیان دیوار نہ بن جائیں۔

پھر ایک روز وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ جس اسکول میں تائی
جان پڑھاتی تھیں وہاں جمعرات کو بارہ بجے چھٹی ہو جاتی تھی۔ ایک بجے تک تائی جان گھر
پہنچ جاتی تھیں لیکن اس روز وہ شام سے تھوڑی دیر پہلے لوٹیں۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آتی
تھیں۔ حامد کو لگا کہ رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ حامد نے پوچھا لیکن
انہوں نے سردرد کا بہانہ بنایا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ رات کو انہوں نے کھانا بھی
نہیں کھایا۔ ماں کی پریشانی نے شمیم کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ماں سے بہت محبت کرتی
تھی۔ ہر وقت ان کی دل جوئی میں لگی رہتی تھی۔ باپ کی موت اور بہن بھائیوں کی عدم
موجودگی کی وجہ سے شمیم کی ساری محبتیں ماں میں سمٹ آئی تھیں۔

اگلے روز حامد نے یہ مایوس کن خبر سنی کہ تائی عصمت، حامد اور شمیم کے رشتے
پر رضامند نہیں ہیں۔ یہ صاف انکار والی صورت حال تھی۔ حامد کی والدہ اور تائی جان کے
تعلقات پہلے ہی سرد مہری کا شکار تھے۔ اس جھٹکے نے انہیں ایک دم ایک دوسرے سے
دور کر دیا۔ تائی جان کی بات سے حامد کے دل کو بھی سخت ٹھیس پہنچی تھی۔ حامد گم صم ہو
کر رہ گیا۔ شمیم نے ایک دو بار حامد سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کنی کترا
گیا.......... پھر وہ بھی کھچی کھچی رہنے لگی۔ شاید انا کی ازلی دیوار ان دونوں کے درمیان
حائل ہونا شروع ہو گئی تھی.......... سارا کام جمعرات کی اس منحوس شام نے خراب کیا
تھا۔ خبر نہیں اس شام تائی جان کس سے مل کر آئی تھیں اور کیا سن کر آئی تھیں؟ یہ
سوال حامد کے لئے معما تھا۔ صورت حال بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ ایک دن حامد کے ذہن
میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ فرخندہ سے اس سلسلے میں مدد لی جائے، شاید وہ اس گتھی کو
سلجھانے میں مدد کر سکے لیکن پھر نجانے کیسے یہ بات ذہن کی گرفت سے نکل گئی۔

شمیم کے ماموں اسلام آباد میں مقیم تھے اور محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ انہوں نے
اپنی بہن یعنی تائی جان کے لیے ایک اچھی ملازمت ڈھونڈ رکھی تھی اور کئی ماہ سے انہیں
اسلام آباد بلا رہے تھے۔ حامد اور شمیم کے رشتے کی بات بگڑی تو تائی جان کو فوراً اسلام
آباد یاد آگیا۔ ایک روز انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ بھائی کے پاس اسلام آباد جائیں گی۔

حامد کی آنکھوں میں ایک بار پھر جدائی کے وہی موسم اتر آئے جو برسوں سے اس کے ساتھی تھے۔ جیسے شکر خورے کو شکر ملتی ہے، غم خور کو ایک بار پھر غم کا پہاڑ چاٹنے کو مل گیا تھا۔ جس روز شمیم کو اپنی ماں کے ساتھ اسلام آباد رخصت ہونا تھا وہ چھت پر چلی آئی اور یوں ہی ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ حامد کوئی بات کرے گا۔ کوئی وعدہ، کوئی تسلی، کوئی امید افزا جملہ لیکن حامد کے اندر جیسے خاموشی کا صحرا پھیل گیا تھا۔ وہ اس صحرا سے باہر آنا نہیں چاہتا تھا۔ ننگے پاؤں، بھوکا پیاسا اس میں بھٹکنا چاہتا تھا۔ حامد بس الوداعی نظروں سے شمیم کو دیکھتا رہا اور وہ حامد کو دیکھتی رہی "مجھے خط لکھنا۔" شمیم نے کہا تھا۔

حامد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ حامد ان لوگوں کو چھوڑنے اسٹیشن بھی نہیں گیا۔ یہ کام والد صاحب کو خود ہی کرنا پڑا۔

شمیم کے جانے کے بعد حامد کے روز و شب میں ایک اداس یکسانیت در آئی تھی۔ ایف ایس سی کے امتحانات ہو چکے تھے اور اب اسے نتیجے کا طویل انتظار کرنا تھا۔ ملکی حالات درہم برہم تھے اور یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ نتیجہ خاصا لیٹ ہو جائے گا۔ حامد کے لیے راوی فراغت لکھ رہا تھا۔ حامد نے شاعری پڑھنی شروع کر دی۔ غالب، میر، فیض، فراز اس نے سب پڑھ ڈالے۔ ایک دن وہ نیچے امی کے کمرے میں پڑا اینٹھ رہا تھا کہ فرخندہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کچن کے دروازے پر بیٹھی امی سے باتیں کر رہی تھی۔ سکینہ بھی پاس ہی تھی اور اس کے ہاتھ مسلسل سویٹر کی سلائیوں پر چل رہے تھے۔

ان کی باتیں سننے کے لیے حامد نے ریڈیو کی آواز آہستہ کر دی اور کھڑکی کے قریب سرک گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا لہٰذا باہر سے اسے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ فرخندہ اپنے زیور کی بات کر رہی تھی جو اس نے خاوند کے روزگار کے لیے بیچ دیا تھا۔ طلائی جھمکے تھے۔ ایک طلائی ٹیکا تھا۔ اور چاندی کی چوڑیاں تھیں۔ عبدل بلڈنگ میٹریل کی دکان کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے ایسے موقعوں پر بیوی کے زیور ہی بکتے ہیں۔ کچھ پیسے کم پڑ رہے تھے۔ لہٰذا وہ حامد کی والدہ سے ادھار مانگنے آئی تھی۔

حامد کی والدہ نے کہا "بٹی! تیرے پیسے اور میرے کوئی جدا ہیں۔ کتنے چاہئیں؟"

"صرف پانچ سو آپا............ دو مہینے میں دے دوں گی؟"

"اچھا، میں کر دوں گی۔"

سکینہ نے چونک کر فرخندہ کے گلے کی طرف دیکھا اور بولی۔

"اری تو تو کہتی ہے سب کچھ بیچ دیا، اور یہ لاکٹ؟"

"یہ تو جھوٹا ہے۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔ لیکن اگر سچا ہوتا تو بھی کبھی نہ بیچتی۔ ایک لاکھ روپے میں بھی نہ بیچتی۔"

جالی کی اوٹ سے حامد نے دھیان سے دیکھا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یہ وہی ننھا سا لاکٹ تھا جو اس نے فرخندہ کو تحفے میں دیا تھا۔

"آخر ایسی کیا بات ہے اس جھوٹے لاکٹ میں؟" سکینہ نے چڑ کر پوچھا۔

"بس ہے نا بات۔" وہ ناز سے بولی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کھڑکی کے پیچھے حامد کی موجودگی سے باخبر ہے۔

"عبدل نے دیا ہوگا" حامد کی والدہ بولیں۔

"نہیں............ عبدل نے نہیں، ایک............ ایک بڑی پیاری سہیلی تھی میری۔"

"سہیلی تھی تو پھر کوئی سچی چیز دیتی۔"

"مجھے تو بھئی سچوں سے بھی پیارا ہے۔" اس نے عجیب انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا جیسے لاکٹ کو گلے لگا رہی ہو۔

حامد کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے عرصے بعد غور سے فرخندہ کو دیکھا۔ بچے کی پیدائش کے دوران میں اس پر چھا جانے والی پژمردگی اب دور ہو چکی تھی۔ وہ ایک دم کھلی کھلی اور خوش رنگ نظر آتی تھی۔ بالکل جیسے چار سال پہلے تھی۔ سیاہ نقاب اٹھاتی ہوئی وہ دلہن جس کے ٹیکسی سے اترتے ہی گلی میں روشنی ہو گئی تھی۔

وہ ہنس ہنس کر حامد کی والدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ ہنستے ہوئے اس کی پیشانی کی رگ تھوڑی سی ابھر آتی تھی۔ وہ اس کی ایک ایک ادا غور سے دیکھنے لگا۔ اسے لگا جیسے وہ فرخندہ کو بھولا نہیں تھا۔ بس وہ اس کے دھیان میں نہیں رہی تھی۔ دل کے نہاں خانے میں اس کا وہ مقام برقرار تھا جسے شمیم اپنی تمام تر کوشش کے باوجود نہیں چھو سکی تھی۔ شمیم ایک پرشباب شعلہ تھی۔ فرخندہ شبنم تھی جو شب بھر برگ گل پر بسیرا کرتی ہے اور اس کی رگوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ پھر رگ گل اور شبنم کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے............ وہ دیر تک فرخندہ کو دیکھتا رہا اور اس کے سینے میں پرانی محبت کی کسک جاگتی رہی۔

وہ عید الاضحیٰ کا دن تھا۔ حامد اپنے والد کے ساتھ عید کی نماز پڑھ کر لوٹا تھا۔ صحن میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ برآمدے میں فرخندہ کھڑی تھی۔ چوڑی کناری والا گلابی دوپٹا' سفید زمین کی قمیص جس پر گلابی پھول تھے اور گلابی شلوار۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھ تھا۔ حامد اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ ہنسی تو اس کے دانتوں کی کلیاں دمک اٹھیں۔

"بھائی جی' عید مبارک۔" اس نے والد صاحب سے کہا۔

اتنے میں حامد کی والدہ بھی باہر نکل آئیں۔ فرخندہ ان سے عید ملنے لگی۔ والدہ کے کندھے پر سے اس نے حامد کو دیکھا۔ یہ نظر حامد کے دل میں دور تک اتر گئی۔

عید کا سارا دن حامد نے برساتی میں پڑ کر گزار دیا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ فرخندہ ایک بار پھر اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی تھی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ اس سے اتنا بڑا جرم کیسے سرزد ہوا۔ وہ فرخندہ کی بے مثال محبت کو بھول کر کیوں کر شمیم کی اداؤں میں الجھ گیا۔ اس کے سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہی آگ جو ایک دفعہ' فرخندہ کے کراچی سے لوٹنے پر اس کے سینے میں لگی تھی۔ وہ ایک جاں بلب پیاسے کی طرح فرخندہ کی شربتی آنکھوں کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اس کا رواں رواں فرخندہ کا نام جپنے لگا۔

اگلے روز وہ بہانے سے فرخندہ کے گھر گیا۔ اس کا شوہر عبدل قربانی کے سری پائے کھا کر اور چار گلاس لسی پی کر کمرے میں بے خبر سویا ہوا تھا۔ ایک مہمان عورت گھر میں موجود تھی لیکن اسے چکما دینا حامد کے لیے چنداں دشوار ثابت نہیں ہوا۔ فرخندہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کہا "آج شام کے بعد مجھ سے ملنا۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ مسکرائی "کیا بات ہے' آج ہماری یاد کیسے آگئی؟"

"بس آگئی نا' میں تمہارا انتظار کروں گا۔" فقرہ مکمل کرتے ہی وہ باہر نکل آیا۔

وہ شام جیسے ہزاروں برس کی دوری پر تھی۔ سورج افق پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ خدا خدا کر کے اجالے کو ٹھٹھری ہوئی تاریکی نے ڈھانپا اور آریا نگر کے گھروں میں بتیاں روشن ہو گئیں۔ فرخندہ کے آنگن میں لگی ہوئی انگور کی بیل کا ایک پہلو ڈیوڑھی کے بلب کی زرد روشنی میں چمکنے لگا۔ حامد برساتی میں آرام کرسی پر دراز ہو گیا اور ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا......... آٹھ بجے' نو بجے پھر ساڑھے نو بج گئے۔ حامد کا انتظار طول

پہنچتا جا رہا تھا۔ فرخندہ کے گھر سے پہلے اس کی بچی کے رونے کی آواز آتی رہی۔ بچی خاموش ہوئی تو عبدل کی ماں نے کھانسنا شروع کر دیا۔ اس کی کھانسی رکنے میں ہی نہیں آرہی تھی۔ منڈیر کے جھروکوں سے حامد کو ایک دوبار فرخندہ کی مدہم جھلک نظر آئی۔ وہ نانا بڑھیا کے آگے پیچھے گھوم رہی تھی۔ حامد بہت دیر تک دانت پیستا رہا۔ گھڑی کی چھوٹی سوئی دس سے آگے نکل چکی تھی جب حامد کو چھت پر مدہم چاپ محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بڑے دھیان سے چاپ کا آہنگ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاں وہ فرخندہ ہی تھی۔ گلی کے درمیانی خلا کو عبور کر کے فرخندہ اپنی چھت سے ان کی چھت پر آگئی تھی اور اب برساتی کی طرف بڑھ رہی تھی......... اگلے ہی لمحے وہ برساتی کے سامنے تھی۔

"اتنی دیر؟" حامد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اماں کی آواز نہیں آرہی تھی تمہیں۔ کھانسے چلی جا رہی تھی۔ تین چیچ "فینی ڈال" کے پلائے ہیں تو آسکی ہوں۔"

وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمرہ اس کی روشنی اور خوشبو سے معمور ہو گیا۔ وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولی۔

"کچھ نہیں۔"

"کیوں بلایا تھا؟"

"یونہی۔ باتیں کرنے کے لیے۔"

"تو کرو نا باتیں۔" وہ مسکرائی۔

وہ دونوں ادھر ادھر کی ہانکنے لگے۔ آخر حامد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "ایک سوال پوچھوں؟"

"اس سے پہلے اجازت لیا کرتے تھے؟"

"میں نے سمجھا شاید اب........."

"اب کیا تمہارے سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟"

"میں نے سمجھا شاید تمہارے سر پر نکل آئے ہوں۔"

"بالکل نہیں۔ پوچھو کیا بات ہے؟"

"تم نے میری طرف سے شمیم کو چٹ کیوں لکھی تھی؟"

"اس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا پھر سنبھل کر بولی "ہاں میں نے لکھی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ تم اور شمیم ایک دوسرے کے قریب آجاؤ۔"

"لیکن کیوں؟"

"شمیم مجھے بڑی اچھی لگی تھی۔ میں چاہتی تھی............ اسے اپنے ہاتھ سے............ تمہاری دلہن بناؤں' افسوس سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔"

"چلو اچھا ہی ہوا جان چھوٹی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ وہ تمہیں اچھی نہیں لگتی تھی؟"

"اچھی لگتی تھی اور یہی میری بھول تھی۔"

"بھول کیوں؟"

"پتا' نہیں کیا ہو گیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ وقتی ابال تھا۔ میرا پاگل پن تھا۔"

"کیا پتا کیا پاگل پن ہے۔" وہ اداسی سے بولی۔

اس نے نہایت دلیری سے فرخندہ کی آنکھوں میں جھانکا اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بولا "تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا............ کوئی نہیں۔"

وہ پلکیں جھکا کر بولی "جو ہو چکا' اسے بھول جاؤ۔"

"میں نہیں بھول سکتا۔" وہ کسی ضدی بچے کی طرح بولا۔

اچانک وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ کسی بچے کے رونے کی باریک آواز سنائے میں پھیل رہی تھی "ہائے اللہ' راحیلہ جاگ گئی۔" فرخندہ نے کہا اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

حامد نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی کلائی میں عید کی رنگین چوڑیاں چھنا چھن بج گئیں "کیا جا رہی ہو؟"

"ہاں............ وہ سب جاگ جائیں گے۔"

"اچھا اسے سلا کر آجاؤ۔"

"کوشش کروں گی۔"

"کوشش نہیں' آنا ہے۔"

"اچھا بابا! ہاتھ تو چھوڑ دو۔" وہ تیزی سے بولی۔

"وعدہ؟"

"اچھا۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ چند لمحے بعد حامد نے اس کی جھلک دیکھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بچی کے رونے کی آواز معدوم ہو گئی لیکن چار پانچ منٹ بعد وہ پھر ہولے ہولے ٹھنکنے لگی۔ فرخندہ اسے چپ کرا رہی تھی۔ کبھی وہ زور سے بولتی تو مدہم سی آواز گلی پار کر کے حامد کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی۔ وہ اپنی جگہ پڑا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ فرخندہ کی محبت ایک دلدل ہے۔ پھر بھی وہ اس دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ اسے نیک و بد کا پتا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا' اچھی صحبت میں بیٹھا تھا' شریف خاندان سے تھا' پھر بھی فرخندہ کی محبت سے ہاتھ کھینچنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

وہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک انتظار کی سولی پر لٹکتا رہا۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کے اعصاب بھی ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ لمحے جنبش کرنے سے انکاری تھے۔ وہ کبھی خود کو کوستا' کبھی فرخندہ کو۔ آخر خدا خدا کر کے ایک بار پھر فرخندہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ حامد کو لگا جیسے اس کے اردگرد آگ بھڑک رہی ہے اور اس کا سر بدن پر ایک انگارے کی طرف دھرا ہے۔

فرخندہ اندر آئی۔ اس کی خفگی محسوس کر کے ایک ادا سے مسکرائی اور اس کے قریب بیٹھ گئی "بہت انتظار کیا؟" وہ آہستگی سے بولی۔

حامد نے جواب دینا چاہا لیکن گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا۔

"اچھا چلو معاف کر دو۔" اس نے ملائمت سے کہا

اس کا ہاتھ حامد کی پشت پر آیا۔ ایک دلنواز حرکت کے ساتھ اس نے حامد کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔ وہی مانوس شانہ جس کا گداز حامد کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا تھا۔ آنکھ کے کناروں پر رکے ہوئے آنسو ضبط کا بند توڑ کر بہہ نکلے۔ وہ کسی بچے کی طرح آنسو بہانے لگا اور اپنے ہی آنسوؤں میں چہرہ بھگونے لگا۔ اس کے ہونٹ اس لمس سے ہم کلام تھے جو اس کے لیے محبت کی کل کائنات تھا۔ چہرے اور گردن کا لمس' ہونٹوں اور رخساروں کا لمس۔ اس لمس سے آگے اسے سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ وہ بے حرکت بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ بڑی نرمی سے حامد کی پشت پر رینگ رہے تھے' جیسے وہ کوئی بچہ ہو اور وہ اسے سلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اچھا اب جانے دو۔" وہ کافی دیر بعد منمنائی۔

حامد کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے جسم سے جان کھینچنا چاہتا ہو۔ وہ اسے ہٹا کر بے

آہستگی اٹھی اور باہر نکل گئی۔

...... اگلے روز یہ دیکھ کر حامد کی حیرت از سرنو تازہ ہو گئی کہ فرخندہ برقع پہن کر مزار پر جانے کے لیے تیار نظر آرہی ہے...... یہ سوال ابھی تک حامد کے لیے پریشان کن تھا کہ اس سے ملنے کے فوراً بعد وہ مزار پر جانا کیوں ضروری سمجھتی ہے۔ اس نے سوچا کہ فرخندہ سے پوچھ تو کئی بار چکا ہے' کیوں نہ آج خود جا کر دیکھے کہ وہ کیا کرتی ہے؟

اس روز پہلی بار حامد نے فرخندہ کا تعاقب کیا۔ فرخندہ کے ساتھ محلے ہی کی ایک بارہ چودہ سالہ لڑکی تھی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ دونوں بڑی سڑک پر پہنچیں اور بس اسٹاپ پر کھڑی ہو گئیں۔ حامد ایک کھوکھے کی اوٹ میں رہا اور ان دونوں کے ساتھ بس کا انتظار کرتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد بس آئی۔ وہ دونوں لیڈیز گیٹ سے داخل ہو گئیں۔ حامد نظر بچا کر پچھلے حصے میں سوار ہو گیا۔ رش کافی تھا۔ خود کو چھپانے میں حامد کو کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ آدھ پون گھنٹے کے سفر کے بعد بس اندرون شہر سرکلر روڈ کے بارونق علاقے میں رک گئی۔ یہاں سے "بابا جی" کے مزار تک فرخندہ اور اس کی ساتھی لڑکی نے پیدل سفر کیا۔ حامد ہوشیاری سے ان کے پیچھے چلتا رہا۔

بابا جی کا مزار ایک وسیع احاطے میں واقع تھا۔ مزار کے اردگرد صفیں بچھی تھیں اور مرد و زن نوافل پڑھنے اور دعائیں مانگنے میں مصروف تھے۔ فرخندہ مزار کی ایک جالی کے قریب جا بیٹھی اور اپنا ماتھا جالی سے ٹیک دیا۔ کچھ دیر بعد حامد نے محسوس کیا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کے جسم کی جنبش اس کی ہچکیوں کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ بہت دیر وہاں بیٹھی رہی اور دعا وغیرہ مانگتی رہی۔ پھر اس نے اپنے برقع کے اندر سے نفیس لٹھے کی ایک چادر نکالی اور ساتھی لڑکی کے ساتھ مل کر مزار پر چڑھا دی۔ مزار کے قریب ہی زرد رنگ کا ایک بہت بڑا آہنی گلا پڑا تھا۔ فرخندہ نے اپنی اوڑھنی کے پلو میں سے کچھ روپے نکالے اور گلے میں ڈال دیے۔

حامد یہ ساری کاروائی برآمدے کے ایک بڑے ستون کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا۔ برآمدے میں نیم تاریکی تھی۔ حامد کو یقین تھا کہ وہ فرخندہ یا ساتھی لڑکی کی نظر میں آنے سے محفوظ رہے گا۔ گلے میں روپے ڈالنے کے بعد فرخندہ پھر ایک صف پر جا بیٹھی۔ اس کا نصف چہرہ برقع کے نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ اور سوجی سوجی نظر آتی تھیں۔ یوں لگتا تھا' وہ وہاں بیٹھ کر بہت سکون پا رہی ہے۔

حامد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ کیا وہ کسی احساس گناہ کے نتیجے میں یہاں آئی تھی؟ شاید ایسا ہی تھا...... وہ ایک شادی شدہ عورت تھی اور حامد کے ساتھ اس کا تعلق ایک نامناسب رخ اختیار کر گیا تھا۔ اس صورت حال کی ذمے داری زیادہ تر حامد پر ہی عائد ہوتی تھی۔ حامد کو ندامت محسوس ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ فرخندہ سے ہر تعلق ہمیشہ کے لیے منقطع کر لے اور اسے ان پشیمانیوں سے بچا لے جو اسے اس مزار پر لاتی ہیں اور رونے پر مجبور کرتی ہیں...... لیکن...... اگلے ہی لمحے اسے اپنا یہ "مضبوط" ارادہ بدلنا پڑا۔ اسے لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن تھم جائے گی۔ فرخندہ سے دائمی دوری کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تو پھر؟ پھر کیا کرنا چاہیے اسے؟ اس کا جواب یہ تھا کہ اسے خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ جانتے ہوئے بھی انجان رہنا چاہیے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہونے دینا چاہیے اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہیے۔

قریباً آدھ گھنٹا وہاں گزارنے کے بعد فرخندہ اٹھ گئی۔ جونہی وہ باہر نکلی' حامد نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی لیکن اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتا' ایک ہاتھ دوستانہ انداز میں اس کے شانے پر آیا۔ حامد نے چونک کر دیکھا۔ وہ اس کے ہائی اسکول کا پرانا چوکی دار رب نواز تھا۔ حامد اسے فوراً نہیں پہچان سکا۔ شاید اس لیے کہ وہ اسے تین چار سال بعد دیکھ رہا تھا اور شاید اس لیے بھی کہ رب نواز کا حلیہ بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کا سر "صفاچٹ" تھا۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور وہ شلوار قمیص کے بجائے لمبے زرد چغے میں تھا۔

"ارے تم یہاں؟" حامد نے حیرت سے کہا۔

وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا اور اسے ساتھ لے کر صحن کے ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ یہاں دھوپ کی خوش گوار حرارت موجود تھی اور بیٹھے بیٹھے پورے احاطے پر نظر ڈالی جا سکتی تھی۔ رب نواز نے حامد کو بتایا کہ وہ پچھلے دو برس سے اس مزار کے خدمت گاروں میں شامل ہے۔ بیوی سے رب نواز کی علیحدگی ہو چکی تھی' وہ دونوں بچے بھی ساتھ لے گئی تھی۔ اب رب نواز اکیلا تھا۔ یہاں مزار میں پیٹ بھر کر کھانا ملتا تھا' کپڑے لتے کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ بس آرام ہی آرام تھا۔

دونوں کافی دیر گفتگو کرتے رہے۔ رب نواز نے حامد کو مزار کے بہت سے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔ ان میں کچھ "اسرار" اچھے تھے اور کچھ اچھے نہیں تھے۔ حامد کے سامنے ایک دیوار کے ساتھ قطار میں چھ سات حجرے بنے ہوئے تھے۔ ہر حجرے کے باہر

دس بارہ عقیدت مند موجود تھے اور اندر جانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ بالکل جیسے یہ کوئی پرائیویٹ کلینک ہو اور مختلف امراض کے ماہر ڈاکٹر اپنے اپنے کمرے میں بیٹھے مریض دیکھ رہے ہوں۔

رب نواز نے بتایا "یہ سارے عامل اور بزرگ "حضرت بابا جی" کے شاگرد ہیں اور اپنے اپنے طریقے سے سوالیوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ ان میں سے دو تین تو واقعی عزت اور احترام کے لائق ہیں اور لوگوں کو ان سے فائدہ بھی پہنچتا ہے۔ مگر تین چار ایسے بھی ہیں جنھوں نے بس فقیروں کا بھیس بنا رکھا ہے۔" اس نے ذرا توقف کر کے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا "جیسے وہ چھوٹا حجرہ دیکھو۔ یہاں جو پیر فرتوت بیٹھتا ہے وہ کالے علم کی کاٹ کرتا ہے۔ بظاہر نیک صورت ہے مگر بھنگ کا زبردست رسیا ہے۔ یہ اور اس کے چیلے بھنگ کو "پانی" کہتے ہیں اور "پانی" پینے کا اہتمام یوں کرتے ہیں جیسے عبادت کا اہتمام کر رہے ہوں.......... تیسرے حجرے میں پیر نذیر احمد رازی بیٹھتا ہے۔ یہ عملیات' وظیفے اور تعویذ گنڈے کا ماہر ہے لیکن ایک اور کام میں بھی اسے بڑی مہارت حاصل ہے۔ پختہ عمر کی کوئی خوب صورت عورت نظر آجائے تو اسے اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔"

حامد نے بے اختیار کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اسی دوران میں ایک حجرے کا دروازہ کھلا اور ایک عمر رسیدہ نورانی چہرہ دکھائی دیا۔ سفید براق داڑھی جو سینے تک چلی گئی تھی۔ غلافی آنکھیں' دل میں دور تک اتر جانے والی خوابیدہ سی نگاہ' سر پر ٹوپی' سفید بے داغ لباس اور ہاتھ میں تسبیح۔ حامد نے اس بارعب بزرگ کو دیکھا اور دیکھتا رہا بے حد متاثر کن شخصیت تھی بزرگ کی۔ حامد کی نظر صرف ایک لمحے کے لئے بزرگ کی نظر سے ملی اور اسے یوں لگا جیسے جسم میں پھریری دوڑ گئی ہو۔ حامد نے پوچھا "ان کا نام کیا ہے؟"

رب نواز بولا۔ "یہ پیر حضرت مزمل شاہ کرمانوالے ہیں۔ بابا جی کے سب سے پرانے شاگرد سمجھے جاتے ہیں۔ لوگ بہت مانتے ہیں انہیں۔" پھر ذرا توقف کر کے بولا "تمہارا کیا خیال ہے ان کے بارے میں؟"

حامد بولا "مجھے تو اصلی اللہ والے لگتے ہیں۔"

رب نواز مسکرایا "ہیں' کو اک کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔"

"کیا مطلب؟" حامد بے حد حیرانی سے بولا۔ •

رب نواز نے کہا "بھئی ہم اندر کے آدمی ہیں اس لیے ہمیں وہ باتیں بھی معلوم

ہیں جو عام لوگوں کو معلوم نہیں۔ شاہ جی یوں تو بڑے اچھے ہیں لیکن کبھی کبھی خاص بندوں کے لیے دو نمبر کام بھی کرتے ہیں۔ اب تم پوچھو گے دو نمبر کام کیا ہوتا ہے۔"

"بالکل پوچھوں گا۔"

وہ بولا "دو نمبر کام کی مثال یہ ہے کہ گوجرانوالہ سے ایک عورت آتی ہے' وہ کہتی ہے کہ اس کا خاوند دوسری شادی کر رہا ہے۔ وہ شاہ جی سے درخواست کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کرشمہ دکھائیں کہ شادی رک جائے۔ شاہ جی دیکھ لیتے ہیں کہ اسامی موٹی ہے اور خرچہ کر سکتی ہے۔ وہ اس کے لیے خصوصی کوشش کرنے کا وعدہ کرتے ہیں اور اس کوشش کا نذرانہ دو ہزار روپے طلب کرتے ہیں.......... شاہ جی کے بہت سے چیلے ہیں جو اپنے حلئے اور بول چال سے عام آدمی ہی نظر آتے ہیں۔ یہ چیلے شاہ جی کے لیے مخبری کا کام کرتے ہیں.......... وہ دوسری شادی پر آمادہ شخص کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرتے ہیں اور اس گھرانے کے بارے میں بھی جان کاری لیتے ہیں جہاں وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ یعنی کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کس مزاج کے ہیں۔ کس سے دشمنی ہے' کس سے دوستی ہے۔ ان کے مسئلے مسائل کیا ہیں۔ جب یہ ساری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں تو ایک دن پیر صاحب گوجرانوالہ پہنچتے ہیں اور اس شخص سے ملتے ہیں جو شادی کر رہا ہے لیکن یہ ملاقات ایسے انداز سے ہوتی ہے جیسے اتفاقیہ اور سر راہ ہو گئی ہو۔ پیر صاحب اس شخص کو اس کی قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ اس کے ماضی اور حال کے بارے میں ٹھیک ٹھیک نشانے لگاتے ہیں۔ وہ شخص پیر صاحب کی سحر انگیز شخصیت اور باتوں کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اسے بتاتے ہیں کہ وہ دوسری شادی کرنے والا ہے اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ دوسری شادی اس کے لیے کیسے کیسے خوف ناک عذاب لانے والی ہے اور دوسری بیوی اس کا کیا حشر کرنے والی ہے۔ لوگوں کی سادہ لوحی اور وہم پرستی کی وجہ سے اکثر پیر صاحب کو کامیابی ہوتی ہے۔"

حامد حیرانی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ رب نواز سرگوشی میں بولا۔ "یہ تو میں نے تمہیں بس ایک مثال دی ہے۔ ایسے ایک سو ایک کام پیر صاحب کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن بات پھر وہی ہے' کام خاص آدمیوں کے ہوتے ہیں اور ان کے ہوتے ہیں جو بھاری نذرانہ دے سکتے ہوں۔"

حامد بولا "بھائی رب نواز' سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

وہ مسکرایا "اگر تیرا کوئی کام ہے تو بتا۔ نذرانے میں رعایت کرا دیں گے۔"

"میرا کیا کام ہو گا۔" وہ بولا۔

"اس عمر میں بڑے کام پڑ جاتے ہیں بندے کو۔ کہیں آنکھ شانکھ ہی لگ جاتی ہے۔"

"نہیں' ابھی تو ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے سفید جھوٹ بولا۔

"چلو جب ہو گی تب سہی" رب نواز آنکھ دبا کر مسکرایا۔

حامد کچھ دیر مزید رب نواز کے پاس بیٹھا پھر اس "مزار" کے حوالے سے درجنوں حیرتیں سمیٹ کر گھر واپس آگیا۔

.... کہتے ہیں کہ گیا وقت نہیں لوٹتا لیکن حامد کے لیے گیا وقت لوٹ آیا تھا۔ گلابی جاڑے کی وہ شامیں حامد کے لئے ناقابل فراموش تھیں۔ اس کی برساتی فرخندہ کی مہک سے پھر آباد ہو گئی تھی۔ اسے فرخندہ سے صرف ملنا ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے انتظار کی گھڑیاں' پل اور دن گننا بھی اچھا لگتا تھا۔ حامد کے ہونٹ ایک لامتناہی صحرا تھے اور فرخندہ کے چہرے کا لمس ایک جل تھل کرنے والا بادل۔ ان کا رشتہ اٹوٹ تھا۔ معلوم نہیں لوگوں کو اس رشتے کی خبر تھی یا نہیں اور اگر تھی تو کس حد تک تھی۔ وہ کبھی کبھی گہری سوچ میں غرق ہو جاتا تھا لیکن یہ غرقابی اسے کسی نتیجے پر نہیں پہنچاتی تھی۔ کبھی اسے لگتا تھا کہ عبدل بہت کچھ جانتا ہے' امی بہت کچھ جانتی ہیں اور والد بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔ کبھی اسے لگتا کہ کوئی کچھ نہیں جانتا' یہ سب اس کا وہم ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو فرخندہ اپنے گھر میں اور گلی محلے میں قابل عزت نہ ہوتی۔ بڑی بوڑھیاں اسے محبت سے اپنے پاس نہ بٹھاتیں۔ پڑوسنیں اس سے گھنٹوں باتیں نہ کرتیں اور عبدل اسے "فرخندہ جی' فرخندہ جی" نہ کہتا۔

ہاں وہ سرد شامیں یادگار تھیں۔ اندھیرا ہوتے ہی چیلیں آسمان سے غروب ہو جاتیں۔ گھروں میں بتیاں جل اٹھتیں۔ دور کسی دکان پر یا شادی والے گھر میں فلمی گانوں کی ریکارڈنگ بجائی جاتی۔ گلی سے "گرم انڈے" والا آواز دیتا گزر جاتا۔ حامد کی برساتی میں مونگ پھلی کی ٹک ٹک گونجتی اور فرخندہ کا انتظار اس کی رگ رگ میں مٹھاس بھر دیتا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ محبت کے ایک زینے پر کھڑے کھڑے حامد کے پاؤں پھر تھکنے لگے۔ اس کا دل مچلنے لگا کہ وہ کچھ زینے اور طے کرے' اپنے محبوب سے کچھ اور قریب ہو جائے لیکن وہ ڈرتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے فرخندہ کو کھو دے گا۔ وہ ایک

جاں گسل کشمکش کا شکار ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ فرخندہ کیا چیز ہے۔ وہ اس کے بارے میں جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھ جاتا تھا...........

وہ ایک بڑی سہانی رات تھی۔ نکھرے ہوئے آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ حامد لحاف میں گھسا مونگ پھلی ٹھونگ رہا تھا اور انگیٹھی پر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ وہ کھڑکی کھلی تھی جہاں سے فرخندہ کے گھر کا آنگن نظر آتا تھا۔ آج رات اسے آنا تھا۔ وہ والہانہ بے چینی سے نو بجے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک طویل انتظار کے بعد گھڑی کی سوئی نے نو کے ہندسے کو چھوا۔ وہ چھت پر آگیا اور فرخندہ کے آنگن کی طرف دیکھنے لگا۔ غیر متوقع طور پر اندرونی کمروں کی بتیاں جل رہی تھیں اور باتوں کی آواز آرہی تھی۔ فرخندہ کی ایک مہمان آئی ہوئی تھی۔ وہ فرخندہ کی ساس کی سہیلی بھی تھی۔ بس دونوں عورتیں گپیں ہانک رہی تھیں اور فرخندہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی وہ کسی بات پر زور سے ہنستی تھیں تو آواز باہر تک آتی تھی۔ حامد کو غصہ آنے لگا۔ معلوم نہیں کیسی بوڑھی روح بسی ہوئی تھی فرخندہ میں؟ وہ کیوں دلچسپی لیتی تھی بڑی بوڑھیوں کی باتوں میں۔ اس نے ایک دو بار فرخندہ سے پوچھا بھی تھا۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بولی تھی "بڑوں کے پاس بیٹھنے سے دانائی ملتی ہے۔"

"اور چھوٹوں کے پاس بیٹھنے سے؟"

"چھوٹوں کے پاس بیٹھنے میں بڑے خطرات ہیں۔" اس نے شرارت سے جواب دیا تھا۔

.... معلوم نہیں یہ کب تک یونہی بیٹھی دانائی حاصل کرتی رہے گی۔ حامد نے جھلا کر سوچا۔ وہ کچھ دیر منڈیر کے پاس کھڑا رہا اور زور زور سے کھنکھار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہا پھر واپس کمرے میں آگیا۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے چلتی رہیں اور گیارہ بج گئے۔ فرخندہ اور مہمان عورت کی باتیں مختصر ہونے میں ہی نہیں آرہی تھیں۔ حامد نے تلملا کر اپنا سر تکیے میں گھسیڑ دیا اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ کوئی گھنٹا بھر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے اور فرخندہ کو کوسنے کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو کسی کی انگلیاں اس کے بالوں میں رینگ رہی تھیں۔ اس نے خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ حامد کا ذہن نیم بیدار تھا۔ ایسے میں ایک عجیب سی بے باکی اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے فرخندہ کی گردن میں بازو حمائل کیا اور اسے اپنے اوپر جھکا لیا۔

اس روز پہلی بار حامد' چہرے اور گردن کے لمس سے آگے بڑھا۔ وہ فرخندہ کے تھوڑا سا اور قریب آگیا تھا۔ محبت کے سفر میں اس نے چند زینے اور طے کر لیے تھے۔ اس کی بانہوں کی بے تاب گرفت فرخندہ کو حصار میں لیے ہوئے تھی اور وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ "حامدی! چھوڑو مجھے' پلیز نہ کرو........" وہ دبی دبی زبان میں احتجاج کر رہی تھی۔ حامد کے کانوں میں اپنی سانسوں کی پھنکاروں کے سوا اور کوئی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ کتنی ہی دیر بعد وہ حامد سے جدا ہوئی تو اس کا لباس شکن شکن اور ریشمی گیسو منتشر تھے۔ اس کی ایک چوڑی کلائی میں کھب گئی تھی اور وہاں سے خون رسنے لگا تھا۔

"بڑے خراب ہو تم۔" وہ سی سی کرتے ہوئے بولی۔

حامد نے کلائی کا خون بند کرنے کے لیے اس پر اپنی ہونٹ رکھ دیے "اچھا میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر خفگی تھی۔

"ایسے نہیں جانے دوں گا۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟"

"پہلے مسکرا کر دکھاؤ۔"

"اچھا جانے دو۔" وہ روہانسی ہنسی میں بولی۔

"بدھ کو پھر آؤ گی ناں؟"

"اچھا۔" اس نے عاجز لہجے میں کہا۔

حامد نے اسے چھوڑا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

O------------☆------------O

حامد پر ایک فاتحانہ سرشاری طاری تھی۔ آج چار برس بعد سہی' اس نے فرخندہ کی محبت میں چند زینے اور طے کیے تھے۔ اس کے جسم میں ایک ہیجان برپا تھا۔ قدم باقی زینوں پر دندنانے کے لیے مچل رہے تھے۔ وہ فرخندہ کے پیار میں ہر اندیشے' ہر خوف اور حد سے گزر جانا چاہتا تھا۔ فرخندہ کی قربت کا شوق اس کے رگ و پے میں سیال آگ کی طرح دوڑ رہا تھا۔ وہ پیدائشی عاشق تھا اور اپنے بہترین مقام پر تھا۔ شمیم جو کچھ عرصے کے لیے اس کی زندگی میں آئی تھی' فرخندہ کے پیار کی تند و تیز آندھی میں تنکا بن کر اڑ چکی تھی۔

اگلے روز حسب توقع فرخندہ پھر کالے برقع میں نظر آئی۔ وہ اپنی ساس کے ساتھ باباجی کے مزار پر جا رہی تھی۔ اسے گھر میں ایک ایک پیسے کی ضرورت تھی' پتا نہیں وہ

چادر چڑھانے اور خیرات دینے کے لیے پیسے کیسے اکٹھے کر لیتی تھی۔

اب حامد کو بے حد بے قراری سے بدھ کا انتظار تھا۔ بدھ کی شام ہونے میں ابھی پورے چھ روز باقی تھے۔ تقریباً ۱۴۴ گھنٹے' جن میں ۸۶۴۰ منٹ تھے۔ وہ ایک ایک پل کا حساب رکھے ہوئے تھا۔ وہ برساتی کے سامنے بیٹھ جاتا اور دیر تک فخری لوہار کے گھر کی چھت دیکھتا رہتا۔ فخری کی چھت پر پہلے بھی کبوتر ٹہلا کرتے تھے لیکن اب انہیں دیکھنا حامد کو بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ان پرندوں کی دلچسپ اداؤں میں کھو سا جاتا تھا۔ اس کا دل چاہتا' فرخندہ ایک کبوتری بن کر ہمیشہ کے لیے اس کے دل کی چھتری پر آبیٹھے۔ وہ اسے اپنا لے' اس سے شادی کر لے۔ ساری رکاوٹیں توڑ کر' ساری دنیا سے ٹکر لے کر ایک انہونی کو ہونی میں بدل دے۔ ایسے میں والد صاحب کا بارعب چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا اور اس کی رگوں میں اینٹھن سی جاگ اٹھتی۔ جمعے کے روز فرخندہ کا خاوند بھی کراچی چلا گیا۔ وہ بلڈنگ میٹریل کا کام شروع کر رہا تھا اور یہ بھاگ دوڑ اسی سلسلے میں تھی' عبدل کے کراچی چلے جانے کے بعد حامد کے لیے میدان اور بھی صاف ہو گیا تھا۔ یہ حامد کے دل کی گواہی تھی کہ بدھ کی رات اسے اپنے محبت بھرے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ وہ اپنے پیار کی طاقت سے بخوبی آگاہ تھا۔ فرخندہ کے خلاف اس کا سب سے بڑا ہتھیار روٹھ جانا تھا۔ اس کا روٹھنا فرخندہ کے لیے سوہان روح ہوتا تھا۔ وہ اسے منانے اور بہلانے کے لیے بے چین ہو جاتی تھی........ لیکن اس مرتبہ........ فرخندہ نے حامد کو روٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سب کچھ اتنا غیر متوقع اور تکلیف دہ تھا کہ حامد سکتے کی سی کیفیت میں رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک زنانے کا تھپڑ اس کے چہرے پر لگا ہو۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آخری "زینے" طے کرنے سے پہلے وہ پھسلے گا اور دھڑام سے پاتال میں جا گرے گا۔

وہ منگل کا دن تھا' حامد سہ پہر کے وقت کالج سے آیا تھا۔ گلی سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ فرخندہ کے گھر میں تالا پڑا ہوا ہے۔ اس نے سوچا' شاید وہ بازار گئی ہے یا پھر باباجی کے مزار پر........ مگر گھر میں داخل ہونے کے بعد اسے ماں کی زبانی پتا چلا کہ فرخندہ اپنی ساس کے ہمراہ اپنے شوہر کے پاس کراچی چلی گئی ہے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ لرزتے لہجے میں بولا۔

"بھئی ہو کیوں نہیں سکتا۔" اس کی والدہ نے جواب دیا تھا۔ "عبدل کا تار آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ پھوپھا بشیر نے دکان کے علاوہ کرائے کے مکان کا بندوبست بھی کر دیا

ہے لہٰذا وہ کراچی آنا چاہے تو ماں کے ساتھ چلی آئے۔"

برآمدے سے حامد کی دادی بولیں۔ "آئے ہائے' اس نے یہ تھوڑی کہا تھا کہ اڑ کر چلی آئے۔ ایک دو ہفتے میں آرام سے چلی جاتی۔ مل ملا بھی لیتی سب سے۔ وہ تو یوں نکلی ہے جیسے کوئی پیچھے پڑا ہوا ہو۔"

"کک.......... کب آیا تھا عبدل کا تار؟" حامد نے تھوک نگل کر ماں سے پوچھا۔

"یہ تو اتوار کی بات ہے۔ فرخندہ نے نہیں بتایا تھا تجھے؟"

"نن.......... نہیں۔" حامد نے بمشکل کہا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کا ذہن ایک صحرا تھا اور اس میں جھلسا دینے والی آندھیاں چل رہی تھیں۔ اچانک اس کی نگاہ کتابوں کی الماری میں عبداللہ حسین کے اس ناول پر پڑی جو وہ آج کل پڑھ رہا تھا۔ ناول کے صفحات میں ایک پرچہ دبا ہوا تھا۔ یقیناً یہ فرخندہ ہی نے رکھا تھا۔ اس کا خیال درست نکلا۔ کاپی سائز کے ورق پر فرخندہ نے یہ چند الفاظ لکھے تھے۔

"میں جا رہی ہوں۔ بہت بڑی گناہگار ہوں۔ تمہیں بھی گناہگار کر رہی ہوں۔ میری سزا اب یہی ہے کہ کبھی تمہیں اپنی صورت نہ دکھاؤں۔ تمہیں بھلانے کی کوشش کروں گی' حالانکہ میرے لیے یہ آسان نہیں ہوگا۔ اللہ کرے تم خوش رہو۔ مجھے معاف کر دینا۔"

O------------☆------------O

فرخندہ واپس نہ آنے کے لیے جا چکی تھی ا، ،امد کے سینے پر ایک ایسا داغ چھوڑ گئی تھی جو اسے ہردم بے چین رکھتا تھا۔ کتنی بے رحم تھی.......... حامد کو تھوڑی دیر کے لیے بھی ناخوش نہیں دیکھ سکتی تھی اب اسے ہمیشہ کے لیے نیم بسمل کر گئی تھی۔ آریا نگر اب حامد کے لیے ایک ایسا کھنڈر تھا جس میں محرومیوں او اداسیوں کی چمگادڑیں' پھڑپھڑایا کرتی تھیں۔ اور آریا نگر ہی کیا پورا شہر اس کے لیے ایک منحوس خرابا تھا۔ وہ ناصر کاظمی کے اس شعر کی تصویر تھا.......... دل تو میرا اداس ہے ناصر' شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے.......... وہ جانتا تھا اب بھی موسم کروٹ بدلیں گے' روز و شب کی گنتی میں اب بھی ہزاروں بار "بدھ" کا دن آئے گا لیکن وہ "بدھ" اب کبھی نہیں آئے گا جس کا انتظار اس نے جذبوں کی انتہائی شدت کے ساتھ کیا تھا۔

وہ اس کرب ناک شہر کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں کچھ ہفتوں کے لیے مری چلا گیا لیکن جب دل میں سکون نہ ہو' مرغزاروں میں بھی وحشت ناچتی ہے۔ وہ

تین ہفتے بعد واپس آیا تو یہ جان کر اس کی رہی سہی امیدیں بھی دم توڑ گئیں کہ عبدل نے آریا نگر والا مکان بیچ ڈالا ہے۔ وہ آنگن' وہ در و دیوار' وہ ڈیوڑھی' وہ سرسبز بیل' وہ سب کچھ جو حامد کو فرخندہ کی طرح پیارا تھا' اب کسی اور کے قبضے میں تھا۔ چند دن بعد حامد کو والدہ کی زبانی یہ پتا بھی چل گیا کہ مکان بکنے میں عبدل سے زیادہ فرخندہ کی خواہش کو دخل تھا۔

O------------☆------------O

دو تین ماہ بعد دل کے بے حد مجبور کرنے پر وہ کراچی چلا گیا۔ بہانہ سمندر دیکھنے کا تھا مگر حقیقت سمندر سے بھی گہری تھی۔ عبدل کا پتا اس کے پاس موجود تھا۔ وہ ڈھونڈتا ڈھانڈتا لیاری کے اس پتے پر پہنچ گیا.......... لیکن نجانے کیا ہوا' اس کی گلی کے نزدیک پہنچ کر ایک دم حامد کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے آخری خط کے آخری الفاظ حامد کی آنکھوں میں ناچنے لگے۔ اس نے لکھا تھا "مجھے معاف کر دینا۔" یہ چند الفاظ تھے لیکن ان کا مطلب بہت وسیع تھا۔ ان میں ایک التجا تھی' آرزو تھی.......... اور پھر کبھی نہ ملنے کی درخواست تھی۔ وہ جیسے بہت دور' کسی راستے پر کھڑی تھی اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی.......... وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن' اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا.......... ان تمام خوب صورت موڑوں کی یادیں لے کر جو فرخندہ کے حوالے سے اس کی زندگی میں آئے تھے' وہ واپس پلٹ آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان یادوں میں ایک بے حد لذیذ درد موجود ہے۔ ایسا درد جس نے "ادھورے پن" سے جنم لیا ہے۔ اس درد کے سہارے وہ ایک زندگی گزار سکتا تھا۔ شاید اس بدھ کے روز وہ فرخندہ سے آخری ملاقات بھی کر لیتا تو درد کی یہ دولت اسے نصیب نہ ہوتی۔

فرخندہ اور عبدل یوں گئے تھے کہ پھر انہوں نے پلٹ کر آریا نگر کی خبر نہیں لی تھی۔ حامد کو پتا چلا تھا کہ فرخندہ کی سہیلی سکینہ کبھی کبھار اسے خط لکھتی ہے' ان خطوں کا جواب کبھی آتا ہے' کبھی نہیں آتا پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ سکینہ کی زبانی معلوم ہوا کہ عبدل کا پھوپا بشیر سے کاروباری جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ ان کے پاس سے چلا گیا ہے۔ وہ کہیں اور ذاتی دکان کھولنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کراچی میں ہے یا کسی اور شہر چلا گیا ہے۔ یہ آخری اطلاع تھی جو فرخندہ کے بارے میں حامد کو ملی۔

O------------☆------------O

حامد نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا پھر لاہور کے ایک مقبول انگریزی

روزنامے سے وابستہ ہو گیا۔ معقول تنخواہ تھی اور ترقی کے چانسز بھی تھے۔ 80 کی دہائی کے شروع میں والدہ کے مجبور کرنے پر اس نے شادی کر لی۔ لڑکی خوب صورت اور پڑھی لکھی تھی۔ شادی چونکہ خاندان سے باہر ہوئی تھی للٰذا حامد کے رشتے کے سلسلے میں خاندان کے اندر جو کھینچا تانی پائی جاتی تھی' وہ ختم ہو گئی تھی۔ اور تو اور تائی عصمت یعنی شیم کی والدہ سے بھی ان کے تعلقات اچھے ہو گئے تھے۔ شیم کی شادی ایک اچھے گھرانے میں ہو چکی تھی اور وہ ایک بچے کی ماں تھی.......... (حامد پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اگر شیم کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہوئی تو یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا) ایک مرتبہ تائی عصمت حامد کے گھر آئیں اور دو تین ہفتے رہیں۔ ان کے ساتھ حامد کی وہ پہلے جیسی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ ایک روز حامد کی بیوی سمیت تمام اہل خانہ محلے میں ہونے والی ایک شادی میں گئے ہوئے تھے۔ تائی عصمت اور حامد کمرے میں اکیلے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ پرانی باتیں ہو رہی تھیں۔ حامد نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "تائی جان! ایک بات بتائیں.......... ایک وقت ایسا آیا تھا جب میرے اور شیم کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ آپ بھی راضی تھیں لیکن کشمکش میں تھیں۔ ایک دن کچھ سوچتی تھیں' دوسرے دن کچھ۔ پھر ایک دن اچانک آپ نے دو ٹوک فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے۔ اس دن آپ کو کیا ہوا تھا؟"

پرانی باتیں یاد کرتے ہوئے وہ ملول سی ہو گئیں۔ چھوٹی سی تسبیح گھماتے ہوئے بولیں۔ "بیٹے! میرا نظریہ آج بھی وہی ہے جو اس وقت تھا۔ خاندان میں شادیاں.........."

"میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" حامد نے ان کی بات کاٹی' "لیکن آپ یہ بتائیں کہ اس دن آپ نے ایک دم فیصلہ کیوں کیا۔ کیا کسی سے مل کر آئی تھیں آپ؟"

وہ ہولے سے بولیں "ہاں.......... اس لڑکی نے میری بڑی مدد کی' اس نتیجے تک پہنچنے میں۔"

"کس لڑکی نے؟"

"ارے وہی جو تیرے گھر کے سامنے والے مکان میں رہتی تھی۔ بڑی ملنسار اور ہنس مکھ تھی بے چاری۔ کیا نام تھا اس کا۔"

"فر.......... فرخندہ؟"

"ہاں.......... ہاں۔ وہ بابا جی کے مزار پر جاتی تھی ناں۔ وہیں پر اس نے پیر صاحب سے بات کی تھی۔"

"کس کے بارے میں بات کی تھی؟"

"تیرے اور شیم کے رشتے کے بارے میں۔ پیر شاہ جی نے کہا تھا کہ یہ رشتہ مبارک نہیں رہے گا۔ مزار سے واپس آکر اس نے مجھے بتایا اور اصرار کرنے لگی کہ میں بھی ایک بار پیر صاحب سے مل لوں۔ میں نے پہلے تو انکار کیا پھر اس کے ساتھ چلی گئی۔ پیر شاہ جی کی باتیں سن کر ہی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ رشتہ نہیں کروں گی۔ ماشاء اللہ تمہارے لیے لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ شیم کو بھی اس کی قسمت کامل ہی گیا ہے۔ اللہ نے جو کیا' اچھا ہی کیا ہے۔ خیر اب چھوڑو ان باتوں کو۔ کوئی نئی بات کرو۔"

حامد نئی بات کیا کرتا اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ تائی جان کے پاس سے اٹھا اور جیسے خواب میں چلتا ہوا اس برساتی میں آبیٹھا جو کبھی اس کی پناہ گاہ ہوا کرتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں فرخندہ کا چہرہ رقصاں تھا اور کانوں میں پیر شاہ جی کا نام گونج رہا تھا۔ وہ اب تک یہی سمجھتا تھا کہ فرخندہ سے اس کی محبت کا دوسرا دور اس لیے شروع ہوا تھا کہ شیم اس کی زندگی سے نکل گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شیم کو اس کی زندگی سے نکالنے میں فرخندہ کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ وہی تھی جس نے شیم کے ساتھ اس کا تعلق بنایا بھی تھا اور بگاڑا بھی۔ وہ کیسی عورت تھی؟ وہ اس سے پیار کرتی تھی اور اس سے دور بھی بھاگتی تھی۔ وہ اس کے پیاسے ہونٹوں کو سیراب بھی کرتی تھی اور پھر اس گناہ کی تلافی کے لیے چادریں بھی چڑھاتی تھی۔ وہ اس کی زندگی سے نکلنے کے لیے شیم کو اسکی زندگی میں داخل کرتی تھی اور پھر شیم کو نکال کر دوبارہ اس کی زندگی میں داخل ہو جاتی تھی۔ وہ کیا راز تھی؟ کیا معما تھی؟ کیا وہ ساری عورتیں جن کی شادیاں "بے جوڑ" ہوتی ہیں' ایسی ہی سربستہ ہوتی ہیں؟ حامد گم صم لیٹا تھا اور فرخندہ کے کردار کو سمجھنے کی ایک اور ناکام کوشش کر رہا تھا۔

یہ بات طے تھی کہ فرخندہ نے مسلسل کوشش کر کے شیم کو حامد سے قریب کیا تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے ہر وقت مواقع تلاشتی رہتی تھی۔ جوں جوں مواقع ملتے گئے' وہ حامد سے دور ہٹتی گئی پھر ایک وقت آیا تھا کہ حامد شیم میں گم ہو گیا تھا.......... پھر کیا ہوا تھا؟ پھر یہ ہوا تھا کہ فرخندہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اس کی مزاحمت ٹوٹ گئی تھی اور وہ اپنی ہی کامیابی سے حسد کرنے لگی تھی۔ چاہے جانے کی ازلی خواہش اس میں پھر شدت سے جاگ اٹھی تھی۔ اس نے شیم کو حامد سے دور کرنے میں رازداری سے اپنا کردار ادا کیا تھا اور اس سلسلے میں کسی حیلے وسیلے سے "شاہ جی" کا تعاون بھی

حاصل کیا تھا (ممکن تھا کہ زیورات بیچنے سے جو رقم فرخندہ کے پاس آئی تھی' اس میں سے کچھ رقم شاہ جی کو نذرانے کے طور پر دے دی گئی ہو) بہرحال اہم بات یہ تھی کہ اس نے شمیم کو حامد سے دور کر دیا تھا.......... اور جب وہ دور ہو گئی تھی تو فرخندہ پھر سج دھج کر "چھم" سے اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔ اس کے پیاسے ہونٹوں کو پھر سے سیراب کرنے کے لیے۔ اس کے خیالوں کو پھر سے اپنا اسیر بنانے کے لیے۔ وہ کیسی پہیلی تھی؟ اس نے پارسائی اور گناہ کے درمیان ایک خود ساختہ حد بنا رکھی تھی۔ وہ بہت زیرک تھی۔ اسے معلوم تھا.......... اسے پہلے سے معلوم تھا کہ ایک دن حامد یہ "حد" عبور کرنے کی کوشش کرے گا اور جب حامد یہ حد عبور کرے گا' وہ اس کے دل میں اپنی ازلی کسک چھوڑ کر کہیں بہت دور چلی جائے گی۔ ہمیشہ اس کے خیالوں میں زندہ رہنے کے لیے' سدا اس کے تصورات میں بسیرا کرنے کے لیے۔

حامد نے ایک طویل آہ کھینچی اور آنکھوں میں آنسو سمیٹ کر چھت پر نکل آیا۔ سورج کی الوداعی کرنیں فرخندہ کے گھر کے آنگن کو بوسہ دے رہی تھیں۔ فرخندہ کے صحن میں لگی ہوئی انگور کی بیل ابھی تک موجود تھی۔ اب وہ پھیلتے پھیلتے گلی کے اوپر سے گزر گئی تھی اور حامد کے گھر کی چھت پر لہلہایا کرتی تھی۔ بالکل جیسے فرخندہ گلی کی اوپر سے گزر کر آتی تھی اور حامد کے گھر کی چھت پر "لہلہایا" کرتی تھی۔ وہ بیل کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے پتوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

جذبہ دروں

تخلیق خون پیتی ہے۔

تخلیق ہڈیاں چباتی ہے۔

تخلیق اپنے "تخلیق کار" کو ریزہ ریزہ کرتی ہے

اور پھر ایک نئی شکل میں جوڑتی ہے۔

وہ بھی ایک ایسی ہی کیفیت سے دو چار شخص تھا۔

وہ تخلیق کار تھا' اور محبت بھی کرتا تھا۔

وہ بیک وقت بے رحم تھا' اور قابل رحم بھی'

کیونکہ ...... تخلیق کی اپنی ضروریات تھیں اور محبت کی اپنی ضروریات۔

وہ بہار کی ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ بے حد اجلی اور خوش گوار۔ میں ابھی ابھی کالج سے لوٹا تھا اور گھر کی چھت پر بیٹھ کر کینو کھا رہا تھا۔ ہمارے گھر کے آگے سو گز کا میدان تھا۔ میدان سے آگے وہ دو منزلہ مکان تھا جس میں وہ رہتی تھی۔ اچانک مجھے وہ صحن میں نظر آئی۔ کھلتے ہوئے گلابی کپڑے اس پر بہت جچ رہے تھے۔ وہ میری ہی طرح دراز قد اور چھریرے جسم کی تھی۔ بال ریشمی اور لمبے۔ شانے کشادہ تھے وہ بہت خوب صورت نہیں تھی لیکن اسے بڑی آسانی سے قبول صورت کہا جاسکتا تھا۔ اس دن بیٹھے بٹھائے نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے ہاتھ میں پکڑے کینو پر چاقو کی مدد سے LOVE لکھ دیا (لکھنے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ پہلے کینو کے چھلکے پر چاقو کی نوک سے باریک لکیریں لگائیں پھر وہاں سے چھلکا اتار دیا..........) یہ سب کچھ جیسے ایک خودکار عمل کی طرح ہوا تھا۔ اس کے بعد میں زینے اتر کر نیچے آیا۔ گلی پار کی اور میدان سے گزر کر اس دیوار تک پہنچ گیا جس کی دوسری جانب اس کے گھر کا صحن تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ابھی تک صحن میں ٹہل رہی ہے۔ میں جہاں کھڑا تھا وہ کوئی سنسان جگہ نہیں تھی۔ ارد گرد بہت سے مکانات تھے۔ عین ممکن تھا کہ کسی کھڑکی، جھروکے میں سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ میرے ہی گھر سے میری امی، پھوپھی یا دادی مجھے جھانک رہی ہوں لیکن ان لمحوں میں ایک عجیب بے خودی مجھ پر طاری تھی۔ بس ذہن میں یہی ایک خیال تھا کہ میرے دل میں جو آیا ہے وہ کر گزرنا ہے۔ میں نے بالنگ کرانے والے انداز میں ہاتھ گھما کر کینو اس کے صحن میں پھینک دیا تھا اور تیز قدموں سے واپس آگیا تھا۔

یہ لمحہ میری اور عالیہ کی محبت کا نقطہ آغاز تھا۔ وہ محبت جس نے آنے والے ماہ و سال میں میری زندگی کو ان گنت طوفانوں سے آشنا کیا.........

میں ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھا۔ ہمارا ریڈی میڈ گارمنٹس کا کام تھا۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ میں سب سے بڑا تھا اور لاڈلا بھی۔ جس گھر میں ہم رہتے تھے وہاں ہمارے علاوہ ہماری چچی بھی رہائش پذیر تھیں، اس کے علاوہ میری بیوہ پھوپھی بھی تھیں۔ یہ سب لوگ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ اگر میرے بعد کوئی بھائی بھی پیدا ہو جاتا تو شاید یہ پیار کسی حد تک تقسیم ہوتا لیکن میرے بعد تین بہنیں ہوئیں۔ بے شک انہیں بھی محبت ملی لیکن لڑکا ہونے کی حیثیت سے اہل خانہ کی زیادہ توجہ کا مرکز میں ہی رہا۔ اللہ نے شکل و صورت بھی اچھی دی تھی۔ کالج میں اکثر لڑکے کہا کرتے تھے۔ "یار ندیم! تم تو بنے بنائے ہیرو ہو۔"

گھر میں پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اور میرے لئے تو خاص طور سے کوئی کمی نہیں تھی۔ میں اچھے سے اچھا لباس پہنتا تھا اور نوعمری میں ہی مجھے موٹر سائیکل بھی مل گئی تھی۔ ہروقت اتراتا پھرتا تھا۔ شعر و ادب سے مجھے فطری لگاؤ تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ لگاؤ مجھے ننھیال کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔ کالج سے آکر کرکٹ کھیلنا اور شعر گوئی میرے محبوب مشاغل تھے۔ ایک دو لڑکیوں سے راہ و رسم بھی ہوئی تھی لیکن بات زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی......... یہ حالات تھے جب بہار کی اس بہت چمکیلی دوپہر کو میں نے وہ عجیب وغریب حرکت کی......... یعنی "کینو" پر پیغام محبت لکھا تھا اور اس سروقد لڑکی تک پہنچادیا۔

تین چار ماہ تو ہماری محبت یوں پروان چڑھتی رہی کہ مجھے اس کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ لوگ کون ہیں، کیا کرتے ہیں۔ میں نے اپنی محبوبہ کو قریب سے دیکھا نہیں تھا، اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ اردو بولتی ہے یا پنجابی۔ بس یہ "دیکھنے" کی محبت تھی۔ ایک نظر کا رشتہ تھا جو مجھے ہر گھڑی بے چین رکھتا تھا۔ کالج سے آتے ہی میں اسے دیکھنے کے لئے چھت پر چلا جاتا۔ شام ہوتی تو کمرے کی کھڑکی کھول لیتا۔ ہمارے کچن کی ایک کھڑکی بھی ان کے گھر کی طرف کھلتی تھی۔ اس کے علاوہ سیڑھیوں کی ایک طویل جالی بھی نظارہ کرنے میں مدد دیتی تھی۔ شروع میں تو مجھے یہ سلسلہ یک طرفہ لگا لیکن پھر اندازہ ہوا کہ اگر میں دید کا طالب ہوں تو وہ بھی نگاہ شوق کی

طالب ہے۔ اگر کبھی میں مقررہ وقت پر چھت پر نہ جاتا تو وہ بے چین سی صحن میں ٹہلتی، کھڑکیوں سے ہمارے گھر کی طرف دیکھتی اور ایک اضطراب سا اس کے سراپے میں دوڑتا محسوس ہوتا۔ پھر جب میں سامنے آجاتا تو اس کے ہر رنگ سے، ہر ہر انداز سے مسرت کا خاموش اظہار ہوتا۔ جیسے وہ شمسی توانائی سے چلنے والا کوئی آلہ ہو اور میری نگاہیں سورج کی طرح اسے توانائی فراہم کرتی ہوں۔ ان دنوں مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ کالونی کے ایک گرلز ہائی اسکول میں دسویں جماعت کی طالبہ ہے۔ اس کے دو چھوٹے بھتیجے ہیں جن کی عمریں آٹھ اور بارہ سال کے درمیان ہیں۔ وہ نہایت پڑھاکو قسم کے طالب علم ہیں جس کا ثبوت نظر کی وہ عینکیں ہیں جو ان کے چہروں پر نظر آتی ہیں۔

پھر ایک روز اپنے ایک پیارے دوست رضوی کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام عالیہ ہے۔ اس کے والد انکم ٹیکس کے محکمے میں ایک ایمان دار آفیسر تھے، شاید اسی لئے جلدی فوت ہو گئے۔ گاؤں میں ان لوگوں کی تھوڑی بہت زمین بھی تھی جس کی آمدن سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

وہ سہانے دنوں کی بڑی سہانی محبت تھی۔ شوخ، شرمیلی، بے چین۔ ذرا سی بات پر خوش ہو جانے والی اور معمولی سی دل شکنی پر رو دینے والی۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر پہروں اسے دیکھتا رہتا۔ وہ کبھی آنگن میں اپنی جھلک دکھاتی۔ کبھی کسی کھڑکی کے پیچھے اس کا آنچل لہراتا۔ کبھی وہ چھت پر سے ایک روشن لکیر کی طرح گزر جاتی۔ کسی وقت میں اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتا۔ عالیہ کا رد عمل ایک مسکراہٹ کی صورت میں سامنے آتا۔ یہ مسکراہٹ اتنے فاصلے سے کبھی تو وہم کی طرح دھندلی نظر آتی اور کبھی حقیقت کی طرح روشن ہوتی اور یقین بن کر دل میں اتر جاتی۔

پھر ایک روز میں نے عالیہ کو خط لکھ مارا تھا۔ لڑکپن کی اس محبت کے انداز نرالے تھے۔ میں نے اور رضوی نے وہ خط گھر کے باتھ روم میں بند ہو کر لکھا تھا۔ (کوئی اور جگہ سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی) اگلے روز میں نے وہ خط جیب میں ڈالا تھا اور ایک روایتی عاشق کی طرح بس اسٹاپ پہنچ گیا تھا۔ اس دوران میٹرک پاس کرنے کے بعد عالیہ نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ کالج کی سفید شلوار قمیض اور سرخ دوپٹے میں وہ کافی جاذب نظر لگتی تھی۔ عالیہ کا رنگ گندمی تھا...... ہاں اگر کسی وقت وہ زیادہ دیر دھوپ میں کھڑی

رہتی تو رنگ ذرا سا سانولا بن جاتا تھا لیکن یہ سانولا پن بھی برا نہیں لگتا تھا۔ اس روز میں عالیہ کے ساتھ ہی بس میں سوار ہوا تھا۔ شاید مجھے موقع دینے کے لئے یا پھر گھبراہٹ میں وہ کالج سے ایک اسٹاپ پہلے ہی اتر گئی تھی۔ میں کچھ دیر اس کے پہلو بہ پہلو پیدل چلتا رہا تھا پھر تھوک نگل کر میں نے بڑی مشکل سے کہا "عالیہ!"

مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے، کیوں تنگ کرتے ہیں مجھے؟" وہ گھبرائی ہوئی سی بولی تھی۔

"کبھی تنگ کیا ہے میں نے؟" مجھے اور کوئی جواب نہیں سوجھا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے سوچا تھا، یہ کہوں گا وہ کہوں گا لیکن موقع پر کچھ بھی نہ کہا گیا۔ مجھے پہلے سے خدشہ تھا کہ ایسا ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے "آپشن" کے طور پر میں نے خط لکھ رکھا تھا۔ میں نے خط نکالتے ہوئے کہا "یہ خط ہے۔"

وہ خاموش رہی تھی۔ اس نامعقول بات کا بھلا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ جو تہ شدہ کاغذ کی شکل میں اور میرے جیسے لرزتے کانپتے لڑکے کے ہاتھ میں ہو وہ خط قسم کی ہی کوئی چیز ہو سکتی تھی۔

میں نے جلدی سے خط ان کتابوں پر رکھ دیا تھا جو عالیہ نے سینے سے لگا رکھی تھیں اور کان لپیٹ کر واپس آگیا تھا۔

خط میں میں نے لکھا تھا کہ اگر اس کے دل میں میرے لئے تھوڑی سی بھی محبت ہے تو وہ مجھے جواب ضرور دے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میری یہ معمولی سی گزارش مستقبل میں کتنی بڑی ضد بن جائے گی اور اس ضد کے ہاتھوں مجھے اور عالیہ کو کیا کیا ستم سہنے پڑیں گے...... خط وصول کرنے کے بعد عالیہ نے کسی شدید رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جواب کی توقع کی جا سکتی ہے۔ خط میں میں نے ایڈریس بھی لکھا تھا۔ یہ رضوی کے ایک دوست کا ایڈریس تھا۔ جنرل اسٹور کے اس ایڈریس پر میں اپنا خط قطعی محفوظ تصور کر سکتا تھا۔

میں نے ہر روز موٹر سائیکل پر "شوکت جنرل اسٹور" کے پھیرے لگانے شروع

کردیئے۔ جاتے وقت میرے دل میں امید کا دیا روشن ہوتا تھا لیکن واپسی پر گھٹا ٹوپ تاریکی کے سوا کچھ باقی نہیں بچتا تھا۔ روشنی اور تاریکی کا یہ کھیل تقریباً دو ہفتے جاری رہا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں بارہا عالیہ سے کہا کہ وہ مجھے جواب لکھے' میں اس کے جواب کا انتظار کررہا ہوں۔ وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔ بہرطور کھڑکیوں جھروکوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔

دھیرے دھیرے میرا انتظار جھنجلاہٹ میں بدل گیا پھر اس جھنجلاہٹ نے گہری مایوسی کا روپ دھار لیا۔ میں نے ڈیڑھ دو ماہ کے لے عالیہ سے قطع تعلق کرلیا۔ چھت پر آنا جانا موقوف ہوگیا۔ کمرے کی کھڑکیاں بند رہنے لگیں۔ بالکونی میں پڑی ہوئی آرام کرسی میں نے اٹھاکر کمرے میں رکھ لی۔

ایسی بات نہیں تھی کہ میں نے عالیہ سے واقعی قطع تعلق کرلیا تھا۔ یہ تو نوعمری کی چنچل محبت کے نشیب و فراز تھے۔ میں چھپ چھپ کر عالیہ کو دیکھتا تھا۔ جب وہ مجھے آنگن میں بے قرار ٹہلتی نظر آتی یا میں دیکھتا کہ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہماری چھت پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے تو میرے دل میں شادمانی کے چشمے پھوٹ نکلتے اور جسم میں انبساط کی لہریں دوڑ جاتیں۔ یہ ایسی ہی تسکین تھی جیسی کسی کو اپنے محبوب سے مل کر ہوتی ہے۔ بہرحال یہ ملاپ تصوراتی تھا۔ عالیہ اب مجھ سے دور تھی۔ ہمارے درمیان مختصر سا فاصلہ تھا لیکن یہ صدیوں کا فاصلہ بھی تھا۔ میرا دل مچل رہا تھا کہ عالیہ کی طرف اپنے "سفر" کی رفتار تیز کروں لیکن دوسری طرف میں نے یہ عہد بھی کر رکھا تھا کہ جب تک وہ میرے خط کا جواب نہیں دے گی' میں آگے نہیں بڑھوں گا۔

آخر مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ میں نے اسے ایک اور خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ خط نسبتاً طویل تھا۔ میں نے عالیہ کو اپنی پرخلوص محبت' اپنی مسلسل تڑپ اور اپنے جاں گسل انتظار کا یقین دلایا۔ اسے بتایا کہ میں عام لڑکا نہیں ہوں۔ اس کی عزت کو اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ میں نے لکھا:

ہمارے تعلق کو اب ایک سال سے اوپر ہوگیا ہے۔ اس عرصے میں تمہیں سمجھ جانا چاہئے تھا کہ میں کس مزاج کا لڑکا ہوں۔ تم پوچھو گی کہ بغیر ملاقات کئے' بغیر ایک دوسرے کو جانے کسی کے مزاج کا کیسے پتا چل سکتا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ یہی تو محبت

ہے۔ دیکھ کر تو شاپنگ کی جاتی ہے' محبت تو آنکھیں بند کرکے کی جاتی ہے۔ بغیر دیکھے یقین کیا جاتا ہے۔ میری جان' مجھ پر یقین کرو۔ میرا وعدہ ہے کہ اس یقین کے لئے اس اعتماد کے لئے تمہیں کبھی شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ تم سمجھو کہ میرا سارا جسم ایک آنکھ ہے۔ میں اس آنکھ سے تمہارے خط کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اب اور نہ تڑپانا...... فقط نظر کرم کا طلبگار۔

ندیم!

مجھے یقین تھا کہ میرا یہ خط عالیہ کو پگھلا دے گا۔ وہ جواب دینے پر مجبور ہوجائے گی۔ میں نے اپنے دل کی بات بڑی وضاحت سے بیان کردی تھی۔ پیرایہ بھی خوبصورت تھا۔ شعرگوئی کے سبب اظہار و بیان کا مسئلہ میرے لئے خاصا آسان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے الفاظ عالیہ کو جھنجوڑ دیں گے۔

اس مرتبہ بھی کالج کے راستے میں میں نے یہ خط عالیہ تک پہنچایا۔ شومیٔ قسمت اس مرتبہ کوئی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا اور اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ زبان کی نسبت قلم کے ذریعے میں اپنا مافی الضمیر زیادہ سہولت سے بیان کرسکتا ہوں۔

عالیہ کے جواب کی تمنا میں میں نے ایک بار پھر شوکت جنرل اسٹور کے چکر لگانے شروع کردیئے۔ میں سارا دن شام چار بجے کا انتظار کرتا رہتا۔ جونہی چار بجتے' میں امید کے دریا میں بہتا جنرل اسٹور پر پہنچتا۔ واپسی کا سفر بھی ایک دریا میں ہی طے ہوتا لیکن یہ مایوسی کا دریا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر ترس آنے لگتا میں سوچتا میں کیوں ایک انہونی کے پیچھے اتنی شدت سے بھاگ رہا ہوں۔ کیوں ایک سائے کے تعاقب میں خود کو ہلکان کررہا ہوں۔ آخر وہ لڑکی ہے۔ ایک شریف لڑکی ہے۔ اتنی بڑی جرات کیسے کرسکتی ہے اور پھر مجھ سے ملے' مجھے جانے بغیر...... اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کیا کرتا۔ دل سے جواب آتا شاید میں بھی خط نہ لکھ سکتا...... لیکن "شاید" کی بات تھی۔ ہوسکتا تھا' میں لکھ ہی دیتا۔ اگر وہ مجھ سے پیار کرتی تھی' مجھے دیکھے بغیر بے چین رہتی تھی' ایک برس سے ہم دونوں ایک دسرے کے دل و دماغ میں سمائے ہوئے تھے تو پھر یقین نہ کرنے کی کیا

وجہ تھی۔

دو تین ہفتے میں میں بالکل مایوس ہوگیا۔ انتظار ایک بار پھر غم و غصے میں بدل گیا۔ ان دنوں موسم گرما کی چھٹیاں ہوچکی تھیں۔ کرکٹ بھی بند تھی۔ دوپہر کے وقت میں دو تین گھنٹے کے لئے دکان پر جاتا کیونکہ والد صاحب کو دوپہر کے کھانے کے لئے گھر آنا ہوتا تھا۔ اس مصروفیت کے علاوہ میں سارا دن کمرے میں ہی بند رہتا تھا۔ مطالعہ کرتا یا شعر لکھتا۔ ایک مہینے میں میں نے کوئی تین درجن غزلیں لکھ ڈالیں۔ ہر غزل میں ہجر و فراق کی تپش اور بے مہر راتوں کے غم تھے۔ کسی وقت لکھتے لکھتے میری آنکھیں بھیگ جاتیں اور صفحہ قرطاس پر لفظوں کے ساتھ آنسو بھی اتر آتے۔

عالیہ کی بے رخی نے (میں اسے بے رخی ہی سمجھتا تھا) واقعی مجھے صدمہ پہنچایا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی "استقامت" کا مظاہرہ کرے گی اور اپنے خاموش انکار پر یوں مضبوطی سے ڈٹ جائے گی۔ میں قریباً یہ فیصلہ کرچکا تھا کہ اس معاملے کو ہمیشہ کے لئے ختم کردوں گا لیکن پھر اچانک سب کچھ الٹ ہوگیا۔ ہماری دکان شادمان کے "پوش" علاقے میں تھی اور گھر اقبال ٹاؤن میں۔ دکان اور گھر میں کئی میل کا فاصلہ تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز عالیہ دکان پر چلی آئے گی۔

دوپہر دو ڈھائی کا وقت تھا۔ والد صاحب بارہ بجے کھانا کھانے کے لئے گھر چلے جاتے تھے اس دوران کاؤنٹر پر میں بیٹھتا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ عرصہ آرام کا ہی ہوتا تھا۔ کوئی اکا دکا بھولا بھٹکا گاہک آجاتا تو آجاتا ورنہ میں اور سیلز مین گپ شپ لگاتے یا ٹی وی دیکھتے تھے۔ اس روز بھی میں شان دار کاؤنٹر کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر قریباً نیم دراز تھا اور اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک مترنم آواز نے مجھے چونکا دیا "سنئے آپ کے پاس بونزا کی شرٹس ہوں گی۔"

میں نے اپنے سامنے اخبار ہٹایا۔ میرے روبرو دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔ دونوں نے حسب رواج اپنے نصف چہرے پھول دار چادروں کے پلو میں چھپا رکھے تھے۔ ایک لڑکی نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ یہ گوری تھی لیکن نقوش ذرا بھدے تھے۔ دوسری لڑکی کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ گندمی رنگ کی جاذب نظر لڑکی عالیہ تھی۔ میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ میں غیر ارادی طور پر کھڑا ہوگیا۔ دو سیلز مین دوڑتے ہوئے آئے۔

میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے واپس بھیج دیا۔

"ب........ بیٹھئے۔" میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

لڑکیاں مسکراتے ہوئے بیٹھ گئیں "جج........ جی فرمایئے۔" مجھے کوئی اور بات نہیں سوجھی۔

"جی فرمایا تو ہے۔" چشمے والی نے کہا۔

وہ خاصی پراعتماد نظر آتی تھی جب کہ عالیہ قدرے گھبرائی ہوئی تھی۔ اس گھبراہٹ کے باوجود اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شوخی بھی موجود تھی۔ اس ملی جلی کیفیت نے اس کی آنکھوں کو حسین تر کردیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں عالیہ کو اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا پھر بھی یہ آدھے چاند کی دید تھی۔ اس کا نصف چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

"کیا پئیں گی؟" میں نے عالیہ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بولی۔

"یہ تو پیسے بچانے والی بات ہے۔" چشمے والی نے کہا "پوچھنا ہے تو ہم سے پوچھئے۔ بلکہ پوچھنا بھی کیا ہے........ ٹھنڈا منگوا لیجئے۔" خاصی منہ پھٹ واقع ہوئی تھی وہ۔ عالیہ نے اسے مصنوعی ناراضگی سے گھورا۔ غالباً چٹکی وغیرہ بھی کاٹی۔ میں نے سیلز مین کو اشارہ کیا کہ دو بوتلیں لے آؤ۔

"میں نہیں پیوں گی۔" عالیہ نے تیزی سے کہا۔

"نہیں........ آپ کا تکیہ کلام تو نہیں؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"کیوں........ اور کس بات پر "نہ" کی ہے اس نے؟" چشمے والی نے پوچھا۔

"ایک ہی بات کی تھی۔ اسی پر "نہ" کردی۔" میں نے کہا۔ میرا اشارہ خط والی بات کی طرف تھا۔

"بہت بدگماں ہیں آپ۔" عالیہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

"اگر میں ہوں بھی تو آپ نے کون سی کوشش کی اصلاح کرنے کی؟"

"کیا یہ کوشش نہیں؟"

اس کا جواب مجھے لاجواب کرگیا لیکن دل میں پھانس تو موجود تھی۔ میں نے کہا "بڑی ادھوری سی کوشش ہے۔"

"مگر ہے تو۔"

"سنا تھا صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور بہت سا بھی۔"

"آپ کو مایوسی ہوئی ہے تو چلے جاتے ہیں۔"

"بھئی یہ کیا علامتی افسانہ شروع کردیا ہے تم دونوں نے۔" چشمے والی نے مداخلت کی "اللہ کے بندو! سیدھے سادے لفظوں میں بات کرو۔"

"تاکہ آپ کی سمجھ میں بھی سب کچھ آجائے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی! بات سمجھ میں آئے گی تو آپ کی پریشانیاں دور کروں گی نا........ بلکہ میرے خیال میں تو اب آپ کی پریشانیاں دور ہو ہی جانی چاہئیں........ کیوں ندیم صاحب؟" اس نے براہ راست مجھ سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی اب میں ہی بتاؤں........ دیکھیں جی' جہاں تک میں آپ دونوں کو سمجھی ہوں' آپ جناب کی پریشانی یہ تھی کہ عالیہ آپ کو جواب نہیں دے رہی تھی۔ اب جواب کی جگہ وہ خود آگئی ہے اب پیچھے کیا رہ گیا ہے۔ کیوں مائی ڈارلنگ عالیہ؟"

"صوفی۔" عالیہ نے احتجاج کیا "یہ کیا بات کر رہی ہو تم۔"

"ہاں یار........ یہ کیا باتیں کر رہی ہوں میں۔" وہ مصنوعی پریشانی سے بولی "ہم تو یہاں بونتزا کی شرٹس لینے آئے تھے........ کوئی اور بات تھوڑا ہی کرنے آئے تھے۔ اف! یااللہ........ یہ کیسی بے ہودگی ہوگئی مجھ سے۔"

اس کے انداز نے عالیہ کو بے اختیار مسکرانے پر مجبور کردیا۔ میں بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

میری اور عالیہ کی اگلی ملاقات جوبلی ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ یہ ریسٹورنٹ میکلوڈ روڈ کے علاقے میں واقع تھا۔ اس ریسٹورنٹ کے پرسکون کیبن رومانی جوڑوں کی گپ شپ کے لئے بڑے موزوں تھے۔ اس مرتبہ عالیہ نے بڑی دلیری دکھائی تھی اور اپنی باتونی سہیلی صوفی کے بغیر ہی چلی آئی تھی۔ سہمی سہمی آنکھوں میں اندیشوں کے ساتھ ساتھ شوق کے گلابی ڈورے بھی تھے۔ جی چاہا سب کچھ بھول بھال کر ان آنکھوں کو چوم لوں لیکن میں جانتا تھا' مجھے بہت احتیاط کرنی ہے۔ وہ ہلکی سی آہٹ سے بدک جانے والی ہرنی

نظر آرہی تھی۔ ہم اس پہلی ملاقات میں کوئی ایک گھنٹا بیٹھے۔ میں نے پہلی بار اس کے ہاتھوں کو چھوا اور لبوں کی حلاوت سے آشنا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے گلابی ڈورے کچھ اور گہرے ہوگئے۔

وہ تازہ شباب کی محبت تھی۔ اس محبت کے سوا کچھ دکھائی دیتا تھا اور نہ سنائی دیتا تھا۔ رات رات بھر کروٹیں بدلنا' سارا سارا دن ملاقات کے بہانے تراشنا' شفق رنگ شاموں میں چھت پر گھومنا' سنسان دوپہروں میں کھڑکیوں سے لگ کر آہیں بھرنا' یہی ہر روز کا معمول تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں اس میں ایک خاص طرح کا نکھار آگیا ہے۔ ایک چمکیلی توانائی ہے جو میرے لکھے ہوئے لفظوں میں سرایت کرگئی ہے۔ میری غزلیں اور نظمیں اچھے ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگی تھیں۔ میں اب ادبی نشستوں میں بھی جاتا تھا۔

جوبلی ریسٹورنٹ میں عالیہ کے ساتھ میری تین چار ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔ گندمی رنگ کی وہ لڑکی دیکھنے میں بہت حسین و جمیل نہیں تھی لیکن اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر کچھ ایسا دل نشین تھا کہ میں دیوانہ سا ہوگیا تھا۔ دست قدرت نے اس کی تخلیق میں کوئی ایسا تناسب' کوئی ایسی محبوبیت چھپائی تھی کہ غور سے دیکھنے والی آنکھ متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ اگر اسے خود ستائشی نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ میں خوب صورت تھا۔ میری زندگی میں جو ایک دو لڑکیاں آئی تھیں وہ بھی حسین تھیں لیکن میرے خیال میں وہ لڑکیاں عالیہ کی گرد کو بھی نہیں چھوتی تھیں۔

بند کیبن کی ملگجی روشنی میں ہم ایک دوسرے میں کھوجاتے۔ وہ ایک دوسرے کو جاننے کا عمل تھا' اور یہ عمل نگاہ' تکلم اور لمس کی مدد سے آگے بڑھتا تھا۔ عالیہ کے قرب کی مہک مجھے مدہوش کردیتی۔ میں بہکنے لگتا۔ وہ مجھے سنبھالتی رہتی اور ساتھ خود بھی تھوڑا تھوڑا بہکتی رہتی۔

"اب چلیں۔" وہ میرے کان میں سرگوشی کرتی۔

"اتنی جلدی جانا تھا تو آئی کیوں تھیں؟"

"بس آنا پڑا۔"

"کیوں آنا پڑا؟" میں بھی سرگوشی میں پوچھتا۔

"آپ جانتے ہیں۔"

"تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"

"اس لئے کہ آپ سے...... محبت کرتی ہوں۔"

"کیا کہا؟"

"اس لئے کہ آپ سے محبت کرتی ہوں۔"

"سنائی نہیں دیا۔"

"آپ سے محبت کرتی ہوں۔" وہ میرے کان سے منہ لگاکر تیز سرگوشی کرتی اور اپنا چہرہ میرے سینے میں دھنسا دیتی۔

کسی وقت ہم تنہائی میں کھو جاتے۔ بس بیٹھے یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ یہ ایسی پیاس تھی جو بجھ کر بھی نہیں بجھتی تھی۔ ایک روز میں نے اپنی اور عالیہ کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

وہ سرخ ہو گئی اور انکار میں سرہلانے لگی۔ اس انکار میں بھی لاکھوں اقرار پوشیدہ تھے۔

میں نے کہا "اچھا اگر ہماری شادی ہو گئی تو کیا کرو گی؟"

وہ بولی "آپ کے کپڑے استری کروں گی' آپ کے بوٹ پالش کروں گی' جب صبح آپ کام پر جائیں گے تو آپ کی گاڑی صاف کروں گی۔"

"اور کیا کرو گی؟"

"آپ کے لئے کھانا بناؤں گی' آٹا گوندھوں گی' مسالا پیسوں گی' لہسن اور پیاز کاٹوں گی اور ناک سے سوں سوں کیا کروں گی۔"

"اور کیا کرو گی؟"

وہ مسکرائی "بابا! سب کچھ کروں گی۔ جو کہیں گے کروں گی۔"

"وعدہ؟

"ہاں...... ہاں۔"

"تھم پرامس"

"بڑے خراب ہیں آپ" اس نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

میں نے کہا "اچھا ایک بات بتاؤ۔ اگر ہماری شادی نہ ہو سکی تو پھر؟"

وہ بولی "پھر آپ بتائیں آپ کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "وہی جو سب کرتے ہیں۔ ٹھنڈی آہیں بھرا کروں گا۔ ٹیپ ریکارڈر پر غمگین گانے سنا کروں گا۔ دردناک کہانیاں پڑھ کر اور فلمیں دیکھ کر آنسو پونچھا کروں گا......"

"اور شادی کا انتظار کروں گا۔" عالیہ نے لقمہ دیا اور ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

سب کچھ تھا لیکن دل میں ایک خلش ابھی باقی تھی۔ یہ شکوہ دل کی گہرائیوں میں پنہاں تھا کہ میرے اتنے اصرار اور التجاؤں کے باوجود عالیہ نے مجھے خط نہ لکھا۔ کیوں اس نے مجھ پر اعتبار نہ کیا۔ یہ ایک ہلکا سا شکوہ تھا۔ خط کی جگہ اب وہ خود میرے پاس تھی مگر نجانے کیوں میں دل میں چبھی ہوئی اس پھانس کو نکال نہیں پارہا تھا۔ ایک دوبار دبے دبے الفاظ میں شکایت میری زبان پر بھی آچکی تھی مگر عالیہ نے اسے اہمیت نہیں دی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ جانتے بوجھتے ایسا کر رہی ہے۔ اس احساس نے مجھے ٹھیس پہنچائی۔ میرا دل چاہا کہ عالیہ سے کھل کر بات کروں۔ لیکن پھر یہ بات مجھے اتنی بے وزن اور بے محل لگی کہ میں کر ہی نہیں سکا۔ نامہ و پیام کو تو وصال یار تک پہنچنے کا زینہ سمجھا جاتا ہے' میں ایک ہی جست میں وصال یار تک پہنچ گیا تھا۔ اب زینے کی تمنا کیوں کر رہا تھا۔

بہرحال یہ ہوا کہ میرے دل کی خلش میرے رویے میں ظاہر ہونے لگی۔ عالیہ کے قرب میں بھی میں کھویا کھویا رہنے لگا۔ اس کی دید کی تڑپ تو اب بھی مجھے بے حال رکھتی تھی مگر ملاقات کی گرم جوشی میں کوئی ایک عنصر جیسے غائب رہنے لگا تھا۔ جیسے ایک نہایت خوبصورت فقرے میں ایک لفظ قلم بند ہونے سے رہ گیا ہو۔

ایسا فقرہ مکمل ہو تو بھی کسی ایک لفظ کی غیر موجودگی اپنی کمی کا احساس دلادیتی ہے اور بعض اوقات تو پڑھنے والے کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جاتا ہے کہ چھوٹ جانے والا لفظ کیا تھا۔ شاید اسی طرح عالیہ کو بھی چھوٹ جانے والے لفظ کا احساس ہو گیا تھا۔

وہ جولائی کی ایک گرم دوپہر تھی۔ لارنس گارڈن تنہا تنہا تھا۔ ایسی تنہائی پیار کرنے

والوں کو بہت راس آتی ہے۔ مجھے اور عالیہ کو بھی بہت راس آ رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ جامن کے ایک چھوٹے درخت کی چھاؤں میں بیٹھی تھی۔ گرمی کے سبب اس کے گال تمتما رہے تھے۔ میں بے خیالی میں گھاس کے تنکے توڑ رہا تھا۔ وہ بڑی محویت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"میری طرف دیکھیں۔" اس نے بڑی ملائمت سے کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا بات ہے؟" وہ ٹٹولنے والے انداز میں بولی۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے "نہیں" اب آپ کا تکیہ کلام بن گیا ہے۔"

"بالکل نہیں۔"

"پھر وہی نہیں" وہ شرارت سے مسکرائی۔

اس نے اپنا کندھا میرے کندھے سے مس کیا۔ وہی بجلی میرے وجود میں دوڑ گئی جو عالیہ کے لمس کی پہچان تھی۔ وہ آہستگی سے بولی "اتنی بچی نہیں ہوں میں...... بڑے دنوں سے آپ کو یونہی دیکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے مجھے آپ کی تکلیف معلوم ہو گئی ہے۔ بڑے زبردست قسم کے ضدی ہیں آپ۔"

"تک...... کیا مطلب؟"

"آپ کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے۔"

"کہاں؟"

"خط پر۔" اس نے بلاتوقف کہا۔

میرے تن بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ آخر عالیہ کی انگلیاں میرے دل کی گرہ تک پہنچ گئی تھیں۔ میں نے کہا "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"جی نہیں۔" اس نے میرے سر کے بال کھینچے "میں آپ کی رگ رگ سے واقف ہو گئی ہوں...... چلئے اب چلتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"گھر۔ مجھے ایک بہت ضروری کام ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ میں آپ کو بتا ہی

دوں۔" پھر وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "مجھے...... آپ...... کو...... خط...... لکھنا ہے۔"

"واقعی؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"دیکھا...... دیکھا کتنے خوش ہوئے ہیں۔" اس نے اٹھتے اٹھتے زور سے میرے کندھے پر چٹکی بھری۔

میں ابھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں پہلو بہ پہلو چل پڑے۔ لارنس گارڈن کی شفاف سڑک کے دونوں اطراف پھولوں سے مہک رہے تھے۔ نجانے کیوں ایک دم ہی مجھے عالیہ پر بے پناہ پیار آنے لگا تھا۔ ہاں...... مجھے کوئی ایسی ہی لڑکی درکار تھی' جو میرے دل کی گرہوں کو سمجھے اور اپنی عقدہ کشا انگلیوں سے انہیں کھولنے کا ہنر جانتی ہو۔ میرا جی چاہا کہ یہیں کھڑے کھڑے عالیہ کو اپنی بانہوں میں بھر لوں۔ بے خودی میں خود بھی بے حال ہو جاؤں اور اسے بھی بے حال کر دوں۔

☆------------☆------------☆

ہم اپنے اپنے گھر پہنچ گئے اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ شام تک عالیہ کے خط کے سلسلے میں میرا سارا جوش و خروش یکسر ٹھنڈا پڑ گیا۔ نہ خط کا انتظار کرنے میں کوئی "چارم" رہا اور نہ یہ تصور کرنے میں کہ عالیہ اپنے گھر کے کسی محفوظ گوشے میں بیٹھ کر میرے لئے خوب صورت الفاظ جوڑ رہی ہو گی۔ یوں لگا جیسے میں اب تک ایک بے معنی خواہش کے پیچھے بھاگتا رہا ہوں۔ بھلا خط میں اور اس کے خوب صورت الفاظ میں کیا رکھا تھا۔ اصلی چیز تو عالیہ تھی اور وہ اپنی تمام تر نوازشوں سمیت مجھ سے ملتی رہتی تھی۔

یقیناً یہ خط کے سلسلے میں میری سرد مہری ہی کا نتیجہ تھا کہ تیسرے روز مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ عالیہ نے مجھے خط پوسٹ کر دیا ہو گا اور وہ میرے ایڈریس پر پہنچنے والا ہو گا۔ میرا پروگرام تھا کہ ڈاک آنے کے "ٹائم" میں خود گھر میں موجود رہوں گا تاکہ خط کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اتفاقاً ابھی تک گھر کے پتے پر میرا کوئی خط نہیں آیا تھا لہٰذا مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گھر والے میرے خط کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ خاص طور سے مجھے اباجان کی طرف سے اندیشہ تھا۔ وہ گھر کے پتے پر آنے والا ہر خط بلا تردد کھول کر پڑھ لیتے تھے۔

مگر میری بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ اس روز میں یہ ساری باتیں بھول گیا اور حسب معمول دوپہر کے وقت دکان پر چلا گیا۔ ابا جان گھر آگئے۔ شاید وہ دن ہی برا تھا۔ سب کچھ میرے خلاف گیا۔ نہ صرف یہ کہ عالیہ کا خط آیا بلکہ میری منی بہن عاشی نے وہ لفافہ کھول لیا اور خط کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو صبح سویرے اخبار کے ساتھ ہوتا ہے۔ اہل خانہ میں سے ہر کوئی اخبار پر جھپٹتا ہے اور پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سرخیاں تو سارے ہی دیکھ لیتے ہیں مگر اطمینان سے اخبار پڑھنے کا موقع گھر کے سربراہ کو ملتا ہے۔ میرا خط بھی والد صاحب اپنے کمرے میں لے گئے اور اطمینان سے اس کے سیاق وسباق کا مطالعہ کیا۔

جو نتیجہ نکلا وہ میری توقع سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ شام کو والد صاحب نے میری خوب کھچائی کی۔ کونین سا کڑوا ایک طویل لیکچر تھا جو مجھے پینا پڑا۔ بس والد صاحب کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا ورنہ انہوں نے اور کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگلے روز انہوں نے عالیہ کے چچا ابرار صاحب سے بات کی۔ یہ دونوں حضرات پڑوسی ہونے کے علاوہ دوست بھی تھے۔ والد صاحب نے عالیہ کا خط عالیہ کے چچا کے سامنے رکھ دیا اور ان سے کہا کہ لڑکی ہاتھوں سے نکلی جارہی ہے۔ وہ اس پر قابو پائیں یا جلد از جلد اس کا کوئی انتظام کریں۔

ابرار صاحب' والد صاحب سے بھی کئی ہاتھ آگے نکلے۔ مذہبی ذہن کے آدمی تھے اور طبیعت بھی کافی سخت تھی۔ انہوں نے عالیہ کی والدہ کے سامنے عالیہ کی دیدہ دلیری اور آزادخیالی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ بے چاری عورت سرتاپا لرز گئی اور کئی ہفتے لرزتی رہی۔ عالیہ کا گھر سے نکلنا بند ہوگیا۔ وہ اپنے چچا محترم کے ساتھ رکشے پر کالج جاتی اور واپس آتی۔ سامنے والی بالکونی پر پردے آویزاں کردیئے گئے۔ کھڑکیاں بند رہنے لگیں' اور عالیہ کے گھر کا آنگن....... سرشام تیرگی میں ڈوبنے لگا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ عالیہ کے چچا اور میرے والد صاحب میں کوئی جھڑپ ہوئی ہے اور اس کے بعد دونوں حضرات میں بول چال بند ہوگئی ہے۔

جدائی کا موسم ہم دونوں پر مسلط ہوگیا تھا۔ اس موسم کے بے رحم ہاتھ ایک طرف میرا کلیجا مسل رہے تھے' دوسری طرف عالیہ کا خون نچوڑ رہے تھے۔ قصور میرا ہی تھا۔ نہ میں یوں بے احتیاطی کرتا اور نہ عین بہار میں ہمارے ہرے بھرے پیار کو خزاں کی

نظر کھاتی لیکن دانا یہ بھی تو کہتے ہیں کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طور ہو کر رہتا ہے۔ خط بہانہ بن گیا تھا۔ یہ بہانہ نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا۔

دھیرے دھیرے روز وشب پر ایک جمود سا طاری ہوگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہجر میں کوئی کشش ہے اور نہ وصل کی تمنا میں۔ ان دنوں لکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ میں کاغذ قلم سامنے رکھ کر بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھار ایک آدھ غزل ہوجاتی ورنہ قلم اور کاغذ ایک دوسرے سے روٹھے رہتے۔ اپنی یہ کیفیت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ شعرو ادب میں میرا مقام بننا شروع ہوگیا تھا۔ ابتدائی غزلوں کا ایک مجموعہ بھی منظرعام پر آچکا تھا۔ ایک دوبڑے مشاعروں میں شرکت بھی کی تھی لیکن اب جو قلم کو چپ لگی تھی تو ٹوٹنے میں ہی نہیں آرہی تھی۔

میں گریجویشن کرچکا تھا۔ نجانے میرے دل میں کیا آئی تھی کہ والد صاحب کے منع کرنے کے باوجود میں نے انگلش میں ایم اے کرنے کی ٹھان لی تھی۔ انگلش پڑھنی شروع کی تو اس زبان میں شعر کہنے کا شوق بھی چرایا لیکن ان دنوں چونکہ طبیعت میں روانی نہیں تھی لہٰذا کوئی قابل ذکر چیز نہیں لکھ سکا....... روزو شب کا یہ جمود اور قلم کا سکتہ آناً فاناً ہی ٹوٹا تھا۔ پہلے "روز وشب" کا جمود ٹوٹا اور اس کے چند ہی دن بعد قلم کا سکتہ بھی ختم ہوگیا۔ روز وشب کا جمود توڑنے والی یہ خبر تھی کہ عالیہ کی شادی ہورہی ہے۔ یہ خبر بجلی کے ایک طاقتور شاک کی طرح تھی۔ اس شاک نے مجھے سرتاپا جھنجوڑ دیا۔

یہ خبر سنانے والی میری بہن شاہین تھی۔ شاہین مجھ سے صرف ایک سال چھوٹی تھی۔ ہم دونوں میں کافی بے تکلفی تھی۔ وہ مجھے میرا نام لے کر پکارتی تھی۔ دیگر اہل خانہ کی طرح شاہین بھی میرے اور عالیہ کے بارے میں سبھی کچھ جانتی تھی۔ میں اسٹڈی روم میں بیٹھا بے دلی سے ایک انگلش ناول پڑھ رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں آئی اور افسردہ سی میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے پنکی؟" میں نے اسے نک نیم سے مخاطب کیا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھری "ایک بری اطلاع ہے تمہارے لئے۔ عالیہ کی شادی ہورہی ہے۔"

میرا ہاتھ جیسے ننگے برقی تار سے چھو گیا تھا۔ میں کئی لمحے تک کچھ سمجھ نہ سکا۔ بس

میری آنکھیں شاہین کے ہلتے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی باتیں میری سمجھ میں آنے لگیں۔ وہ کہہ رہی تھی "........ یہ لوگ لڑکیوں کی شادی جلدی کردیتے ہیں۔ اب انیس بیس سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے شادی کی۔ لڑکا کچھ نہیں تو تیس سال سے کم کیا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ دس گیارہ سال کا فرق ہے دونوں کی عمروں میں اتنا فرق ہونا نہیں چاہئے۔"

"کک........ کون ہے لڑکا؟" میں نے پوچھا۔

"غیر ہی ہیں۔ عالیہ کی والدہ کہہ رہی تھیں' انجینئر ہے' بلڈنگیں بناتا ہے۔ میرا خیال ہے ایسے ہی کہہ رہی تھیں۔ بس کوئی ٹھیکے دار قسم کی چیز ہے۔ ایک دفعہ دیکھا تھا میں نے........ مجھے تو شکل سے نہیں لگتا تھا انجینئر وغیرہ۔"

"کب ہو رہی ہے شادی؟"

"فی الحال تو منگنی ہو رہی ہے۔ یہ بات میری ایک سہیلی نے بتائی ہے جو اسے بھی جانتی ہے۔"

میں خاموش ہوگیا اور لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے پہلے سے خبر تھی کہ یہ سب کچھ ہونا ہے پھر بھی نجانے کیوں یقین نہیں آرہا تھا۔ شاہین یک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ آہستگی سے بولی "تمہیں دکھ ہوا ہے نا ندیم؟"

"نہیں۔ کچھ اتنا زیادہ نہیں۔" میں نے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ سجائی۔ "بس سارا معاملہ اس خط کی وجہ سے خراب ہوا" وہ تاسف سے بولی۔

"اتنا بڑا معاملہ کسی ایک وجہ سے خراب نہیں ہوتا۔ اس کی بہت سی وجوہ ہوتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"مثلاً........ تمہارے نزدیک اور بڑی وجہ کیا ہے؟"

"عالیہ کا رویہ بھی تو ایک وجہ ہے........ اس نے معاملے کو سلجھانے کے لئے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی۔ پچھلے ڈیڑھ دو برس میں کیا کیا ہے اس معاملے میں عالیہ نے؟ اور اب بھی سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ اگر منگنی ہو رہی ہے تو عالیہ کی مرضی سے ہی ہو رہی ہے۔ وہ انکار کرسکتی ہے۔ احتجاج کرسکتی ہے۔ بالغ ہے وہ........"

شاہین کھوئے کھوئے لہجے میں بولی "ندیم! تم نہیں جانتے۔ لڑکیاں اس حوالے سے کتنی لاچار ہوتی ہیں۔ بے پناہ دباؤ ہوتے ہیں لڑکیوں کے اوپر...... اور پاؤں کے نیچے ٹھوس زمین نہیں' دلدل ہوتی ہے۔"

میں نے چونک کر شاہین کی طرف دیکھا لیکن وہ عمومی لہجے میں بات کر رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتی۔ اگر اس کے اپنے ساتھ کوئی ایسا مسئلہ ہوتا تو وہ سب سے پہلے مجھے بتاتی۔ وہ بھی میرے دیکھنے کا انداز سمجھ گئی اور بولی "میں ایک جنرل بات کر رہی ہوں ندیم۔ کاش اس جنرل بات کا عالیہ سے بھی کوئی تعلق نہ ہوتا۔"

اسی دوران امی میرا کھانا اٹھائے ہوئے اسٹڈی میں آگئیں اور ہم بہن بھائی کو خاموش ہونا پڑا۔

...... میرے اندر بے حسی کی چادر تان کر سویا ہوا غم ایک انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا تھا۔ وہ میرے خون میں شامل ہونے لگا' میری رگوں میں آگ جگانے لگا تھا اور میرا دل و دماغ اس کی حدت سے بھڑک اٹھا تھا اور جب کوئی چیز بھڑکتی ہے تو روشنی تو ہوتی ہی ہے۔ یہ روشنی روشنائی بن کر میرے قلم میں اتر آئی۔ میں نے اپنے اندر کے بے پایاں ہیجان کو قلم کے سہارے صفحہ قرطاس پر بکھیرنا شروع کردیا۔ یہ ہیجان قرطاس پر آیا تو خوب صورتی بن گیا۔ اندر کی ٹوٹ پھوٹ الفاظ کے روپ میں ڈھلی تو ترتیب بن گئی' نظم بن گئی اور غزل بن گئی۔ اردو کے علاوہ میں نے انگلش میں بھی لکھا۔ انگلش میں لکھتے ہوئے میرے خیالات نے اور میرے قلم نے زیادہ آزادی سے حرکت کی۔ میں نے اپنے روحانی کرب اور جسمانی انتشار کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا۔ اس تخلیقی عمل کے دوران میں اپنے گرد و پیش سے قطعی بیگانہ ہوجاتا تھا۔ نہ سونے جاگنے میں ترتیب رہی' نہ کھانے پینے کا ہوش رہا' بس میں تھا اور میرے غم خوار میرے الفاظ تھے۔

بس کبھی کسی کھڑکی' کسی جھروکے سے عالیہ کے گھر کی جھلک نظر آجاتی تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے میری طرح میرے گھر کے جھروکے' کھڑکیاں اور در و دیوار بھی اداس ہیں۔ وہ رات کی تاریکی میں آنسو بہاتے ہیں اور اس جدائی کے متعلق سرگوشیاں کرتے ہیں' جو پل پل میری طرف بڑھ رہی ہے۔ شاید وہ بے زبان خاموشی ان در دیوار سے بھی ہم کلام ہوتے ہوں' جن کا تعلق عالیہ سے تھا۔ یہ در و دیوار عالیہ کے در و دیوار سے پوچھتے ہوں "سناؤ۔ تمہارا کیا حال ہے۔ کیا تم بھی اس "جلاد لمحے" کی چاپ سن رہے ہو جو "دوشیزہ

محبت" کو قتل کرنے کے لئے پل پل قتل گاہ کی طرف آرہا ہے۔ کیا تمہارے کانوں میں بھی ایک بے رحم شہنائی گونجتی ہے؟ کیا ہماری طرح تم بھی دل فگار ہو؟"

انہی دنوں عالیہ کی منگنی بھی ہوگئی۔ اس منگنی کی خبر بھی شاہین ہی کے ذریعے مجھ تک پہنچی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ شادی اسی موسم سرما میں ہوگی۔

پھر ایک دن میں نے بالائی کمرے کی کھڑکیوں میں عالیہ کی جھلک دیکھی۔ وہ کسی تصویر کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کا سیاہ دھاریوں والا زرد آنچل شاید اس خزاں کی علامت تھا جو ہماری زندگیوں کو سوگوار کرچکی تھی۔ ہمارے درمیان وہی مختصر فاصلہ تھا لیکن اب یہ فاصلہ پھیلتا جارہا تھا اس میں اور بہت سے فاصلے شامل ہوتے جارہے تھے۔

میں کچھ دیر تو عالیہ کو دیکھتا رہا' پھر گھبرا کر کھڑکی بند کردی اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ یہ عجیب سانسیں تھیں جن کے ساتھ گھٹن بھی سینے میں اتر جاتی تھی۔ میں نے گریبان کے بٹن کھول دیئے اور اپنے سینے کو مسلنے لگا۔ کروٹ پر کروٹ بدلنے لگا۔ نجانے کب تک اسی طرح تڑپتا رہا پھر نڈھال ہوکر سوگیا۔

دوبارہ میری آنکھ ہلکے سے کھٹکے سے کھلی تھی۔ کوئی میرے کمرے کے بند دروازے کے دوسری طرف موجود تھا۔ ایک نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازے تک پہنچا۔ کی ہول سے کان لگایا۔ عالیہ کی سہیلی صوفی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ سرگوشی میں بول رہی تھی "چلی جاؤنا......... مجھے لگتا ہے' دروازہ کھلا ہے۔"

"نہیں' میں نہیں جاؤں گی اکیلی۔" عالیہ کی گھبرائی ہوئی سرگوشی ابھری۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ نہ جاؤ۔" صوفی نے جھلا کر کہا۔

اس کے فوراً بعد دروازے میں حرکت پیدا ہوئی۔ دروازہ کھلا نہیں تھا۔ اندر سے چٹخنی لگی تھی۔ میں نے اپنا لرزاں ہاتھ بڑھا کر چٹخنی گرائی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ سامنے عالیہ کھڑی تھی۔ وہ اندر آئی تو میں نے دروازہ بند کرلیا۔ وال کلاک رات کے سوا نو کا وقت بتا رہا تھا۔ میں نے لرزتی کانپتی عالیہ کو دیکھا اور پتہ نہیں مجھے کیا ہوا کہ میں نے

اپنی دونوں بانہیں کھول دیں۔ وہ سسک کر میرے سینے سے آلگی۔

کچھ دیر ہم دونوں آنسو بہاتے رہے۔ ان لمحوں میں گردش دوراں تھم گئی تھی۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ عالیہ مجھ سے لپٹی ہوئی ہے اور اس کا سینہ غم کی یورش سے متلاطم ہے۔

"کیا یہ آخری ملاقات ہے؟" میں نے کرب ناک لہجے میں پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ بس میرے ساتھ کچھ اور چمٹ گئی۔ میں اسے صوفے تک لے آیا۔ وہ سر اٹھا رہی تھی نہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بس روئے چلی جارہی تھی۔ وہ نامعلوم کشش جو اس کی شخصیت کا احاطہ کئے رہتی تھی' بہت نمایاں نظر آرہی تھی۔ پھر وہ بولی تو اس کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی "ندیم! آپ نے میری چھوٹی سی غلطی کی کتنی بڑی سزا دی مجھے۔ اگر آپ نے وہ خط سنبھال لیا ہوتا تو شاید ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ہمارے بڑوں میں وہ غلط فہمیاں پیدا نہ ہوتیں جنہوں نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کردیا ہے۔"

اب عالیہ کے ساتھ ساتھ میری نظر بھی جھک گئی "مجھے خود معلوم نہیں عالی! مجھ سے یہ بھول کیسے ہوگئی۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں۔"

"آپ گناہ گار نہیں۔" وہ سسکی "گناہ گار تو میں ہوں جو آپ کو چھوڑ کر جارہی ہوں۔ آپ کی گلی اور آپ کے شہر سے دور۔ اگلے مہینے میری شادی ہورہی ہے۔" وہ روئے چلی جارہی تھی۔ کتنی ہی دیر ہم دونوں بالکل گم صم رہے۔ کھڑکیوں سے باہر گہری تاریکی تھی اور ایسی ہی تاریکی ہمارے سینوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں آنا چاہتی تھی لیکن خود کو روک نہ سکی۔ آپ کو ایک بار قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔" وہ صاف گوئی سے کام لے رہی تھی۔

"کسی کو خبر ہوگئی تو؟"

"ہوجانے دیں۔" اس کی آواز مایوسی آمیز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

یکایک اسے نجانے کیا ہوا۔ اس نے اپنی چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی اور عجیب ہیجانی انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ ان لمحوں میں وہ سراپا جسم محسوس ہورہی

تھی۔ جذبوں اور ارمانوں کی آگ میں جلتا پھنکتا ہوا جسم۔ ایک ایسا جسم جو چند ہی لمحوں میں سرتاپا ایک دعوت بن گیا تھا۔ میں بھونچکارہ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ ہوش و حواس مختل ہورہے ہیں' لیکن وہ کتنے بھی مختل ہوجاتے' اس حد تک میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے تھے کہ میں عالیہ کے پرتپش سراپا کو' اس کی بکھرتی سانسوں کو محسوس نہ کرتا۔ میں عالیہ کو محسوس کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ بے شک میں جان و دل سے اسے چاہتا تھا لیکن اگر میں یہ کہوں کہ یہ چاہت جسم کی چاہت سے علیحدہ تھی تو یہ سراسر غلط بیانی ہوگی۔ وہ اپنی روح اور اپنے جسم سمیت میرے دل کا داغ تھی۔ وہ ہونٹ' وہ عارض' وہ گیسو' وہ سب کچھ مجھے درکار تھا اور جو کچھ مجھے درکار تھا وہ مجھے مل رہا تھا۔ میں کوئی تارک الدنیا درویش یا زاہد نہیں تھا۔ ایک عام انسان تھا۔ ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا ہے۔ خون کی یورش ہتھوڑے کے مانند میرے سر میں ضربیں لگانے لگی۔ میرے بازو عالیہ کے گرد حمائل ہوگئے۔ وہ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز میں بولی "ندیم! میں کسی کے پاس جانے سے پہلے تمہارے پاس آگئی ہوں۔ مجھ پر تمہارا......... حق ہے۔ اگر تم چاہو......... تو یہ حق........." اس کی آواز ایک دل دوز ہچکی میں ڈوب گئی۔

ادھورا ہونے کے باوجود یہ فقرہ مکمل تھا۔ اس فقرے کی بازگشت نے میرے دل و دماغ میں زلزلے برپا کردیئے۔ میں جیسے کسی گہری دھند میں لپٹتا چلا جارہا تھا یہ دھند مجھے اوپر اٹھا رہی تھی۔ اوپر بہت اوپر۔ عالیہ میرے بہت قریب تھی۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں بستر پر نیم دراز سوگیا تھا۔ وہ جو کچھ دیکھا ایک سنہری خواب تھا۔ کھڑکی سے باہر ایک اداس شام کا اندھیرا پر پھیلا چکا تھا۔ سوگز دور عالیہ اپنے گھر کی کھڑکی میں اسی طرح تصویر بنی بیٹھی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل حرکت نہیں کر رہی تھی۔ میں کھڑکی کی جالی سے لگ کر دھیان سے دیکھنے لگا۔ مجھے دیکھنے کے بعد عالیہ کے ہیولے میں حرکت پیدا ہوئی' وہ اٹھی تو کمرے میں جلتے بلب کی روشنی براہ راست اس پر پڑنے لگی۔ سیاہ دھاریوں والا "خزاں رنگ" دوپٹا اس کے سر سے ڈھلکا ہوا تھا۔ ہاں وہ عالیہ ہی تھی۔ یہ وہی تھی جو تین گھنٹے سے اس کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ بڑے ستے ستے انداز میں وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔

میں اس خواب کے سحر میں گم رہا جو میں نے دیکھا تھا۔ ہاں ایسی انہونیاں خوابوں میں ہوتی ہیں' یا قصے کہانیوں میں۔ حقیقی زندگی میں تمناؤں کے سوکھے اشجار پر یوں اچانک پھل کہاں آتا ہے۔ کہاں منتظر دروازوں کے پٹ کھلتے ہیں......... کہاں حنائی انگلیاں الجھے ہوئے بالوں میں رینگتی ہیں۔ کہاں کوئی عالیہ کسی دل فگار ندیم کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے ایسی دیوانی جرات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بہت کم ہوتا ہے۔

.... پھر ایک روز میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا' جسے دیکھنے سے میری آنکھیں ایک مدت سے خوف زدہ تھیں اور سہمی ہوئی تھیں۔ عالیہ کے گھر آنگن میں شامیانے لگ رہے تھے۔ اپنی بہن شاہین کی زبانی مجھے پتا چلا کہ آج رات عالیہ کی مہندی ہے۔ اس رات میں نے دنیا کی کریہہ ترین آواز سنی یا شاید میں غلط کہہ رہا ہوں۔ وہ بڑی خوب صورت آواز ہوگی لیکن مجھے کریہہ ترین لگ رہی تھی۔ وہ ڈھولک کی آواز تھی۔ وہ مہندی کے گیتوں کی آواز تھی۔ میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ کیا دنیا میں اس سے بھیانک اور اذیت ناک آواز بھی کوئی ہوسکتی ہے۔

اس رات اپنے ہی پسینے میں ڈوب کر میں نے ایک طویل انگریزی نظم لکھی تھی۔ اس نظم میں ان آوازوں کا ذکر تھا جو رسیلی ہوتی ہیں لیکن بہت کرب ناک ہوتی ہیں۔ ان مناظر کا ذکر تھا جو بیک وقت بے انتہا خوب صورت ہوتے ہیں اور بے حد بدصورت بھی۔ ان قہقہوں کا تذکرہ تھا جو نوحے سے زیادہ الم ناک ہوتے ہیں اور ان لمحوں کی نقاب کشائی تھی جب "بہار" کی ڈولی میں "خزاں" کا جنازہ رکھا جاتا ہے......... وہ ایک یادگار نظم تھی اور مجھے یقین تھا کہ بہت پسند کی جائے گی۔ آنے والے دنوں میں میرا یہ انداز درست ثابت ہوا۔ اس نظم کو بہت پذیرائی ملی۔ درحقیقت یہ نظم ہی تھی جس نے مجھے اندرون ملک انگریزی ادب پڑھنے والوں میں متعارف کرایا۔ میری یہ انگلش نظم ادبی نوعیت کے ایک غیر ملکی پرچے میں "تضاد" کے عنوان سے شائع ہوئی۔

جس روز میں نے یہ منفرد نظم لکھی اس سے اگلے روز عالیہ کی شادی ہوگئی تھی۔ وہ مجھے اور میرے ہم راز ساتھیوں کو اداس چھوڑ کر پیا کے دیس سدھار گئی تھی۔ میرے ہمراز ساتھی وہ گلیاں' وہ کوچے اور در و دیوار تھے جن میں میری اور عالیہ کی محبت کی یادیں

رچی بسی تھیں......... چاندنی راتوں' سنسان دوپہروں اور اداس شاموں میں میں اپنے ان
ہمراز ساتھیوں سے باتیں کرتا تھا۔ وہ میرے دکھ سنتے تھے' میں ان کے آنسو پونچھتا تھا۔
عالیہ کی باتیں کرتے کرتے ہم سب اداس ہوجاتے تھے۔ پھر جب میں بالکل تنہا ہوتا تو
میری یہ اداسی قلم کی وساطت سے صفحہ قرطاس پر بکھرجاتی۔ ان دنوں میں نے بہت اچھی
چیزیں لکھیں۔ یہ کام زیادہ تر انگلش میں تھا۔ انگلینڈ میں مقیم ایک پاکستانی ادب نواز شخص
اس کام کی کوالٹی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ باقاعدہ مجھ سے خط و کتابت کررہا تھا۔ اس کی
خواہش تھی کہ جونہی ایک کتاب کا مواد اکٹھا ہوجائے' میں کتاب شائع کروالوں۔ میرے
اس ادب نواز دوست کا نام اشرف کمال تھا۔ عجیب بات تھی کہ اشرف کمال سے میرے
تعلق کی بنیاد وہی نظم بنی تھی جو میں نے عالیہ کی مہندی کی رات لکھی تھی۔ وہ ایک
انگریزی نظم تھی اور عالیہ کی مہندی اور شادی وغیرہ سے بظاہر اس کا کوئی تعلق نہیں تھا
لیکن اس نظم میں وہ غم شامل تھا جو کوہ ہمالیہ سے گراں تھا......... اس رات میرے ناتواں
قلم اور میرے سامنے رکھے ہوئے کاغذ نے وہ غم جھیلا تھا اور اسے لفظوں میں امر کردیا
تھا۔

اشرت کمال نے لندن میں ایک میوزیکل گروپ بھی تشکیل دے رکھا تھا۔ اس
میوزیکل گروپ نے تھوڑے ہی عرصے میں کافی نام کمایا تھا اور انگلینڈ کے علاوہ امریکا میں
بھی کامیاب "کنسرٹس" کئے تھے۔ اشرف کمال نے اپنے گروپ کا نام "امپیکٹ" رکھا
تھا۔ اس نے مجھے "امپیکٹ" کے کئی ایک وڈیوز بھی بھیجے جو مجھے حیرت انگیز طور پر پسند
آئے۔ میں نے حیرت انگیز اس لئے کہا کہ مجھے پاپ میوزک سے کوئی خاص دلچسپی نہیں
تھی۔ بیشتر لوگوں کی طرح میں بھی اسے جسمانی اچھل کود اور شور شرابے کا نام دیتا تھا لیکن
جب اشرف کمال کے بھیجے ہوئے وڈیوز کو میں نے دھیان سے دیکھا تو انہیں دوبارہ اور سہ
بارہ دیکھنے پر مجبور ہوا۔ میں نے ان وڈیوز کی باریکیوں پر غور کیا تو مجھے ان کے میوزک اور
"تھیم" میں ایک خاص قسم کا "چارم" نظر آنے لگا۔ بالکل جیسے کوئی تجریدی تصویر شروع
میں بالکل بے کار لگے لیکن آہستہ آہستہ اس کے اسرار و رموز دیکھنے والے پر کھلنے لگیں
اور وہ تصویر اپنے منہ سے بولتی محسوس ہو۔ ان وڈیوز کو دیکھنے کے بعد میرا وہ تعصب غیر
معمولی طور پر کم ہوگیا جو میں "پاپ میوزک" کے بارے میں رکھتا تھا۔ اس کے بعد میں

کبھی کبھی پاکستان ٹیلی وژن پر چلنے والے پاپ میوزک کے پروگرام بھی دیکھنے لگا۔ بے
شک مجھے ان پروگرامز میں "امپیکٹ" کے گانوں جیسی خوبیاں نظر نہیں آئیں بہرحال ان
پروگرامز کو دیکھنے سے مجھے پاپ میوزک کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔
انہی دنوں اشرف کمال نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس نے لکھا "ڈیئر ندیم! تمہیں یہ
جان کر خوشی ہوگی کہ ہمارے بینڈ کا گراف...... روز بروز اونچا جارہا ہے۔ ایک البم تیار
ہوچکا ہے۔ عنقریب دوسرے البم پر کام شروع ہونے والا ہے۔ زور شور سے تیاریاں
ہورہی ہیں۔ عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ پاپ گانوں میں شاعری نہیں ہوتی صرف آرکسٹرا
ہوتا ہے اور "پریزنٹیشن" ہوتی ہے' لیکن یہ تاثر ٹھیک نہیں۔ پاپ گانوں میں شاعری کی
اہمیت کو کسی طور نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں یہ بات ہے کہ یہ شاعری ذرا مختلف قسم کی
ہوتی ہے۔ میں تو شاعری پر یقین رکھنے والا بندہ ہوں اور تم نے یہ بات "امپیکٹ" کے
گانوں میں بھی محسوس کی ہوگی۔
میں نہیں سمجھتا کہ اچھی شاعری کو پاپ گانوں میں متعارف نہیں کرایا جاسکتا
یا اکاموڈیٹ نہیں کیا جاسکتا۔ میں چاہوں گا کہ اگر تم تھوڑا سا وقت نکال سکو تو "امپیکٹ
گروپ" کے لئے کچھ لکھو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہاری طبع کے خلاف ہوگا اور شروع
میں تمہیں عجیب بھی لگے گا لیکن یقین کرو تم جلدی ہی انجوائے کرنے لگو گے۔ میں بڑے
خلوص کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے اندر کام کی بے پناہ توانائی ہے۔ تم نے
انگلش کو ذریعہ اظہار بنا کر ایک اچھا قدم اٹھایا ہے اس ذریعہ اظہار کی وجہ سے تمہیں
موقع مل رہا ہے کہ تم اپنے کام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکو۔"

ان دنوں میں اپنا زیادہ تر وقت کمرے میں ہی گزارتا تھا۔ میرے چاروں طرف
کتابیں بکھری رہتی تھیں۔ نہ کھانے پینے کا ہوش' نہ سونے جاگنے کا۔ شاعری ہی میرا
اوڑھنا بچھونا بنی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے بال بڑھالئے تھے۔ چھوٹی ڈاڑھی بھی رکھ لی
تھی۔ لباس کی طرف سے میں پیدائشی بے پروا ہوں۔ کوئی اور شخص ہوتا تو میرے حلیے
میں ٹھیک ٹھاک سادھو نظر آنے لگتا لیکن میں ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ گاڑی پر گھومتا تھا۔
شکل وصورت میں بھی ممتاز تھا لہٰذا میرے ابتر حلیے کو بھی فیشن میں شامل کرلیا جاتا
تھا......... ہاں......... اہل خانہ اور خاص طور سے والد صاحب بہت نالاں تھے۔ ہر نشست

میں وہ مجھے ایک طویل لیکچر دیتے تھے۔ اس لیکچر کے چیدہ چیدہ نکات یہی تھے کہ میں کرا
چھوڑوں، کھلی ہوا میں بیٹھا کروں۔ شاعری پر ہاتھ ہلکا کروں اور اپنے کاروبار کی طرف توجہ
دوں۔ میں جتنے تحمل سے والد بزرگوار کی باتیں سنتا تھا، اتنی ہی مستقل مزاجی سے اپنے
معمولات پر بھی ڈٹا ہوا تھا۔ آخر والد صاحب نے اس مسئلے کا ایک درمیانی حل نکالا۔ حل
یہ تھا کہ میرا ذہن تبدیل کرنے کے لئے میرا ماحول تبدیل کردیا جائے۔ میں جانتا تھا کہ
والد بزرگوار کو اس "حل" تک پہنچانے میں کچھ کردار شاہین نے بھی ادا کیا ہے۔ والد
صاحب شاہین کی بات بہت مانتے تھے۔ شاہین کا خیال تھا کہ عالیہ کی یادیں بھوت بن کر
میرے دل و دماغ سے چمٹی ہوئی ہیں اور میں جب تک یہاں رہوں گا ان تلخ یادوں کے
حصار سے نکل نہیں سکوں گا۔ وہ اکثر خود بھی مجھے سمجھاتی رہتی تھی "ندیم! نکال دو اس کا
خیال دل سے۔ وہ تمہارے جوڑ کی تھی ہی نہیں۔ نہ حیثیت میں نہ شکل و صورت
میں...... میں تمہارے لئے ایسی دلہن لاؤں گی کہ سب کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔"
یہ ایک بہن کے جذبات تھے ورنہ شاہین خود بھی جانتی تھی کہ عالیہ ایک عام لڑکی
ہونے کے باوجود میرے لئے عام نہیں تھی۔ جسے دل دے دیا جاتا ہے وہ کبھی عام نہیں
رہتا۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا اس پروگرام کی جو میرا ماحول تبدیل کرنے کے لئے تیار کیا
گیا تھا۔ مری میں کافی عرصے سے ہم نے ایک پلاٹ لے رکھا تھا۔ کوٹھی بنانے کا ارادہ تھا،
لیکن پہاڑی علاقوں میں تعمیر اتنی دشوار ہوتی ہے کہ یہ ارادہ کئی بار بن کر ٹوٹ تھا......
اب بھی شاید ارادہ نہ بنتا اگر لاہور میں ہمارا ایک پلاٹ غیر متوقع طور پر بہت اچھی قیمت
پر فروخت نہ ہو جاتا۔ بارہ لاکھ کی رقم بیٹھے بٹھائے ہمارے ہاتھ آگئی تھی۔ والد صاحب نے
بہتر سمجھا کہ مری میں اپنی ذاتی رہائش کا دیرینہ خواب پورا کرلیا جائے۔

تعمیر کا کام والد صاحب نے اپنے ایک قابل اعتماد ٹھیکے دار کو سونپ دیا تھا۔ بہرحال
کسی "اپنے" آدمی کا موقع پر رہنا بھی ضروری تھا تاکہ اخراجات کا حساب کتاب رکھا
جاسکے اور تعمیر کے سلسلے میں موقع پر ہی چھوٹے موٹے فیصلے کئے جاسکیں...... ہمارا پلاٹ
جھیکا گلی کی طرف ایک خوبصورت لوکیشن میں واقع تھا۔ اردگرد کافی کوٹھیاں بن چکی
تھیں۔ ہمارے پلاٹ سے ملحقہ ایک پلاٹ بھی بن چکا تھا۔ یہ لوگ بھی لاہور کے رہائشی

تھے اور والد صاحب نے ان کے ساتھ جان پہچان پیدا کرلی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب
اپریل کے خوش گوار موسم میں میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر مری پہنچا تو مجھے رہائش وغیرہ
کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پڑوسیوں کا مکان خالی تھا۔ والد صاحب نے
ان سے مکان کی چابیاں حاصل کرلیں تھیں۔ اب دو ڈھائی ماہ تک یہ مکان بلا شرکت
غیرے میرے تصرف میں تھا۔ میں نے دو تین کمرے کھلوا کر اچھی طرح ان کی صفائی
کروائی اور ڈیرا جمالیا۔

عام حالات میں میں شاید مری آنے کے حوالے سے والد صاحب کی بات ٹال جاتا
لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ میرے اندر زبردست ٹوٹ پھوٹ جاری تھی اور اس ٹوٹ
پھوٹ کے نتیجے میں میری شاعری کو توانائی مل رہی تھی۔ تخلیق کا موسم میرے دل و دماغ
پر چھایا ہوا تھا۔ ایسے موسم میں ملکہ کوہسار کے دل گداز نشیب و فراز اور پرسکون نظارے
میرے لئے بہت معاون ثابت ہوسکتے تھے۔

میرے پہنچنے کے دو دن بعد ہی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ کام کی نگرانی کس کافر کو
کرنا تھی۔ سارا دن میں مری کے حسین مضافات میں گھومتا۔ سورج مغربی چوٹیوں پر جھکتا
تو میں گھر واپس پہنچ جاتا۔ شب کا سکوت میرے تخیل کو پر لگا دیتا۔ میں حسن و عشق کی
گہرائیوں میں ڈوب جاتا اور تن تنہا شعر و سخن کی محفل سجالیتا۔ انگلینڈ سے اشرف کمال
کے اصرار پر میں نے چند نگارشات اسے بھی بھیجی تھیں۔ یہ تجربہ شروع میں تو حوصلہ افزا
ثابت نہیں ہوا۔ درحقیقت "امپیکٹ گروپ" جو میوزک پروڈیوس کر رہا تھا وہ خالص
یورپی طرز کا تھا اور جدید ترین رجحانات کا حامل تھا۔ اس کی پوئٹری بھی بالکل مختلف تھی۔
یہ ایک خاص میلان رکھنے والوں کے لئے خاص شاعری تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میری
شاعری اس "سیٹ اپ" میں پوری طرح اپنی جگہ نہیں بنا رہی تھی لیکن پھر دوسرے
تیسرے مہینے میری ایک نظم کو امپیکٹ گروپ کے گانے کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ اس نظم
کو "امپیکٹ" کی وساطت سے...... غیر متوقع کامیابی حاصل ہوئی اور وہ گانا سپرہٹ رہا۔

اشرف کمال نے مجھے نہایت معقول رقم کا چیک ارسال کیا اور ساتھ ساتھ اصرار
کیا کہ میں مزید چیزیں بھیجوں

میں اپنے طور پر کوشش کرنے لگا۔ کچھ چیزیں لکھیں بھی...... لیکن اشرف کمال

کو نہیں بھیجیں۔ نجانے کیوں میں ان کے معیار سے مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا کوئی کمی سی محسوس ہو رہی تھی مجھے اپنی تخلیقات میں۔ وہ جذبہ اور وہ جوش میرے الفاظ میں موجود نہیں تھا جو مجھے درکار تھا اور جو چند ہفتے پہلے تک میرے قلم سے شعاعوں کی طرح خارج ہوتا تھا۔

انہی دنوں ایک روز اچانک میری ملاقات عالیہ سے ہو گئی۔ میری زندگی میں آنے والی بے شمار تبدیلیوں کی طرح یہ تبدیلی بھی آناً فاناً ہی رونما ہوئی تھی...... دراصل ہمیں مکان کی تعمیر میں توقع سے زیادہ دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ تین مہینے ہونے کو آئے تھے لیکن ابھی تک مکان کی بنیادیں بھی ٹھیک سے نہیں بھری جا سکیں تھیں۔ مکان کے سامنے والی ڈھلوان کو "لیول" کرنا بہت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ نیچے ایک چٹان تھی جو کسی طور ٹوٹنے میں نہیں آ رہی تھی۔ ہم لاہور سے اپنے مزدور اور کاریگر لے کر گئے تھے۔ ان لوگوں کے لئے یہ کام اور بھی دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ ہمارے ٹھیکے دار سلیم صاحب نے تنگ آ کر فیصلہ کیا کہ پلاٹ کا سامنے والا حصہ ہموار کرنے کے لئے مقامی مزدوروں سے کام لیا جائے۔ مقامی مزدوروں کا ایک گروپ ایسی "پتھریلی رکاوٹیں" دور کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ لیکن یہ لوگ ٹھیکے دار سلیم سے کچھ ناراض ہو چکے تھے۔ ٹھیکے دار سلیم کو خدشہ تھا کہ یہ لوگ بلانے پر بھی نہیں آئیں گے۔ سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ راجا اکرام سے ملا جائے...... راجا اکرام کا نام اس اسکیم میں بلکہ پورے مری میں جانا پہچانا تھا۔ وہ ایک عرصے سے اس کالونی میں کوٹھیاں بنا رہا تھا۔ ٹھیکے پر کام کرنے کے علاوہ اس نے خود بھی کوٹھیاں بنا کر فروخت کی تھیں...... مری آنے کے بعد راجا اکرام کا نام اتنی بار سنا تھا کہ اس کے بارے میں تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ اتفاقاً میں نے راجا اکرام کو ابھی تک دیکھا نہیں تھا جب ٹھیکیدار اسلم نے ذکر کیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس سے ملاقات کروں تو میں نے فوراً ہامی بھر لی۔ اپنے کام میں اتھارٹی سمجھے جانے والے لوگوں سے ملنا مجھے ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے۔

راجا اکرام کی رہائش ہمارے پلاٹ سے کوئی تین فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ سڑک کے کنارے ڈھلوان کی طرف کچھ فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ انہی کے ساتھ راجا اکرام کی کوٹھی تھی۔ بڑی پرسکون اور نگاہ نواز جگہ تھی۔ دائیں جانب لوئر مری کی آبادی نظر آتی

تھی۔ پچھلی طرف کشمیر پوائنٹ کے پہاڑ تھے اور سامنے وسیع و عریض وادی جس میں راول ڈیم کے چمکیلے پانیوں تک دیکھا جا سکتا تھا۔ میں کال بیل کا بٹن دبانے ہی والا تھا کہ دروازہ کھلا اور سامنے ایک درمیانے قد کا شخص نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ وہی راجا اکرام ہے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور تھوڑا سا وقت مانگا۔ راجا اکرام خوش دلی سے مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ یہاں سرخ قالین بچھا تھا۔ ایک جانب شیشے کی دیوار تھی۔ اس دیوار کے دوسری طرف...... سرسبز وادی نظر آ رہی تھی۔

"کہاں ہیں آپ؟" ایک نسوانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور اس کے ساتھ ہی اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک گونجی۔

پھر ایک دم میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ یوں لگا جیسے میں سو برس تک ایک کال کوٹھری میں بند رہنے کے بعد اچانک چلچلاتی دھوپ میں آ گیا ہوں۔ اردگرد کی ہر جاندار و بے جان شے مجھے اپنے اردگرد رقصاں نظر آئی۔ میرے سامنے عالیہ کھڑی تھی اور ایسی سج دھج سے کھڑی تھی کہ اس کے چمکیلے سراپا پر نگاہ جم نہیں پا رہی تھی۔ زرق برق لباس' کلائیوں میں ہفت رنگ چوڑیاں' ہلکا سا میک اپ' کانوں میں جگمگاتے جھمکے' شانوں پر ریشمی زلفوں کے سائے۔ وہ لڑکی نہیں لگ رہی تھی' ابن آدم کی آرزو لگ رہی تھی۔ ایک سرسراتی ہوئی ریشمی رات لگ رہی تھی جو فرط شوق میں سرشام چلی آئی تھی۔

جیسے عالیہ کو دیکھ کر میں حیران ہوا وہ بھی مجھے دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی۔ یہ ری ایکشن ایسا نہیں تھا کہ اکرام کی نظروں سے اوجھل رہتا...... وہ مسکراتے ہوئے بولا

"میرا خیال ہے کہ آپ اک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔"

"ج...... جی ہاں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اسی دوران میں عالیہ بھی پہلے شاک کے اثر سے نکل آئی تھی۔ وہ چند لمحے تذبذب میں رہی پھر اپنا آنچل درست کرتے ہوئے اندر آ گئی "السلام علیکم" اس نے حتی الامکان نارمل آواز میں کہا۔

میں نے کھڑے ہو کر اس کے سلام کا جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے اکرام کی طرف دیکھنے لگا۔ عالیہ کے چہرے پر سرخی سی لہرا گئی۔ یہ سرخی میرے سوال کا بڑا واضح جواب تھی۔ راجا اکرام ہی عالیہ کا شوہر تھا۔ میں نے ایک بار پھر دھیان سے اکرام کو

دیکھا۔ اس کی پیشانی سے بال اڑے ہوئے تھے۔ رنگ گندمی تھا۔ ہونٹ ضرورت سے زیادہ موٹے تھے۔ ہونٹوں کی رنگت دیکھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت زیادہ سگریٹ نوشی کرتا ہے۔

اکرام مسکرا کر بولا "میرا خیال تھا کہ مجھے آپ دونوں کو متعارف کرانا پڑے گا لیکن اب یوں لگ رہا ہے کہ خود میرا تعارف کرائے جانے کی ضرورت ہے۔"

عالیہ اب خود کو مکمل طور پر سنبھال چکی تھی، ٹھہری ہوئی آواز میں بولی "اکرام! لاہور میں یہ ہمارے پڑوسی ہیں۔ ان کے والد، چچا جان کے گہرے دوست رہے ہیں۔ میں نے بتایا تھا نا ان کے بارے میں۔"

اکرام نے ایک بار پھر گرم جوشی سے مصافحہ کیا "بھئی! آپ سب سے تو ہمارا غائبانہ تعارف ہے۔ عالیہ کی باتوں میں اکثر آپ لوگوں کا ذکر آتا رہتا ہے۔ آپ شاید...... شاعری وغیرہ بھی کرتے ہیں۔"

"شاعری کیا کرنی ہے جی۔ بس جھک مارتے ہیں۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"ارے نہیں جناب! آپ تو اچھا بھلا لکھتے ہیں۔ آپ کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ عالیہ نے مجھے پڑھوایا تھا۔ کیا زبردست شاعری تھی۔ ساری کی ساری تو میرے پلے نہیں پڑی لیکن جتنی بھی پڑی خوب تھی۔"

اپنی نظم اور عالیہ کے ذکر پر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے اپنے تاثرات کو بمشکل چھپاتے ہوئے کہا "بڑی خوشی ہوئی کہ آپ ریت سیمنٹ کا کام کرتے ہوئے بھی ادب سے تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں۔"

وہ بولا "ارے کہاں بھئی! ہم تو ایک نمبر کے بے ادب ہیں۔ ہمارے گھر میں اگر ادب کو تھوڑا بہت داخلہ ملا ہے تو وہ عالیہ کی وجہ سے ہے۔ اسے بڑا شوق ہے کتابیں پڑھنے کا۔"

میں نے چور نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ اس کی پلکیں جھکی جھکی تھیں اور وہ اضطراب کے عالم میں اپنے کنگن کو کلائی میں گردش دے رہی تھی۔

میں نے کہا "میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ لاہور سے اتنی دور یوں اچانک

آپ لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں تو یہاں ایک دوسرے مسئلے کے لئے آیا تھا۔"

"مسئلے بھی حل ہوتے رہیں گے" اکرام خوش دلی سے بولا۔ "پہلے چائے وغیرہ تو ہو جائے۔"

اس نے آنکھوں آنکھوں میں عالیہ کو اشارہ کیا۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود باہر نکل گئی۔

میں اور اکرام بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ اکرام خوش شکل تو نہیں تھا مگر خوش گفتار ضرور تھا۔ وہ بات سے بات نکالنے کا ہنر جانتا تھا اور ہر موضوع پر بے تکان بولتا تھا۔ میں نے مکان کی تعمیر کے سلسلے میں پیش آنے والا اپنا مسئلہ بیان کیا اور مقامی مزدوروں سے اپنے ٹھیکے دار کی ناچاقی کا احوال بھی بتایا۔

اکرام نے اس سلسلے میں مجھ سے ساری تفصیل معلوم کی اور تفہیمی انداز میں سرہلاتا رہا۔ آخر میں مسکراتے ہوئے بولا "آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ بس سمجھیں کہ یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اگر کوئی اور خدمت ہے تو بتائیں۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں اب یہ سوال مجھے پوچھنا چاہئے۔"

اس نے زندہ دلی سے قہقہہ لگایا اور پھر پرسوچ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا ."ویسے آپ کی بات درست ہے۔ خدمت کے بدلے خدمت تو ہونی چاہئے۔ میل ملاقات کا جواز بھی بنا رہتا ہے......"

"جی فرمایئے۔" میں نے صدق دل سے کہا۔

"ایک کام تو ہے آپ کے مزاج کا۔"

"مزاج سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"بھئی آپ رائٹر لوگ ہیں، آپ مجھ سے پتھر تڑوا رہے ہیں جواباً میں بھی آپ سے پتھر تو نہیں تڑوا سکتا۔ کوئی نرم و نازک کام ہی کروا سکتا ہوں۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"نہیں محترم! آپ تو بہت اعلیٰ کوالٹی کا کام کر رہے ہیں۔ ہر شخص کو قلم کی طاقت کہاں ملتی ہے۔" میں سوالیہ نظروں سے اکرام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا "اگر آپ اس خاکسار کے لئے کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں تو ایک کام آپ کے معیار

کے مطابق ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اٹھ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلتا اس کی اسٹڈی میں پہنچ گیا۔ یہاں تین چار الماریاں کتابوں اور رسائل وغیرہ سے بھری ہوئی تھیں۔ اکرام بولا "میرا خیال ہے کہ آپ کتابوں کا یہ ذخیرہ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ آپ کی حیرانی بجا ہے سارا دن ریت سیمنٹ اڑا کر گھر لوٹنے والے کتابوں کے لئے کہاں وقت نکال سکتے ہیں......... ان کتابوں کا تعلق میرے دادا جان سے ہے اور کسی حد تک والد مرحوم سے بھی۔ میرے دادا محترم میاں شمس کا تعلق بھی آپ کے ہی قبیلے سے تھا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بھی لکھاری تھے۔ وہ پنجابی میں لکھتے تھے۔ کچھ چیزیں انہوں نے اردو اور فارسی میں بھی لکھی ہیں۔ کہیں کہیں ان کی تحریر میں صوفیوں والا رنگ ڈھنگ بھی پایا جاتا ہے۔ دادا جان کا سارا کام قلمی نسخوں کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ اس میں نثر بھی ہے اور شاعری بھی۔ مجھے نہیں معلوم ان تحریروں کا معیار کیا ہے اور ادب میں ان کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ بہرحال اگر آپ کچھ وقت نکال سکیں تو ان تحریروں کو دیکھ لیں اور ان میں سے جو اچھی چیزیں ہیں وہ چھانٹ لیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے میں انہیں کتابی شکل دینا چاہتا ہوں۔"

راجا اکرام کے کہنے پر میں نے کہنہ سال کاغذ پر لکھے ہوئے ایک دو مسودے دیکھے۔ ساٹھ ستر سال پہلے کی شاعری تھی' لکھائی بھی گنجلک تھی۔ مجھے یہ ایک خشک اور مشقت طلب کام محسوس ہوا لیکن معلوم نہیں کیوں' میں اپنے دلی جذبات کا اظہار راجا اکرام پر نہ کر سکا۔ میں نے بظاہر دلچسپی سے ان مخطوطوں کا مطالعہ کیا اور اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ میں وقت نکال کر اس "کام" کو دیکھ لوں گا۔

اسی دوران میں عالیہ بھی چائے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر آگئی۔ اسے دیکھ کر اکرام نے کہا۔

"آؤ بھئی عالیہ! تھوڑی سی سفارش تم بھی کردو۔"

"کس سلسلے میں؟" وہ نگاہ جھکائے جھکائے بولی۔

اکرام اسے تفصیل بتانے لگا۔ وہ دلچسپی سے سرہلا رہی تھی یا شاید شوہر کی خاطر ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

☆-------------☆-------------☆

ب کچھ آپ ہی آپ ہوگیا تھا۔ مری کی خوبصورت فضاؤں میں نہ صرف عالیہ ے میری ملاقات ہوئی تھی بلکہ مستقل ملتے رہنے کے اسباب بھی پیدا ہوگئے تھے۔ راجا اکرام نے بڑی محبت سے میری یہ ڈیوٹی لگادی تھی کہ میں روزانہ دوپہر ایک سے چار بجے تک کا وقت اس کی اسٹڈی میں گزاروں اور ان گمشدہ اوراق کو اکٹھا کروں جن پر اس کے دادا محترم میاں شمس کی تخلیقات بکھری ہوئی تھیں۔ ایک سے چار بجے تک کا وقت راجا اکرام نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ کسی کسی روز وہ لنچ پر خود بھی گھر آجاتا تھا اور یوں ہم دونوں تبادلہ خیال کرلیتے تھے مگر ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ عموماً میری موجودگی کے دوران میں گھر میں عالیہ اور ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔ میں سیدھا اسٹڈی روم میں چلا جاتا۔ ملازمہ تاج وہیں چائے لے آتی۔ کبھی کبھی عالیہ سے بھی آمنا سامنا ہوجاتا۔ ہماری گفتگو سلام دعا اور رسمی کلمات سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ میں عالیہ کی آنکھوں میں گزرے دنوں کی پرچھائیاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا لیکن قطعی ناکامی ہوتی......... وہ بڑی خوبصورت نظر آتی تھی۔ ایک عجیب سا نکھار آگیا تھا اس کے سراپا پر۔ اچھے لباس کا انتخاب اس کی جاذبیت میں اضافہ کردیتا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے سینے میں بے اختیار ہوک سی اٹھتی۔ میں جانتا تھا کہ میں یہاں جس کام کے لئے آتا ہوں اس میں مجھے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ لاشعوری طور پر میرے یہاں آنے کا مقصد عالیہ کو دیکھنا اور ٹھنڈی آہیں بھرنا ہی تھا۔ میرے اندر کی محرومی میری قوت تخلیقی میں اضافہ کرنے لگی تھی اور ایک بار پھر میرے قلم کو آمد کی شاعری سے نسبت ہونے لگی تھی۔

ایک روز میں اسٹڈی میں مصروف تھا۔ میرے سامنے بوسیدہ مخطوطوں کا انبار تھا۔ میں اس انبار میں سے مطلوبہ کاغذات علیحدہ کررہا تھا اور سرخ قلم سے ان پر نشانات بھی لگاتا جارہا تھا۔ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ عالیہ کی آواز تھی۔ اس نے "سنئے" کہہ کر مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ میرے عین پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سختی تھی اور آنکھوں سے انتہا درجے کی سرد مہری جھلک رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "آپ کا کام کب ختم ہو رہا ہے؟"

"دو تین ہفتے تو لگیں گے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہ کاغذات یہاں سے لے جائیں اور اپنے گھر لے جاکر اطمینان سے انہیں دیکھ لیں۔"

"تم صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ میں یہاں نہ آیا کروں۔"

اس نے منہ پھیر لیا اور فرش کو گھورنے لگی۔ چند لمحے بعد اس کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری "ندیم! آپ نہیں جانتے شادی شدہ عورت کی زندگی کتنی نازک ہوتی ہے۔ شک کی ذرا سی ٹھیس اسے چکنا چور کردیتی ہے۔"

میں نے بھڑک کر کہا "تو تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارا گھر برباد کرنے کے لئے یہاں آتا ہوں۔ کیا تم اتنا نیچ اور گرا ہوا سمجھتی ہو مجھے!"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن........."

"میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں نے پھنکار کر کہا "مجھے کوئی شوق نہیں ہے بار بار یہاں آنے کا۔ تمہارے شوہر نے ہی مجبور کیا تھا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس سارے کام پر۔"

میں نے کاغذات ایک طرف پھینک دیئے اور اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ متذبذب کھڑی تھی۔ جیسے مجھے روکنا چاہ رہی ہو لیکن روک بھی نہ پا رہی ہو۔ میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے عالیہ! تم نے یہ بات کہہ کر مجھے میری ہی نظروں سے گرادیا ہے۔"

عالیہ بھونچکی نظر آنے لگی۔ شاید اسے مجھ سے ایسے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ میں نے اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کیا اور لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں ملازمہ تاج کھڑی تھی اور میرے اشتعال بھرے انداز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

تین چار روز میں راجا اکرام کے گھر نہیں گیا تو ایک روز اکرام خود چلا آیا۔ اس کے لباس اور چال ڈھال میں گئے دنوں کے نوابی طمطراق کی جھلک پائی جاتی تھی۔ کتاب کو "مرتب" کرنے کا پچاس ساٹھ فیصد کام ہو چکا تھا۔ باقی کا کام ڈیڑھ ہفتے میں مکمل ہو سکتا تھا لیکن میں مختلف بہانے تراش رہا تھا۔ آخر وہ روہانسے لہجے میں بولا "یار! اگر تم میرے گھر

نہیں آسکتے تو میں ساری لائبریری یہاں منتقل کرادیتا ہوں لیکن کچھ بھی ہے' یہ کام تم ہی کو کرنا ہے۔"

میں نے کہا "آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ دراصل موڈ کے بغیر مجھ سے کوئی کام ہوتا ہی نہیں ہے۔ میں آپ کا کام کروں گا اور گھر جاکر کروں گا لیکن پلیز ابھی کچھ دن آپ مجھے مجبور نہ کریں۔"

"اب اگر تمہارا موڈ دو ہفتے تک نہ بنا تو پھر؟ میں نے تو بھئی کتاب کی اشاعت سے لے کر اس کی رونمائی تک کا سارا انتظام کرلیا ہے۔ اگست کے آخر میں بڑے ابا (دادا مرحوم) کی برسی بھی ہے میں چاہتا ہوں کہ برسی کے روز کتاب کی رونمائی ہو۔"

"لیکن........"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" وہ اپنائیت سے بولا "اگر تم تھکاوٹ محسوس کرتے ہو تو دو تین دن آرام کرلو۔ ہفتے کو میں تمہیں لینے آؤں گا' تمہیں ہر صورت جانا ہوگا۔"

میں سخت الجھن میں تھا۔ عالیہ نے جس بے رخی سے بات کی تھی اس نے سینے میں گہری چوٹ لگائی تھی۔ میرا دل غم و غصے سے لبریز ہوگیا تھا نجانے کیوں دل چاہ رہا تھا کہ اب کبھی اس ستی ساوتری' شوہر پرست عورت کی صورت نہ دیکھوں۔

لیکن اگلے روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ عالیہ کا فون آگیا۔ میری آواز پہچان کر بولی "لگتا ہے آپ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔"

"مجھے کوئی ناراضگی نہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"فون بند نہ کیجئے۔" وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"مم........ مجھے بہت افسوس ہے ندیم! نجانے مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میں خود کو مسلسل کوس رہی ہوں کہ میں نے ایسی بات کیوں کی۔"

"تم نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ میں ہی غلط تھا جو روز منہ اٹھا کر چلا آتا تھا۔"

"پلیز........ مجھے اور شرمندہ نہ کریں۔ میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔"

وہ بہت دیر التجا آمیز لہجے میں بات کرتی رہی۔ اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس نے میرے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کیا ہے۔ آخر میں وہ کہنے لگی "آپ کو

ہر صورت کل آنا ہو گا۔ اگر آپ نہ آئے تو میں سمجھوں گی کہ آپ نے میری معذرت قبول نہیں کی اور مجھ سے اور اکرام سے ابھی تک ناراض ہیں۔"

"اچھا...... میں سوچوں گا۔"

"سوچوں گا نہیں' آنا ہے۔ میں اور اکرام آپ کا انتظار کریں گے۔"

فون بند کرتے کرتے ایک بار پھر اس نے اپنے وہ تلخ الفاظ واپس لئے جو چند روز پیشتر اس کی زبان سے نکلے تھے۔

نجانے کیوں میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ عالیہ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔ میں راجا اکرام کے گھر کیوں جاتا تھا۔ میاں شمس کی کہنہ سال کتاب' اکرام کی دوستی اور ادب نوازی تو بے معنی باتیں تھیں۔ اصل میں وہ عالیہ کا روشن ہیولا تھا جو مجھے اس چاردیواری میں کھینچتا تھا۔ میں عالیہ کے قریب رہنا چاہتا تھا اور اس کے قریب رہ کر یہ امید پالنا چاہتا تھا کہ شاید کسی وقت کوئی ایسی انہونی ہو جائے کہ میں عالیہ کے مزید قریب جا سکوں۔

اگلے روز سے میں پھر راجا اکرام کے گھر جانے لگا۔ عالیہ نے اب اپنے رویے پر نظر ثانی کر لی تھی۔ وہ اب ملازمہ کے بجائے خود چائے لے آتی تھی۔ چائے پینے کے دوران میں وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہتی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ عالیہ اکثر اپنی خوش گوار ازدواجی زندگی کے بارے میں بتاتی۔ وہ بڑے بے ساختہ انداز میں اکرام کی خوبیاں بیان کرتی چلی جاتی تھی۔ ہمارے درمیان جیسے یہ خاموش معاہدہ ہو چکا تھا کہ ہم ماضی کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ کسی تلخ یا شیریں یاد کا تذکرہ نہیں ہو گا لیکن ایسے احساسات بند باندھنے سے کب رکتے ہیں۔ وہ تو آپ ہی آپ ذہنوں پر یلغار کرتے ہیں۔ گفتگو میں جھلک دکھاتے ہیں اور آنکھوں سے چھلکتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی اکثر ایسا ہوتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ عالیہ چاہتی ہے کہ میں جلد از جلد اپنا کام مکمل کر لوں اور میرا یہاں آنا جانا ختم ہو جائے یا نہ ہونے کے برابر رہ جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں اس کی آنکھوں میں کسی وقت ایک اور طرح کا جذبہ بھی دیکھتا تھا۔ وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھی' میرا انتظار کرتی تھی۔ اگر کسی روز میں نہ آتا تو اگلے روز اس کی آنکھوں میں موہوم شکوہ ہوتا تھا۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ وہ آگ روشن ہو گئی جو کئی روز سے چپکے چپکے میرے دل دماغ میں سلگ رہی تھی۔ اس آگ کو روشن کرنے کا سبب پرانی یاد کا ایک تیز جھونکا تھا۔ میں چائے پی رہا تھا۔ عالیہ بھی میرے ساتھ تھی۔ ملازمہ تاج ایک ٹرے میں فروٹ لائی۔ کیلے' سیب اور کینو تھے۔ میں نے ایک کینو اٹھایا اور چھیلنے لگا۔ یکایک میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا کینو...... کینو نہ رہا ایک یاد بن گیا۔ پھر جیسے ٹیلی پیتھی کی غیر مرئی لہر عمل کرتی ہے...... یہ یاد بھی میرے ذہن سے عالیہ کے ذہن تک کوند گئی۔ اس نے بھی چونک کر کینو کی طرف دیکھا۔ ایک عجیب سا رنگ اس کے چہرے پر لہرا گیا۔ ہاں یہ کینو ایک یاد تھا۔ آج سے پانچ چھ سال پہلے میں نے بہار کی ایک چمکیلی دوپہر کو اس "یاد" پر "محبت" کا لفظ لکھا تھا اور عالیہ تک پہنچایا تھا۔ کتنا عجیب سا کام ہوا تھا وہ مجھ سے...... شاید وہ "محبت" کا لمحہ تھا۔ میرے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہوتا میں اس پر "محبت" لکھ دیتا اور عالیہ تک پہنچا دیتا۔

میں نے دیکھا کہ عالیہ کے لب تھرا رہے ہیں۔ نجانے ایک دم مجھے کیا ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مجھے اشک بار دیکھ کر عالیہ کی آنکھوں میں بھی نمی چمک گئی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا "یہ سب کیا ہوا عالیہ! ہم کیسے دور ہو گئے۔ ایسا تو...... ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

"وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔" عالیہ کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آئی تھی۔

"عالیہ' تمہیں ایک بار چھو کر دیکھ لوں۔" نجانے یہ بات کیسے میرے منہ سے نکل گئی تھی۔ میرے لہجے میں دنیا بھر کی التجائیں سمٹی ہوئی تھیں۔

"نہیں ندیم!" وہ ایک دم چونک کر کھڑی ہو گئی "اب...... بھول جائیں وہ سب کچھ۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

میرے سارے زخم ایک دم ہرے ہو گئے تھے۔ میرے سینے میں آگ سی بھڑک رہی تھی۔ کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور میاں شمس کے مخطوطے دیکھنے کو تو بالکل نہیں۔

میں باہر نکل آیا۔ مری کے نشیب و فراز میں بے مقصد اور بے سمت گھومنے لگا۔

عالیہ شادی شدہ تھی مگر میرا رواں رواں اس کا نام الاپ رہا تھا۔ میں اسے چھونا چاہتا تھا' اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس انوکھے لاڈلے کی ضد تھی جو کھیلنے کے لئے چاند مانگا جاتا ہے۔ یہ اس فرہاد کے سر کا سودا تھا جو پتھروں سے تیشہ ٹکراتا ہے۔ یہ ان نامراد عاشقوں کا جانا پہچانا جنون تھا جو اپنے ہی خود میں لت پت ہو کر رقص کرنے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ میں مذہب' معاشرت اور اخلاق کی ساری حدود وقیود سے واقف تھا لیکن اپنے دل پر میرا اختیار نہیں تھا۔ عالیہ کا حسین سراپا بجلی کی طرح میری نگاہوں میں کوندتا تھا اور میری ساری فراست کو خاکستر کر دیتا تھا۔ میں شام تک یونہی گھومتا رہا۔ آخر ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ ہمارے ٹھیکے دار سلیم صاحب کی آواز تھی۔ وہ لوئر مری کی طرف سے پیدل آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے "کیا بات ہے ندیم میاں! آج راجا اکرام کی طرف نہیں گئے۔"

میں نے نفی میں جواب دیا۔ انہوں نے پوچھا' "کیوں"...... اس "کیوں" کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں کیسے بتاتا کہ ایک بھولی بسری یاد کے جھونکے نے میرے تن بدن میں خوف ناک آگ بھڑکا دی ہے اور میں اس آگ کی تپش سے بچنے کے لئے "اکرام لاج" سے بھاگ آیا ہوں۔ بہرحال سلیم صاحب کو کوئی جواب تو دینا ہی تھا۔

میں نے کہا "راجا اکرام کل لاہور چلا گیا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر بیٹھا رہوں۔ پرسوں وہ آجائے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔"

سلیم صاحب عجیب سے انداز میں مسکرائے "اگر وہ لاہور گیا ہے تو چھ سات روز سے پہلے نہیں آئے گا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے ذرا چونک کر پوچھا۔

وہ معنی خیز انداز میں بولے "بڑی پہنچی ہوئی چیز ہیں' یہ اپنے راجا اکرام صاحب بھی۔ بازاری کھانے بہت کھاتے ہیں۔ حالانکہ گھر میں گرما گرم کھانا ہروقت تیار رہتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"بھئی ادھر ادھر بہت منہ مارتے ہیں۔ سنا ہے لاہور میں بھی ان کی کوئی قدردان ہے...... بازار حسن کی چیز ہے اور بازار حسن کی چیز آسانی سے بندے کا پیچھا نہیں

چھوڑتی۔"

میں حیران رہ گیا "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اکرام تو...... اس قسم کا بندہ نہیں لگتا۔"

"بھئی' ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ میں نے تو بڑے کارنامے سنے ہیں اکرم صاحب کے اور یہ ساری جھوٹی باتیں نہیں ہیں۔ ایک دو واقعات کا تو میں خود چشم دید گواہ ہوں اور پھر تمہیں پتا ہے آگ ہو تو دھواں نکلتا ہے۔"

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں وہیں سلیم صاحب کے ساتھ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ہم راجا اکرام کی باتیں کرنے لگے۔ سلیم صاحب کی اطلاعات چشم کشا تھیں۔ دراصل ایک مقامی پراپرٹی ڈیلر سے سلیم صاحب کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اسی کی زبانی سلیم صاحب کو نوجوان ٹھیکے دار اکرام کا کچا چٹھا معلوم ہوا تھا۔ باتوں سے پتا چلتا تھا کہ اکرام ناچ گانے کا دلدادہ ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتا ہے لاہور کا بازار حسن اسے کشش کرتا رہتا ہے۔ کئی طرح دار طوائفوں سے اس کے تعلقات رہے ہیں اور ایک مشہور فلمی ڈانسر کی چھوٹی بہن کو اس نے باقاعدہ کوٹھی لے کر دی ہوئی ہے۔ مہینے میں ایک دوبار اس "شہزادی" نامی لڑکی کے پاس لاہور ضرور جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مری ہی کی ایک شریف زادی سے اکرام کے معرکۃ الآرا معاشقے کا احوال بھی سلیم صاحب نے سنایا۔

میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہا اور سوچتا رہا کہ میں بھی کیسا بدھو ہوں۔ کئی ہفتوں سے اکرام کے گھر آجا رہا ہوں۔ لیکن ایک بار بھی مجھے شک نہیں گزرا کہ اکرام کے مشاغل اس قسم کے ہو سکتے ہیں' اس کے علاوہ میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں بھی مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آسکی...... میری سماعت میں عالیہ کی وہ باتیں گونجنے لگیں جو وہ وقتاً فوقتاً اکرام کے حوالے سے کرتی رہی تھی۔ اپنی ازدواجی زندگی کا کیا خوب صورت نقشہ کھینچتی رہی تھی وہ۔ اکرام کے لئے اس کی محبت' اکرام کی جان نثاری' بے مثال ذہنی ہم آہنگی اور پتا نہیں کیا کچھ۔ کیسی پردہ پوش لڑکی ہے وہ؟ میں نے تعجب سے سوچا اور اس کے ساتھ ہی ایک جلن سی میرے رگ وپے میں سرایت کر گئی...... سلیم صاحب کی زبانی مجھے اکرام کے متعلق اور بھی کئی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ اس کے گھریلو حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ بیوی اور سسرال والوں کے ساتھ اس کی کافی ناچاقی

رہی ہے، یہ بھی کہا جاتا تھا کہ سسرال والوں کے ساتھ اس نے تعلقات قطع کر رکھے ہیں۔

میں دو تین روز تک راجا اکرام کے گھر نہیں گیا۔ بس کمرے میں بند رہا اور اپنے اندرونی ہیجان سے بچنے کے لے قلم و قرطاس میں پناہ ڈھونڈتا رہا۔ ان دنوں خیالات میں زبردست قسم کی روانی پائی جا رہی تھی۔ مضامین خود بخود ذہن پر وارد ہو رہے تھے۔ پچھلے پندرہ بیس روز میں میں نے تین چار بڑی اچھی چیزیں لکھی تھیں۔ ان میں امپیکٹ گروپ کے لئے دو گیت بھی تھے۔ ایک گیت کا عنوان تھا "شاید ہم پھر ملیں گے۔" مرد و زن کی محبت کا آفاقی موضوع اس گیت میں خوب صورتی سے سمٹ آیا تھا۔ یہ گیت ان منہ زور الوہی جذبوں کا عکس تھا جو ہر رکاوٹ توڑ کر نکلتے ہیں اور انسانی سوچوں پر یلغار کرتے ہیں۔ اگر وہ معاشرتی مجبوریوں کے سبب عملی شکل میں ظاہر نہ بھی ہو سکیں تو مرتے نہیں۔ وہ تمدن کے ہر ہر مسام میں سرایت کر جاتے ہیں اور نسل در نسل زندہ رہنے کے بعد کئی گنا زیادہ طاقت سے نمودار ہوتے ہیں۔ پھر وہ لازوال رومانی داستانیں بنتی ہیں جو زمانوں تک کہی اور سنی جاتی ہیں۔ یہ گیت اس امید کی روداد تھا جو عاشق کے دل میں مر کر بھی زندہ رہتی ہے۔ وہ اپنی آخری سانس تک کسی انہونی کا منتظر رہتا ہے۔ کسی ایسی گھڑی کا انتظار کرتا ہے جب وہ اپنے محبوب کو کامل طور پر حاصل کر لے۔ نہ روحانی طور پر اپنے مطلوب سے دور رہے نہ جسمانی طور پر......... مجھے یقین تھا کہ یہ گیت بہت پسند کیا جائے گا۔

"امپیکٹ گروپ" کے لئے یہ دو گیت لکھنے کے دوران میں دو روز تک میں کمرے میں بند رہا تھا۔ تیسرے روز صبح سویرے فون آگیا۔ راجا اکرام کے گھر سے ملازمہ تاج بی بی بول رہی تھی۔ اس نے کہا "بیگم صاحبہ پوچھ رہی ہیں آپ آئے کیوں نہیں؟"

"بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔"

"آج آئیں گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"میں بیگم صاحبہ کو کیا بتاؤں؟"

"اس سے کہہ دو کہ اگر طبیعت سنبھل گئی تو آجاؤں گا۔"

فون بند کرنے کے بعد میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نجانے کیوں مجھے احساس ہوتا تھا

کہ عالیہ مجھ سے بے تحاشا گریز کرنے کے باوجود میرا انتظار کرتی ہے۔ ممکن تھا کہ یہ میری خوش فہمی ہو اور یہ بھی ممکن تھا خوش فہمی نہ ہو۔

تھوڑی دیر بعد فون آگیا۔ اس مرتبہ عالیہ بول رہی تھی۔ "السلام علیکم۔" اس کی مترنم لیکن سپاٹ آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"وعلیکم السلام۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تاج کہتی تھی آپ کی طبیعت.........."

"ہاں نزلہ وغیرہ تھا۔ سہ پہر تک بہتر ہو گیا تو آؤں گا۔"

"دراصل........" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"ہاں ہاں کہو۔"

"دراصل........ اکرام نے لاہور سے قالین بھجوائے ہیں۔ اوپر والی منزل میں کارپیٹنگ ہونی ہے۔ کاریگر بھی ساتھ آئے ہیں۔ کل انہوں نے کام کرنا ہے۔ اسٹڈی میں آپ کے کاغذات وغیرہ بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر آپ وہ سنبھال لیتے تو.........."

"ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

حسب معمول سہ پہر کو میں اکرام لاج پہنچ گیا۔ بادل گھر کر آئے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اندر ایک برآمدے میں مشینی قالینوں کے بڑے بڑے رول پڑے تھے۔ ہیشہ کیطرح پوری کوٹھی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ملازمہ تاج مجھے اوپر اسٹڈی میں لے گئی۔ فرش پر کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ میں انہیں سنبھالنے لگا اور ترتیب سے الماریوں میں رکھنے لگا۔ آدھ پون گھنٹے بعد عالیہ کی جھلک نظر آئی۔ وہ سرخ ساڑی میں تھی۔ بال ڈھیلے ڈھالے جوڑے میں بندھے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں وہ پہلے ہی ایسی پر کشش تھی یا اب لگنے لگی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی ایک ایسی لچک دار شاخ کا تصور ذہن میں آتا تھا جو رسیلے پھلوں سے لدی پڑی ہو۔ میں نے گھبرا کر نگاہیں پھیر لیں۔ وہ عام سے لہجے میں میرا حال احوال دریافت کر کے شیشے کے کمرے (Glass Room) کی طرف چلی گئی۔ دیوانہ کر دینے والی خوشبو کا ایک جھونکا تھا جو آیا اور پلٹ گیا۔ ان لمحات میں مجھے راجا اکرام کی قدر ناشناسی پر تعجب ہوا۔ نجانے وہ کون سبز پریاں تھیں جن کے لئے وہ عالیہ کو نظر انداز کر رہا تھا۔

مجھے عالیہ سے دوبارہ ملتے تین مہینے ہونے کو آئے تھے لیکن جس قسم کے جذبات میں آج محسوس کررہا تھا' پہلے کبھی نہیں کئے تھے۔ نجانے کیوں آج مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اگر میں اپنے دل میں عالیہ کی خواہش رکھوں گا اور اس خواہش کو پنپنے کا موقع دوں گا تو کوئی اخلاقی جرم نہیں کروں گا۔ شاید اس تبدیلی کی وجہ وہ باخبری تھی جو مجھے اکرام کے حوالے سے ملی تھی۔ یہ جانکر لاشعوری طور پر میری ڈھارس بندھی تھی کہ اکرام ایک بے وفا شوہر ہے اور ازدواجی رشتہ اس کے نزدیک ایک بے وقعت بندھن ہے۔

کھڑکیوں سے باہر رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ ایسے میں چائے کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تو دل ودماغ معطر ہوگئے۔ ملازمہ تاج ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا "بیگم صاحب کہاں ہیں؟"

وہ بولی "گلاس روم میں ہیں۔"

میں نے کہا "چائے وہیں لے جاؤ۔ میں بھی آتا ہوں۔"

ملازمہ چائے لے گئی۔ پیچھے ہی پیچھے میں بھی پہنچ گیا۔ رم جھم کے دوران میں اس گلاس روم میں بیٹھ کر عالیہ کے ساتھ چائے پینا اور باتیں کرنا ایک دل گداز تجربہ تھا۔ ہمارے سامنے میلوں تک پھیلی ہوئی وادی تھی۔ چیڑ کے جنگل تھے اور بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان تھا۔ میں نے عالیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ڈرامائی ٹھہراؤ کے ساتھ کہا "عالیہ! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وقت لوٹ آئے۔"

وہ لرز گئی' مگر سنبھل کر بولی "وقت کب لوٹتا ہے۔"

"میں اپنے اور تمہارے وقت کی بات کررہا ہوں۔" میں نے عجیب بے باکی سے کہا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک بار پھر وہیں جا کھڑے ہوں جہاں سے بچھڑ گئے تھے۔"

رومانیت ایک چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولی "اب میں ایک شادی شدہ عورت ہوں ندیم! تم جانتے ہو میرا شوہر ہے' گھر ہے۔"

"تمہارا کچھ نہیں ہے' بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور ایک جھنجلاہٹ سی میرے رگ وپے میں دوڑ گئی' تم کس گھر کی بات کررہی ہو؟ کس شوہر کی بات کررہی ہو؟ میں...... میں سب جانتا ہوں عالی! تم خود کو دھوکا دے رہی ہو اور دنیا والوں کو بھی۔"

عالیہ کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا "آپ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں ندیم؟" وہ ہکلائی۔

"میں سب جانتا ہوں عالیہ! جو کچھ تم پر اس گھر میں بیت رہی ہے' مجھے معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں اکرام اس وقت لاہور میں کیا کررہا ہے اور اس کے دیگر کارنامے بھی مجھ سے چھپے ہوئے نہیں۔ وہ پرلے درجے کا......"

"ندیم۔" عالیہ نے کراہ کر میری بات کاٹی "پلیز ایسی بات مت کریں۔ اکرام میرے شوہر ہیں۔ میں ان کے بارے میں ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔"

"اس کے بعد تم کہو گی کہ ان کا رتبہ مجازی خدا کا ہے۔ وہ تمہیں جس حال میں رکھیں' تمہیں قبول ہے۔ یہ تمہارے گھر کا معاملہ ہے وغیرہ وغیرہ۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "شوہر پرست بیویوں کے ایسے لیکچر میں نے بہت سنے ہیں فلموں ڈراموں میں...... لیکن یہ فلم نہیں' زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں عالی۔ انہیں سمجھنے اور ان کا سامنا کرنے کی کوشش کرو...... میں نے جو کچھ اکرام کے بارے میں سنا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد یہ طے ہے کہ وہ تمہیں خون کے آنسو رلائے گا۔ آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں' اور اگر......"

"پلیز ندیم!" اس نے میری بات کاٹی "میں نہیں چاہتی کہ آپ اس موضوع پر بات کریں۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں...... جانتی ہوں کہ اکرام کچھ عرصے پہلے بہت بھٹکے ہوئے تھے لیکن اب وہ بہتر ہو رہے ہیں۔ میری خاطر انہوں نے بہت بدلا ہے خود کو...... میں انہیں بدل رہی ہوں اور میں ہار ماننے والی نہیں۔ میں انہیں بدل کر رہوں گی۔ پلیز آپ اس بارے میں آئندہ گفتگو نہ کریں۔ وہ میرے شوہر ہیں۔ میں انہیں آپ سے بہت زیادہ جانتی ہوں۔"

"یہی تو تم نادان عورتوں کی بھول ہوتی ہے عالی! تم کچھ نہیں جانتیں۔ بس اندھے اعتماد کے ساتھ آنکھیں بند کرکے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر بیٹھی رہتی ہو اور تصور کرتی ہو باغ باغیچے کا۔ ناک میں بو گھستی رہتی ہے لیکن دماغ معطر رکھنے کی کوشش کرتی ہو۔ جس شخص کو تم بدلنے کی کوشش کررہی ہو' وہ بدلنے والا نہیں۔ اس کی سات پشتوں میں کسی نے وفا نہیں کی تو وہ کیوں یہ "بدنامی" مول لے گا۔"

"آپ کیا باتیں کررہے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ تلملا کر بولی۔

میں نے چند بوسیدہ کاغذات اس کے سامنے رکھ دیئے۔ یہ کاغذات کچھ روز پہلے مجھے میاں شمس کے ایک مخطوطے میں سے ملے تھے۔ یہ ایک طرح کا شجرہ نسب تھا، جس میں راجا اکرام کے والد، دادا، پردادا اور بعد کی دو تین پشتوں کی خانگی زندگی کا احوال موجود تھا۔ اکرام کے والد راجا عباس نے دوشادیاں کی تھیں۔ دادا راجا شمس نے تین شادیاں کی تھیں جن میں سے ایک شادی طوائف زادی سے ہوئی تھی۔ پردادا خدابخش کی بیویوں کی تعداد چار تھی اور یہ حضرت بھی راگ رنگ کے زبردست شوقین تھے۔ مگر دادا نے ایک سکھ لڑکی سے بڑے افلاطونی عشق کے بعد شادی کی تھی اور تیس برس تک مثالی زندگی گزاری تھی مگر آخری عمر میں انہوں نے بھی یکے بعد دیگرے تین شادیاں کرلیں تھیں۔

میں نے عالیہ سے کہا "اس تاریخ کو غور سے دیکھ لو۔ اپنے انجام کا تمہیں خود بخود پتا چل جائے گا۔" میں نے جھنجلاہٹ میں ٹہلنا شروع کردیا۔

وہ غور سے بوسیدہ کاغذات کا مطالعہ کرنے لگی پھر روہانسی آواز میں بولی "پتا نہیں آپ کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے بتا رکھا ہے اکرام نے کہ ان کے خاندان میں ایک سے زائد شادیوں کا رواج رہا ہے لیکن........ یہ ضروری تو نہیں کہ اکرام بھی........" وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ کاغذات اس نے دوبارہ مجھے لا تھمائے تھے۔

میں نے کہا "یہی بات تو میں کہہ رہا ہوں۔ تمہارے جیسی عورتوں کی خوش فہمیاں تمہیں لے ڈوبتی ہیں........ اب جو کچھ ہو رہا ہے، تمہارے سامنے ہو رہا ہے۔ جو آئندہ ہوگا وہ بھی تمہارے سامنے ہوگا۔ بس تم اپنے دل کو تسلیاں دیتی رہو گی، یا کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلو گی۔"

وہ جھلا کر بولی "بس کریں ندیم! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں لیکن اپنے شوہر کے خلاف کوئی بات نہیں سنوں گی۔"

"ہاں، پاؤں کی جوتی بنو گی۔ سوکنیں برداشت کرو گی لیکن بات نہیں سنو گی۔"

"دیکھیں ندیم! آپ میرے گھر میں کھڑے ہو کر مجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ براہ مہربانی آپ چلے جائیں۔" وہ لال بھبوکا ہو رہی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے لہجے میں اتنی اجنبیت محسوس کی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اسے شانوں سے تھامتے ہوئے نرمی سے کہا "عالیہ! میری بات سنو۔" میرے تھامنے سے اس کا بدن جھرجھرا گیا۔ بے اختیار ہو کر اس نے مجھے پیچھے ہٹادیا "میں نے کہا ہے آپ چلے جائیں۔ پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

میں نے اسے پھر تھامنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہیجانی انداز میں دوبارہ اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں پہلے ہی دروازے سے باہر کھڑا تھا۔ زینہ میرے پاؤں کے بالکل پاس تھا۔ عالیہ نے مجھے خود سے دور رکھنے کے لئے دوسری بار دھکیلا تو میرا پچھلا پاؤں بالائی زینے پر پڑا اور ایک دم درو دیوار میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ مجھے بالکل پتا نہیں چلا، کیا ہوا ہے؟ چند لمحے آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑتی رہیں پھر ایک شدید جھٹکے کے ساتھ میں نے خود کو زیریں فرش پر پایا۔ میری کمر میں درد کی ناقابل برداشت ٹیس اٹھی تھی اور نچلا دھڑ سن سا ہوگیا تھا۔

میں نے دیکھا عالیہ کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی زینے سے اتری اور میرے پاس پہنچی۔ وہ مجھے اٹھانا چاہ رہی تھی لیکن بے حد تکلیف کے باوجود میں نے خود اٹھنے کی کوشش کی اور سیڑھی کی ریلنگ کا سہارا لے کر اٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔

میرے کانوں میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں صرف یہ محسوس کر رہا تھا کہ عالیہ گھبرائے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر معذرت تھی۔ پھر شاید اس نے مجھے پانی پلانے کی کوشش کی تھی۔ من نے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ شیشے کا گلاس دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہوگیا تھا اور میں لڑکھڑاتا ہوا اکرام لاج سے باہر نکل آیا تھا۔

بارش ابھی تک جاری تھی۔ سرشام ہی تاریکی پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس ڈھلوان پر آگے بڑھنے لگا تھا جو کالونی کی سڑک کی طرف جاتی تھی۔ بمشکل پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ ہی میں نے طے کیا تھا کہ ایک بار پھر کمر میں درد کی شدید ٹیس اٹھی۔ یہ ٹیس کچھ ایسی تھی کہ مجھ سے ایک قدم بھی مزید نہیں اٹھایا گیا۔ میں کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دھڑام سے پتھروں پر گرا تھا۔ اس وقت میرے ذہن نے گواہی دی تھی کہ میری کمر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ گرنے کے بعد میں مکمل طور پر بے ہوش ہوگیا تھا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں مری کے ایک پرائیویٹ کلینک میں تھا۔ دو ڈاکٹرز مجھ

پر جھکے ہوئے تھے۔ مجھے ٹھیکے دار سلیم صاحب کی وحشت زدہ صورت نظر آئی۔ میرے بازو سے گلوکوز کی ڈرپ منسلک تھی اور میرے منہ میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے کے تمام واقعات میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ عالیہ کا معصوم چہرہ میرے تصور میں کوندا اور سینے میں نفرت کے انگارے دہک اٹھے۔ میں نے اٹھنا چاہا تھا لیکن اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا نچلا دھڑ حرکت نہیں کر رہا۔ میں کہنیوں کے بل بستر سے بلند ہوا' اپنی ٹانگوں کو سمیٹنا چاہا لیکن میری ٹانگیں میرے جسم کے ساتھ ہونے کے باوجود ساتھ نہیں تھی۔ ایکا ایکی مجھ پر یہ خوف ناک انکشاف ہوا کہ میرا نچلا دھڑ بے جان ہے۔

☆-------------☆-------------☆

میرے روز و شب اچانک ہی اذیت ناک اور قابل رحم ہو گئے تھے۔ بڑی بھیانک کروٹ لی تھی میری زندگی نے۔ ریڑھ کی ہڈی میں لگنے والی چوٹ سے میرا نچلا دھڑ مفلوج ہو چکا تھا۔ والد صاحب میرا علاج لاہور کے ایک پرائیویٹ کلینک میں کروانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ماموں جان چاہتے تھے کہ مجھے انگلینڈ لے جائیں۔ وہاں ایک معروف پاکستانی آرتھوپیڈک سرجن ان کا دوست تھا۔ ماموں کا خیال تھا کہ انگلینڈ میں میرا علاج ہونے سے میں ایک سو ایک فیصد ٹھیک ہو جاؤں گا لیکن میری رائے یکسر مختلف تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں آپریشن نہیں کراؤں گا۔ میری "نہیں" کو پہلے تو میری اضطراری حرکت سمجھا گیا لیکن جب میں نے بے حد سنجیدگی سے اپنی بات پر اڑ گیا تو اہل خانہ کو تشویش ہوئی۔ میری بہن شاہین تو ایک دن مجھ سے لڑ ہی پڑی "آخر تم کیوں عذاب دے رہے ہو ہم سب کو؟ تمہاری ہر بات تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اب یہ بھی کوئی ضد ہے کہ میں آپریشن نہیں کراؤں گا۔ کیا ساری زندگی ایسے ہی اپاہج بنکر پڑے رہو گے۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو شاہین! ریڑھ کا آپریشن بے حد پیچیدہ ہوتا ہے۔ اکثر بے حد خوف ناک نتائج نکل آتے ہیں۔ میں یہ خوف ناک رسک لینا نہیں چاہتا۔"

"تمہاری یہ منطق تمہارے تمام فیصلوں کی طرح نرالی ہے۔ تمہیں ہزار بار بتایا گیا ہے کہ یہ ایک بے ضرر آپریشن ہے اور نتائج انشاء اللہ سو فیصد تمہاری صحت کی صورت میں نکلیں گے۔ پھر بھی تم طوطے کی طرح اپنی رٹ لگائے جاتے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے' تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا یا پھر کوئی بات ہے جسے تم چھپا رہے ہو۔"

"مں کچھ نہیں چھپا رہا۔ بس میں یہ آپریشن نہیں کراؤں گا۔" میرا لہجہ ہمیشہ کی طرح فیصلہ کن تھا۔

"بھاڑ میں جاؤ ہماری طرف سے۔" شاہین نے غصے سے کہا اور پاؤں پٹختی باہر چلی

گئی۔ میں جانتا تھا کہ اب کمرے میں جاکر وہ خوب روئے گی۔

ایک عجیب سی بے حسی اور قنوطیت مجھ پر طاری ہوچکی تھی۔ میں ایک منفرد مریض تھا۔ ایسا مریض جو اپنی بیماری سے لڑنے کے بجائے اسے اپنے اوپر غالب کر رہا تھا۔ میں اکثر دوا بھی نہیں کھاتا تھا اور ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرنے سے تو مجھے چڑ سی ہوگئی تھی۔ میں یہ سب کیوں کر رہا تھا؟ یہ صرف میں جانتا تھا یا وہ جانتی تھی جس کے لئے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ میری یہ بیماری عالیہ کی "بخشش" ہوئی تھی۔ عالیہ کو ذہنی کوفت پہنچانے کے لئے میں اس بیماری کو اپنے جسم کا حصہ بنا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ میرے حالات سے آگاہ ہے۔ وہ سب کچھ جانتی ہے.......... اور عین ممکن ہے کہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہی ہو......... گھر میں اور گھر سے باہر کسی کو پتا نہیں تھا کہ میری چوٹ کا اصل سبب کیا ہے اور یہ بات تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ مجھے یہ چوٹ عالیہ کی وجہ سے آئی ہے۔ میں نے سب کو یہی بتایا تھا کہ بارش میں گھر واپس آتے ہوئے میں ڈھلوان سے پھسل گیا تھا۔

پھر ایک روز عالیہ اپنے خاوند کے ساتھ میری عیادت کے لئے آئی۔ وہ لوگ لاہور میں کسی شادی میں شرکت کرنے پہنچے تھے۔ وہ دونوں پہلو بہ پہلو کمرے میں داخل ہوئے تو میں وہیل چیئر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ راجا اکرام مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا "یار ندیم! یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے۔ خدا کی قسم میں تو تمہیں پہچان نہیں سکا۔"

میں نے کہا "اکثر لوگ یہی کہتے ہیں۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ عالیہ بظاہر نارمل نظر آرہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی بے چینی میں بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ وہ ندامت اور خجالت جو میں اس کے چہرے پر دیکھنا چاہتا تھا وہاں موجود تھی اور یہ امر میرے لئے بڑی ہی طمانیت کا باعث تھا۔ میری روح مسرور ہوگئی۔ اپنے اپاہج ہونے کا غم خوشی میں بدل گیا۔ معلوم نہیں یہ کیا احساس تھا، یہ کیسی سوچ تھی؟

اکرام نے بڑی اپنائیت سے کہا "سنا ہے یار! تم آپریشن سے کترا رہے ہو۔"

"میں تو اکرام صاحب، زندگی سے کترا رہا ہوں لیکن جب تک سانس چلتی ہے، زندہ تو رہنا ہی ہے۔"

"اتنی مایوسی....... پیارے کچھ حوصلہ پکڑو۔ تم تو کشتیاں ہی ڈبوئے بیٹھے ہو۔ تمہاری تکلیف ایسی نہیں کہ ٹھیک نہ ہوسکے۔ ابھی پچھلے دنوں عالیہ نے ایک انٹرنیشنل پرچے میں آرٹیکل پڑھا تھا۔ بالکل تمہارے ہی طرح کے کیس کو ڈسکس کیا گیا تھا....... وہاں تو بڑی امید افزا باتیں لکھی تھیں۔ کیوں عالیہ؟"

"جی ہاں" عالیہ نے تائید کی۔

"تم کہہ رہی تھیں کہ آرٹیکل ساتھ لے جاؤں گی۔"

"لانے والی تھی لیکن پھر رہنے دیا۔ یہ کوئی انجان تو نہیں....... سب کچھ جانتے ہیں بلکہ میرے خیال میں ہم سے زیادہ جانتے ہوں گے۔"

"بھئی! اگر جانتے ہو تو پھر کیوں اڑے ہوئے ہو؟" اکرام نے مجھ سے سوال کیا۔

"اکرام صاحب، میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں ہلکی سی غیریت آگئی تھی۔

معلوم نہیں اکرام نے اس غیریت کو محسوس کیا یا نہیں لیکن عالیہ نے فوراً کرلیا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔

اگلے ڈیڑھ دو ہفتے میں آپریشن کے سلسلے میں میرے انکار اور اہل خانہ کے اصرار نے مزید سنگین شکل اختیار کرلی۔ میں نے ایک دن صاف صاف الفاظ میں دھمکی دے دی کہ اگر آپریشن کے سلسلے میں مجھے مجبور کیا گیا تو میں کچھ کر بیٹھوں گا۔ اس دھمکی کا لب ولہجہ اتنا دوٹوک اور فیصلہ کن تھا کہ اہل خانہ دم بخود رہ گئے۔ والد صاحب تو سخت ناراض ہوگئے اور میرے علاج کے معاملے سے مکمل لاتعلقی کا اظہار کردیا۔ بہنیں بھی رودھو کر چپ ہوگئیں۔ والدہ میرے خبط اور مستقل مزاجی سے آگاہ تھیں۔ انہوں نے اہل خانہ کو مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لئے اس معاملے کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ ایک دو ماہ میں میرا رویہ تبدیل ہوجائے۔

مری میں ہمارا مکان قریباً مکمل ہوچکا تھا۔ میری والدہ مجھے لے کر مری آگئیں۔ ایک ملازم بھی ساتھ تھا۔ میری حالت روز بروز دگرگوں ہو رہی تھی۔ نچلا دھڑ تو مفلوج تھا ہی، کندھوں کے درمیان اور گردن کے پیچھے بھی شدید درد رہتا تھا۔ کبھی میں رات رات بھر جاگتا رہتا۔ بھوک بھی کم سے کم ہوتی جارہی تھی۔ شاید یہ درد کش دواؤں کا اثر تھا

لیکن عجیب بات تھی' ان ساری اذیتوں کے باوجو میرا تخلیقی موڈ خراب نہیں ہوا تھا۔ میں کاغذ سامنے رکھ کر قلم سنبھالتا تو عالیہ اپنی تمام تر رعنائی اور نارسائی کے ساتھ میرے سامنے مجسم ہوجاتی۔ اس کی دلکش ہنسی' اس کے گداز ہونٹ' اس کی سحرکار آنکھیں' اس کا لچکتی شاخ سا بدن۔ سب کچھ الفاظ کا روپ دھارتا اور میرے قلم میں سما کر صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتا۔ جذبے کی شدت ان الفاظ کو آگ میں تپا کر کندن بنا دیتی......... میں زیادہ تر انگریزی میں لکھ رہا تھا اور میری لکھی ہوئی اکثر چیزیں امپیکٹ گروپ کے گانوں کی شکل میں عام لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ "تضاد" نامی نظم کے بعد "شاید ہم پھر ملیں گے" کو بھی زبردست مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اور ان گانوں کی لاتعداد کاپیاں فروخت ہوچکی تھیں۔ اشرف کمال میرے کام سے بہت خوش تھا۔ قریبا ہر روز مجھے فون کرتا تھا۔ کبھی لندن سے کبھی کیلی فورنیا سے' کبھی مونٹریال سے۔ وہ معاوضے کے ساتھ ساتھ رائلٹی کی رقم بھی باقاعدگی سے بھجوا رہا تھا۔ یہ رقم میرے لاہور کے بینک اکاؤنٹ میں جمع ہوجاتی تھی۔ ایک دن بینک کی "بیلنس شیٹ" مجھ تک پہنچی تو میں ششدر رہ گیا۔ میرا بینک بیلنس بڑی سرعت سے بڑھ رہا تھا۔

جو کامیابیاں مجھے مل رہی تھیں وہ خاصی نمایاں تھیں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ میرے دل و دماغ میں تو بس ایک انتظار کا موسم ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک بے نام انتظار' ایک نامعلوم آس۔

پھر ایک روز وہ سب کچھ ہوگیا جو میں چاہتا تھا۔ وہ اکتوبر کی ایک اداس شام تھی۔ سرد اور خاموش۔ یہ وہ موسم ہوتا ہے جب ہل اسٹیشن ویران ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ میدانی علاقے اپنی رونقیں واپس لینے لگتے ہیں جو انہوں نے موسم گرما کے لئے کوہساروں کو مستعار دی ہوتی ہیں۔ میں اپنے کمرے میں بے حرکت لیٹا تھا۔ میری نگاہیں کھڑکی سے باہر اڑتے ہوئے پتوں کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اچانک اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"السلام علیکم۔"

میں اتنا حیرت زدہ تھا کہ سلام کا جواب بھی نہ دے سکا۔

وہ مجہول سی میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ سادہ لباس میں تھی۔ بالوں کی ایک طویل لٹ خم کھا کر رخساروں کو چھو رہی تھی۔ حسب عادت بات کرنے سے پہلے وہ اپنے طلائی کنگن کو کلائی میں گھمانے لگی "کیا حال ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

چند لمحے ایک گمبھیر خاموشی کمرے میں طاری رہی' پھر اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "ایسا کیوں کر رہے ہیں آپ؟"

"تمہیں یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی تمہیں ایک غیر مرد کے کمرے میں یوں آنا چاہئے۔"

"آپ...... کس کو سزا دے رہے ہیں؟ خود کو......... اپنے والدین کو......... یا مجھے؟"

"میں خود کو سزا دے رہا ہوں۔"

"کس جرم میں۔ کیا کیا ہے آپ نے؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"بہت بڑا جرم کیا ہے۔ میں نے تمہیں چھونے کی کوشش کی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ میرے ہاتھ لگ گئے تو تم سونے سے مٹی بن جاؤ گی۔ میرا گناہ بہت بڑا تھا۔ تم نے مجھے زینوں سے گرا کر بڑی رعایت کی ہے مجھ سے......... میں تو اس قابل تھا کہ اسی جگہ میری گردن مار دی جاتی۔"

وہ ایک دم آبدیدہ ہوگئی "ندیم! وہ سب اچانک ہوگیا۔ خدا گواہ ہے' میں نے آپ کو دھکیلا نہیں تھا۔ میں ایسا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ آپ کو کیا پتا ہے' میں کتنا پچھتائی ہوں' کتنا روئی ہوں آپ کی تکلیف پر...... میرے بس میں ہو تو میں اپنی جان دے کر آپ کی تکلیف کا مداوا کردوں۔"

"میرا خیال ہے......... میری تکلیف اب مداوے کی حد سے گزر چکی ہے۔" میں نے کہا اور کروٹ بدلنے کی ناکام کوشش کی۔

سارے جسم کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں۔ ہڈیوں کے سوا اور رہ بھی کیا گیا تھا میرے جسم میں شاید کپل دستو کے بدھا کی طرح میرا عشق بھی برگد تلے بیٹھے بیٹھے ڈھانچا بن گیا تھا۔

میری حالت دیکھ کر وہ کراہ اٹھی۔ نجانے اسے کیا ہوا کہ اس نے میرے استخوانی ہاتھ پکڑ کر اپنے شانوں پر رکھ لئے۔ سسک کر بولی "یہ لیں......... چھولیں مجھے۔ یہی چاہتے

تھے نا آپ؟ یہی ضد تھی نا آپ کی؟"

میں لرز کر رہ گیا۔ میرے دونوں ناتواں ہاتھ عالیہ کے گداز شانوں پر تھے اور عالیہ کے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو گرفت میں لے رکھا تھا...... ہاں میں چھو رہا تھا اسے۔ وہ بڑا ہی ڈرامائی لمحہ تھا۔ وہ میری طرف جھک آئی تھی۔ اس کا آنچل ڈھلک گیا تھا۔ شفاف گردن سے چھوتے ہوئے گیسو مجھ سے ایک بالشت کی دوری پر تھے۔ ایک جانی پہچانی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور ایک ساعت کے لئے مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ ایک میکانکی حرکت کے تحت میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ میرے سینے سے آ لگی۔ میرے بازوؤں کی نقاہت اجازت نہیں دے رہی تھی ورنہ میں اسے اتنی زور سے بھینچتا کہ وہ میرے اندر سما جاتی۔ مجھے یاد نہیں' ان لمحوں میں کیا ہوا تھا۔ عالیہ نے ہلکی سے مزاحمت کی تھی۔ یا بالکل نہیں کی تھی' وہ رو رہی تھی یا شاید خاموش خاموش ہوگئی تھی۔ اس کی سانس بہت تیزی سے چل رہی تھی یا شاید وہ میری ہی سانس تھی۔ میں نے اپنی انگلیاں اس کی زلفوں کے ریشم میں ڈوبتی ہوئی محسوس کی تھیں۔

پھر وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو ستارے بن کر چمک رہے تھے۔ تب اس نے رخ پھیرا تھا اور باہر نکل گئی تھی۔

مجھے لگ رہا تھا جیسے میں حالت خواب میں ہوں۔ میں نے بلند آواز میں والدہ کو پکارنا شروع کیا لیکن وہ شاید سو رہی تھیں۔ ملازم قدوس' لوئر مری سودا سلف لینے گیا ہوا تھا۔ میں بستر پر دم بخود لیٹا رہا اور اس بے پایاں حیرت و مسرت کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا جو مجھے ابھی میسر آئی تھی۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف عالیہ تھی۔ وہ آنسوؤں سے بوجھل آواز میں بولی "ندیم! میری بات مان لیں۔ آپ آپریشن کروالیں۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے اس سے پوچھا "میں کیا کروں گا زندہ رہ کر۔"

"آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے۔"

"کس کے لئے؟"

"بہت سے لوگوں کے لئے۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

ایک دم میرے سینے میں شادیانہ بج اٹھا۔ اس شادیانے کی گونج میں مجھے ہر شے ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☆-------------☆-------------☆

میرے دل میں تندرست رہنے کی آرزو پیدا ہوئی تو سارے مرحلے آسان ہوتے چلے گئے۔ ماموں جان مجھے اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئے۔ لندن کے ایک اسپتال میں میرا "اسپائنل کینال" کا آپریشن ہوا۔ وہ ڈسکس ٹھیک مقام پر ایڈجسٹ کی گئیں جنہوں نے زیریں جسم تک جانے والے اعصاب کو کچل رکھا تھا۔ آپریشن کے صرف دو تین روز بعد میں نے ٹانگوں کو حرکت دینا شروع کردی تھی۔ دو ہفتے کے اندر اندر میں سہارے سے اور پھر سہارے کے بغیر چلنے لگا۔ میڈیکل ٹریٹ منٹ کے ساتھ ساتھ فزیو تھراپی بھی جاری تھی۔ تین چار مہینے میں میں قریبا قریبا نارمل محسوس کرنے لگا۔ صرف بائیں ٹانگ میں تھوڑی سی کمزوری محسوس ہوتی تھی لیکن یہ کمزوری چال میں ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ ہاں بھاگنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ یہ بڑی زبردست "ری کوری" تھی۔ میں ڈاکٹروں کے اندازے سے دو ماہ پہلے آسانی سے چلنے پھرنے لگا تھا۔ ٹھیک ہونے کے بعد بھی میں چار مہینے انگلینڈ میں ہی رہا۔ یہاں اشرف کمال سے بھی طویل نشستیں ہوئیں۔ وہ اپنے نئے البم کی ابتدائی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس البم کے نصف گانے میرے لکھے ہوئے ہوں۔ اس نے ایک بھاری معاوضے کی پیشکش بھی کردی تھی۔ معاوضہ میرے لئے کبھی بھی اہم نہیں رہا تھا بہرحال انٹرنیشنل لیول پر اپنے کام کی پروجیکشن میرے لئے بھی پرکشش تھی۔ اشرف کمال نے انگلینڈ میں مجھے میرے بہت سے پرستاروں سے بھی ملایا۔ ان میں مردوزن' بچے بوڑھے' سبھی شامل تھے۔ دو تین لڑکیوں نے مجھ میں خاص قسم کی دلچسپی لی۔ ان میں سے ایک لڑکی کا نام جینفر تھا۔ وہ ٹین ایجر لڑکی ہوش و خرد تباہ کردینے والی خوب صورتی کی مالک تھی۔ ہم میں دوستی ہوگئی۔ کچھ وقت ہم نے اکٹھے بھی گزارا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ لڑکیاں پہلے بھی میری زندگی میں آچکی تھیں۔ جینفر بھی آئی اور خوب آئی لیکن میرے دل و دماغ میں جو مقام عالیہ کا تھا وہ کسی اور کا نہیں تھا۔ نہ کبھی پہلے تھا' نہ اب ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ عالیہ سے میرا تعلق رومانس سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے۔

انگلینڈ میں قیام کے دوران میں مجھے عالیہ اور اس کے حالات کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ میں نے عالیہ کی سہیلی صوفی کے پتے پر ایک دو خط بھی لکھے لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر میں نے عالیہ کو فون کرنے کی متعدد کوششیں کیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ لگتا تھا کہ فون مستقل طور پر بند پڑا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے' وہ فروری کی ایک یخ بستہ دوپہر تھی جب میں صحت یابی کے بعد انگلینڈ سے پاکستان واپس پہنچا تھا۔ ان دنوں عید کی آمد آمد تھی۔ میری فلائٹ اسلام آباد ایئرپورٹ پر آئی تھی۔ میں براستہ سڑک لاہور آنا چاہ رہا تھا لیکن والد صاحب نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کو فون کیا تھا' اس نے ایک رات کے لئے میرے قیام کا انتظام اسلام آباد کے ایک اچھے ہوٹل میں کر دیا تھا۔

شام سات بجے میں ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں پہنچا اور کھڑکیوں سے دیکھا تو دور شمال کی جانب مری کی بلند و بالا چوٹیاں نظر آئیں۔ وہی چوٹیاں جہاں اکرام لاج تھا اور جہاں عالیہ تھی۔ میں عالیہ سے کتنا قریب آکر بھی کتنا دور تھا۔ میرا جی چاہا اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ اس صورت کو دیکھوں جو میرے دل کا داغ تھی......... لیکن یہ جلد بازی کسی طور مناسب نہیں تھی۔ مجھے یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ پورے آٹھ ماہ بعد میں واپس لوٹا تھا۔

میں ڈرنک نہیں کرتا تھا' لیکن انگلینڈ میں قیام کے دوران میں یہ عادت پڑ گئی تھی۔ اس میں تھوڑا بہت ہاتھ اشرف کمال کا بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مے نوشی سے پرہیز کر کے میں شاعری کو "بدنام" کر رہا ہوں۔ وہ مجھے جن پارٹیوں اور فنکشنز میں لے جاتا رہا تھا وہاں شراب پانی کی طرح پی جاتی تھی......... بہرحال میں نے جتنی مرتبہ بھی پی تھی' ناپ تول کر پی تھی۔

اسلام آباد کے اس خوبصورت ہوٹل کے آرام دہ کمرے سے باہر موسم اتنا دل گداز تھا کہ میرے ہاتھ خود بخود ساغر و مینا کی طرف بڑھ گئے۔ میں کھڑکی میں بیٹھ کر اپنا ہی گانا "شاید ہم پھر ملیں گے" بار بار سنتا رہا۔ گولڈ لیف کے سگریٹ پھونکتا رہا اور آتشیں سیال کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہا۔ آٹھ بجے میں ڈنر کے لئے ڈائننگ ہال میں آگیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ایک خوبرو لڑکی پر نگاہ پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ میں اسے

جانتا تھا۔ وہ عالیہ کی ایک دیرینہ کرسچین فرینڈ مارگریٹ تھی۔ میں نے ایک دوبار مری میں اسے اکرام لاج سے نکلتے بھی دیکھا تھا۔ وہ یہاں استقبالیہ پر ڈیوٹی انجام دے رہی تھی۔ میں مارگریٹ کے پاس پہنچا۔ تھوڑی سی دقت کے ساتھ وہ بھی مجھے پہچان گئی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد میں نے اس سے عالیہ کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ بولی۔ "کافی دن ہوئے اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ویسے آج کل وہ اسلام آباد میں ہی ہے۔"

"کہاں؟"

اس نے اپنی چھوٹی سی ٹیلیفون انڈکس کھولی اور عالیہ کا ایڈریس اور فون نمبر مجھے لکھوا دیا۔ میں نے پوچھا "عالیہ کیسی ہے؟"

"کوئی تین ماہ پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔" مارگریٹ نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں نے مارگریٹ کا شکریہ ادا کیا اور کھانا کھائے بغیر کمرے میں واپس آگیا۔

عالیہ میرے اس قدر قریب تھی اور میں اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ جی چاہا ابھی ٹیکسی پکڑوں اور اس کے ایڈریس پر پہنچ جاؤں۔ لیکن پھر میں نے اسے فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اس کے نمبر ڈائل کئے۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر اکرام کی آواز سنائی دی تو بات کئے بغیر فون بند کر دوں گا۔

رابطہ قائم ہوا تو دوسری طرف سے کسی ادھیڑ عمر عورت کی آواز ابھری "ہیلو' کون بول رہا ہے؟"

میں نے پوچھا "عالیہ گھر پر ہیں؟"

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"مم...... میرا نام ندیم ہے۔ ندیم احسان۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ میں مختلف اندازے لگا رہا تھا کہ بولنے والی کون ہے۔ شاید عالیہ کی ساس تھی۔ چند لمحے بعد عالیہ کی دلنشین آواز میرے کانوں میں پڑی "ہیلو!"

"ہیلو میں ندیم بول رہا ہوں عالی۔"

"اوہ گاڈ۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔ کیا واقعی یہ آپ ہیں؟"

"ایک سو دس فیصد" میں نے کہا۔

"آپ لاہور سے بول رہے ہیں؟"

"تمہارے بالکل پاس سے۔ اسٹار ہوٹل اسلام آباد سے۔"

"بڑے بے پروا ہیں آپ۔ نہ جانے کا پتا دیا نہ آنے کا...... اتنے مہینے گزر گئے، فون تک نہیں کیا۔ یقین کریں میں بہت پریشان تھی۔ ایک دو دفعہ آپ کے گھر بھی فون کیا۔ شاہین سے سرسری بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ آپ کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔ اب سہارے کے بغیر چلتے پھرتے ہیں آپ...... اس کے بعد کچھ پتا نہیں۔ یقین کریں، میں آپ کی طرف سے بہت فکرمند تھی۔"

"یہ فکرمندی تم اب دور کر سکتی ہو بلکہ ابھی دور کر سکتی ہو۔ میں یہاں کمرا نمبر ۱۱۲ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"لل...... لیکن اس وقت۔"

"ابھی تو ساڑھے آٹھ ہی بجے ہیں۔ تمہاری سہیلی مارگریٹ یہاں استقبالیہ میں ہے۔ تم اس سے ملنے آ سکتی ہو۔"

"ارے ہاں...... یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" عالیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر ذرا توقف سے بولی "کیا مارگریٹ ڈیوٹی پر ہے؟"

"ہاں۔ ابھی اس سے مل کر آ رہا ہوں۔ اسی سے تو فون نمبر ملا ہے۔"

چند لمحے بعد عالیہ کی متذبذب آواز سنائی دی "اچھا...... میں...... کوشش کرتی ہوں۔"

"کوشش نہیں بھئی۔ اگر آ سکتی ہو تو بتاؤ ورنہ مجھے سولی پر مت لٹکاؤ۔"

"اچھا...... لیکن...... اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ میں آتی ہوں۔"

"آئی ایم ویٹنگ فار یو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے عالیہ سے ملاقات ہو سکے گی۔ لگتا تھا کہ میری طرح وہ بھی انتظار کی آگ میں جلتی رہی ہے۔ ہر صبح مجھے بھول جانے کا عہد کرتی رہی ہے اور ہر شام اس عہد کو بھولتی رہی ہے۔ میرے انگلینڈ روانہ

ہونے سے پہلے جو چنگاری اس کے دامن دل پر گری تھی، وہ مری کے طویل برفانی موسم کا مقابلہ کر کے الاؤ بن چکی تھی۔ میں سینے میں خوش گوار دھڑکنوں کو سمیٹے صوفے پر نیم دراز رہا اور وہسکی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ فرط شوق نے میری سدھ بدھ بھلا رکھی تھی اسپیکٹ گروپ کے سنگرز، کورس کے انداز میں میرے لکھے ہوئے بول دہرا رہے تھے۔ دھواں دھار موسیقی میں یہ بول ڈوب ڈوب کر ابھر رہے تھے اور کیسٹ پلیئر سے نکل کر کمرے میں گونج رہے تھے۔

"شاید ہم پھر ملیں گے" مفہوم کچھ یوں تھا۔

شاید ہم پھر ملیں گے
کسی انہونی کے بطن سے
ایک گلابی شام جنم لے گی
کسی معجزے کی شاخ پر
ملاقات کا پھول کھلے گا
راستے دیوار ہیں
نارسائی کا راج ہے
مگر دل میں گماں سا ہے
کچھ نہ کچھ ہو جائے گا
مرنے سے پہلے ایک بار
شاید ہم پھر ملیں گے

دروازہ کھول کر عالیہ اندر آئی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ معلوم نہیں لباس کی وجہ سے وہ زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی یا اس کی وجہ سے لباس زیادہ خوبصورت نظر آ رہا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دونوں اتنے غیر معمولی نہ ہوں۔ میری آنکھوں میں تیرتے ہوئے نشے نے انہیں اضافی خوب صورتی دے دی ہو۔ عالیہ کے ہاتھوں پر مہندی اور کلائیوں میں چوڑیاں عید کی آمد آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔ انگلینڈ کی روشنیوں میں چندھیائی ہوئی آنکھوں کو یہ دھیما دھیما مشرقی انداز مبہوت کر گیا۔

ڈرنک کے لوازمات تپائی پر ہی پڑے تھے۔ میں نے انہیں ہٹانے کی کوشش نہیں

کی تھی۔ اس نے تپائی دیکھنے کے بعد مجھے مصنوعی خفگی سے گھورا پھر مسکرا کر بولی "واٹ از گوئنگ آن ہیئر؟"

"تمہارے انتظار کا وقت تو کاٹنا تھا۔"

"تو انگلینڈ میں اسی طرح وقت کٹتا رہا ہے؟"

"اس سے بھی بری طرح۔" میں نے کہا۔

معلوم نہیں یہ جرات رندانہ تھی یا اس طویل جدائی کا رد عمل جو میں نے عالیہ کے حوالے سے کاٹی تھی۔ میرے ہاتھ بے اختیار اٹھ کر اس کے شانوں پر آگئے۔ وہ ذرا سی ٹھٹکی پھر میرے بازوؤں میں بہہ کر سینے سے آ لگی۔ میں نے کبھی عالیہ سے نہیں کہا تھا کہ میں کوئی جوگی عاشق ہوں اور اس سے بے لوث محبت کرتا ہوں۔ میں ایک عام انسان تھا بلکہ شاید عام انسانوں سے بھی زیادہ خواہشیں رکھتا تھا۔ میں عالیہ کو تمام جسمانی و روحانی شدتوں کے ساتھ چاہتا تھا۔ میرے نزدیک میری محبت ایک مکمل اکائی تھی اور اس میں کسی عنصر کی کمی مجھے قبول نہیں تھی۔

وہ ہوشربا گھڑیاں تھیں۔ کچھ دیر کے لئے ہم سب کچھ بھول گئے۔ ایک مہربان گداز تھا جو میرے زخم زخم جسم کو مرہم بن کر چھو رہا تھا۔ ایک خوشبو تھی جو میری رگ جاں میں اتر رہی تھی اور ایک تپش تھی جو میرے ہونٹوں کے راستے میرے سینے کے برفستان تک پہنچ رہی تھی اور چشموں کی نمو کر رہی تھی۔ ان مدہوش لمحات میں بھی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا' یہ کیسی لڑکی ہے؟ کیوں ہے اس کی عام سی شکل و صورت میں اتنی کشش؟ کیوں مجھے یہ لگتا ہے کہ وہ میرے جسم کا ایک گمشدہ حصہ ہے۔ شاید ہم ایک "جگ سا" کے دو ٹکڑے تھے' جنہیں فطرت نے اربوں کھربوں سال پہلے ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ آج یہ ٹکڑے آپس میں مل رہے تھے۔ ان کے خطوط' پیچ و خم ایک دوسرے پر منطبق ہو رہے تھے۔

وہ میرے لئے بنی تھی' صرف میرے لئے۔ میں اس کے لئے بنا تھا' صرف اس کے لئے...... نجانے کتنی دیر ہم وہیں ایک دیوار کے سہارے کھڑے کھڑے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہے تھے۔

وہ مجھ سے جدا ہوئی تو اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ "یقیناً آنکھوں میں بھی سرخ گلابوں کا رنگ اترا ہوا تھا لیکن میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس رنگ کو غلافی پلکوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی سانسوں کی طرح اس کا لباس بھی بے ترتیب تھا۔ اپنے سانسوں اور اپنے لباس کی طرح وہ خود بھی بے ترتیب تھی...... یہ بے ترتیبی مجھے تو اچھی لگ رہی تھی شاید اسے بھی لگ رہی ہو۔ ہم صوفوں پر آبیٹھے۔ میری نگاہیں مسلسل اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ پہلے تو کچھ متذبذب رہی پھر اس کی آنکھوں میں شوخی ابھری۔ مدافعانہ کارروائی کے طور پر اس نے پرس سے "پف پاؤڈر بکس" نکالا اور ڈھکن کھول کر آئینہ میرے سامنے کر دیا۔ میرے رخساروں پر' ہونٹوں پر اور ٹھوڑی پر لپ اسٹک کے بت سے داغ تھے۔

میں رومال سے چہرہ پونچھنے لگا۔ عالیہ کی توجہ کیسٹ پلیئر پر مرکوز ہو گئی۔ گانا ابھی تک بج رہا تھا "شاید ہم پھر ملیں گے"

"یہ آپ ہی کا گانا ہے نا؟" عالیہ نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"بس چل گیا نا۔ میں نے ایک البم خریدا تھا۔ اس پر آپ کا نام موجود تھا۔ آپ کے سارے گانے میرے پاس موجود ہیں اور وہ گانا "تضاد" بھی' جس میں آوازوں کا ذکر ہے۔ ویسٹرن اسٹائل آرکسٹرا میں ڈھولک کی آواز بڑی خوبصورتی سے مکس کی گئی ہے۔ ہر سننے والے کو پسند آئی ہے۔"

"پتا ہے وہ ڈھولک کہاں سے آئی ہے؟"

"کہاں سے؟"

"تمہاری مہندی کی رات سے۔ جس شب وہ ڈھولک بجی تھی' اسی شب میں نے یہ نظم لکھی تھی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اب یہ باتیں ناشکری کے زمرے میں آئیں گی۔ آؤ اب نئی باتیں کریں۔"

ہم نئی باتیں کرنے لگے۔ اپنے ماحول کی...... اردگرد کی۔ گزرے ہوئے آٹھ مہینوں کی۔ ان باتوں سے مجھ پر کئی انکشافات ہوئے۔ ان میں سب سے بڑا انکشاف یہ تھا کہ راجا اکرام سے عالیہ کی علیحدگی ہو چکی تھی۔ دونوں پڑھے لکھے تھے۔ دونوں نے بالآخر

دانش مندی کا ثبوت دیا تھا اور ایک جگہ بیٹھ کر یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اکٹھے زندگی نہیں گزار سکتے۔ اس علیحدگی میں عالیہ کے گھر والوں کی مرضی شامل نہیں تھی۔ اس کے خیالات یکسر مختلف تھے۔ عالیہ کی والدہ چاہتی تھی کہ عالیہ طلاق کا داغ ماتھے پر نہ سجائے۔ جیسے بھی اور جس طرح بھی ممکن ہو وہ شوہر کے ساتھ گزارہ کرے۔

لیکن عالیہ ڈیڑھ دو برس میں جو کچھ دیکھ اور جان چکی تھی اس کے بعد اپنا فیصلہ بدلنا اس کے لئے آسان نہیں تھا۔ میرے خیال میں اگر عالیہ اس جرات مندانہ فیصلے تک پہنچی تھی تو اس میں کچھ کردار میرا بھی تھا۔ اپنے مفاد کی خاطر ہی سہی لیکن میں نے اس کے ذہن میں ناروا حالات کے خلاف مزاحمت کا جذبہ ابھارا تھا۔ کوشش کی تھی کہ وہ اس طوائف باز شوہر سے مفاہمت کرنے اور اس کی بے زبان باندی بننے سے بچ جائے۔ میرا یہ اقدام غلط تھا یا صحیح، مجھے اعتراف ہے کہ میں نے یہ سب کچھ کیا تھا۔

شوہر سے علیحدگی کے بعد عالیہ واپس لاہور نہیں گئی تھی بلکہ اسلام آباد میں اپنی ایک خالہ کے پاس رہائش پذیر ہوگئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے فون پر جو آواز سنی تھی وہ اس کی خالہ ہی کی تھی۔ عالیہ نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا دوسالہ کورس کر رکھا تھا۔ اس شعبے میں اسے موروثی مہارت بھی حاصل تھی۔ اپنے ڈپلومے کی وجہ سے اسے ایک اچھی فرم میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ لاہور میں اہل خانہ کے ساتھ اس کے تعلقات بتدریج بہتر ہو رہے تھے۔ والدہ یہاں آکر ایک دوبار اس سے مل بھی چکی تھیں۔

.... حالات کی کروٹ سراسر میرے حق میں تھی "شاید ہم پھر ملیں گے" والے خواب کو تعبیر مل رہی تھی۔ عالیہ اور میں اپنا سفر نئے سرے سے شروع کرسکتے تھے۔ اس سفر کی یہ شروعات کتنی سہانی تھی۔ ایک جگمگاتی رات میں ہوٹل کے ایک انتہائی شان دار کمرے میں عالیہ اور میں تنہا تھے اور کھڑکیوں سے باہر دور نیم تاریکی میں مری کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں........ لیکن ایک دم نجانے کیا ہوا۔ میرے اندر کوئی چیز بجھ سی گئی۔ یکایک ہر شے بے معنی اور غیر دلچسپ سی ہوگئی........ یہ بالکل وہی کیفیت تھی جو بہت عرصہ پہلے مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ میں نے دن رات تڑپ کر عالیہ کے خط کا انتظار کیا تھا اور جب ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر وہ مجھے خط لکھنے پر آمادہ ہوگئی تھی تو میرا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

یہ کیسی کج روی تھی، یہ کیسا مدوجزر تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ عالیہ سراپا خود سپردگی میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں اس سے دور جاچکا تھا۔ میں عالیہ کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے ایک نہایت شکم سیر شخص لذیذ کھانے کو دیکھتا ہے۔ عالیہ کا ہر ہر انداز گواہ تھا کہ وہ دیر تک میرے پاس بیٹھ سکتی ہے۔ مجھ سے باتیں کرسکتی ہے۔ میری بے تابیوں کا مداوا کرسکتی ہے لیکن بے تابیاں تو رہی ہی نہیں تھیں۔ سماعت مترنم آواز کی چاہ سے محروم ہوگئی تھی۔

آخر وہ لڑکی تھی اسے اپنی فطری نسوانیت اور گریزپائی کا بھرم بھی رکھنا تھا۔ اس نے جانے کی خواہش ظاہر کی، کہنے لگی۔ "میں خالدہ سے کہہ کر آئی تھی کہ عید کی شاپنگ کے لئے سہیلیوں کے ساتھ مل کر جانا ہے۔ اب دس بجنے والے ہیں، میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہئے۔"

میں نے بالکل رسمی انداز میں اسے رکنے کو کہا۔

وہ کچھ متحیر سی، کچھ خاموش سی اٹھ کھڑی ہوئی "نہیں اب چلنا چاہئے۔" اس کے سوا وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

میں نے کہا "میرا یہاں قیام ایک دن کا تھا لیکن میں کوشش کروں گا کہ کل کا دن بھی رک جاؤں۔ میں........ میں تمہیں دوپہر کے بعد فون کروں گا۔"

وہ زبردستی مسکرائی "اگر آپ واقعی فون کریں گے تو میں ضرور سنوں گی۔"

"تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"بہت سی باتوں کے لئے تو بہت سا وقت چاہئے اور میرے خیال میں آپ جلدی میں ہیں۔"

میں نے رسمی انداز میں نفی کی۔ ہمارے درمیان الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا اور وہ واپس چلی گئی۔

حسب توقع اگلے روز صبح سویرے میں لاہور چلا گیا۔ اپنا رویہ خود میری سمجھ سے بھی بالاتر تھا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا تھا میرے ساتھ۔

☆-------------☆-------------☆

میں تین چار ہفتے لاہور میں رہا۔ اس دوران میں میں نے صرف ایک بار عالیہ

سے ٹیلیفون پر بات کی اور وہ بھی بالکل سرسری انداز میں۔ عالیہ کے حوالے سے میں نے
بہت غور وخوض کیا تھا۔ بہت سے معاملات الجھے ہوئے تھے' بہرحال اتنی بات میری سمجھ
میں ضرور آگئی تھی کہ ہوٹل میں میں نے اچانک عالیہ سے سرد مہری کیوں اختیار کرلی تھی۔
یقیناً اس کی وجہ وہ اطلاع تھی جو عالیہ نے مجھے اپنے شوہر کے حوالے سے دی تھی۔ وہ
شوہر سے علیحدہ ہوچکی تھی۔ اس علیحدگی کے بعد میرے لئے یہ "چیلنج" بھی ختم ہوگیا تھا
کہ میں تمام رکاوٹوں کے باوجود عالیہ کو پھر سے اپنی طرف مائل کرلوں...... اسے اپنی
محبت کی طاقت سے یوں اپنی طرف کھینچوں کہ اس کے ازدواجی بندھن بھی اسے روک نہ
سکیں۔ جب یہ چیلنج ختم ہوگیا تھا تو عالیہ کے لئے میری بے پناہ طلب بھی کم ہوگئی تھی۔
کبھی کبھی تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا کہ مجھے عالیہ سے محبت ہے بھی یا
نہیں۔ یہ کیسی محبت تھی جس کی بنیاد ہی ضد اور من مانی پر تھی۔ محبت تو سراسر تسلیم و
رضا ہونی چاہئے۔ یہ کیسا جذبہ تھا جو ہمیشہ خود کو فاتح اور عالیہ کو مفتوح دیکھنا چاہتا
تھا...... لاہور میں قیام کے دوران میں ایک دن صبح سویرے میری کمر میں درد شروع
ہوگیا۔ مقامی ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے ریسٹ تجویز کیا ڈیڑھ دو ہفتے بستر رہنے کے باوجود
آرام نہیں آیا۔ ویسے کوئی تشویش کی بات نظر نہیں آتی تھی۔ انہی دنوں لندن سے بھی
فون پر فون آنے لگے۔ اشرف کمال مجھے بلا رہا تھا۔ وہاں کوئی زبردست قسم کا "گیٹ ٹو
گیدر" تھا۔ اس فنکشن میں مشہور انٹرنیشنل پاپ گروپ اور متعلقہ فن کار شامل ہورہے
تھے۔ اشرف کمال کا کہنا تھا کہ بہت سے لوگ مجھ سے ملنا اور مجھے دیکھنا چاہ رہے ہیں۔
اس نے باقاعدہ ٹکٹ ارسال کردیا تھا اور ہوٹل کی بکنگ بھی کرادی تھی۔

میں نے سوچا چلو فنکشن میں شرکت ہوجائے گی اور اپنے معالج سے بھی مل لوں
گا۔ پھر لندن جانے سے میرا ایک اور مسئلہ بھی حل ہوجاتا...... اس مسئلے کا تعلق عالیہ
سے تھا۔ نجانے کیوں میں عالیہ کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اس سے
دور چلا جاؤں۔

پاکستان آنے کے صرف دوماہ بعد ہی میں انگلینڈ واپس چلا گیا...... سب سے
پہلے ماموں جان کے ساتھ جاکر کمر کا معائنہ کروایا۔ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی۔ پھر
فنکشن میں شرکت کی۔ اس "گیٹ ٹوگیدر" میں پاپ میوزک کے بڑے بڑے نام موجود

تھے۔ موسیقار، گلوکار، شاعر' یہ جاکر خوشی ہوئی کہ ان میں کئی لوگ میرے نام سے واقف
تھے۔ میری پہچان کا بڑا حوالہ میرے دو گیت "تضاد" اور "شاید ہم پھر ملیں گے" تھے۔
اس کے علاوہ اسپیکٹ کے نئے البم میں بھی میرا لکھا ہوا ایک گانا بہت پسند کیا جارہا تھا۔
فنکار کے لئے داد و تحسین آکسیجن کی طرح ضروری ہوتی ہے۔ انگلینڈ جاکر جب
مجھے یہ داد و تحسین ملی تو جہاں بحیثیت پاکستانی میرا سر فخر سے بلند ہوا وہاں میرے اندر بہتر
سے بہتر کی خواہش بھی بیدار ہوئی۔ میں نے قدیم اور جدید انگلش پوئٹری کے حوالے سے
کئی کتابیں پڑھیں۔ خود کو میوزک کے جدید رجحانات سے روشناس کرانے کے لئے
میوزک لائبریری جانا شروع کیا۔ اس کے علاوہ ان حلقوں میں بھی اٹھنے بیٹھنے لگا جن کا
تعلق کسی نہ کسی طور ادب وفن سے تھا۔

اپنے گانوں سے مجھے توقع سے زیادہ آمدنی ہورہی تھی ہر ماہ کئی ہزار پاؤنڈ تو رائلٹی
ہی بن جاتی تھی۔ یہ ساری آمدن صرف اور صرف میری تھی کیونکہ اہل خانہ میں سے کوئی
بھی اس آمدن کو ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھا۔ خاص طور سے والد صاحب تو میرے بارے
میں کچھ سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔

اشرف کمال نے مجھے لندن کے ایک نسبتاً پرسکون علاقے میں فلیٹ لے دیا تھا۔
میں یہاں اطمینان سے اپنا تخلیقی کام کرسکتا تھا...... لندن آکر میری زندگی ایک نئی ڈگر پر
چل نکلی تھی۔ یہاں ہنگامہ تھا' روشنیاں تھیں' رنگ تھے۔ لڑکیاں تتلیوں کی طرح اردگرد
منڈلاتی تھیں۔ ان کے سیماب بدن' غارت گر ہوش و خرد تھے اور ان کی آنکھیں ایک
مکمل دعوت

یہ سب کچھ تھا...... ہاں یہ سب کچھ تھا لیکن میں اس سانولی سلونی لڑکی کو ابھی
تک نہیں بھولا تھا۔ وہ لڑکی جو عام تھی لیکن عام نہیں تھی۔ جس کے پیکر میں کہیں کوئی
ایسی کشش پوشیدہ تھی جو براہ راست میرے دل پر اثر کرتی تھی۔ یا پھر شاید وہی بات سچ
تھی۔ میں اور وہ اس "جگ سا" کے دو حصے تھے جو فطرت نے اربوں کھربوں سال پہلے
تخلیق کیا تھا اور جس کا نام "مردوزن" رکھا تھا۔

روز وشب کی گھنا میں کبھی کبھی اسکی یاد ایک برق کی طرح کوندتی تھی اور میری
نگاہ سے اوجھل ہوجاتی تھی۔ اس یاد میں اتنی شدت نہیں تھی کہ میں تڑپ جاتا لیکن ایسا

بھی نہیں تھا کہ میں اسے بھول جاتا۔ انہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود میں کوئی اچھی چیز نہیں لکھ پارہا۔ اپنی شاعری خود مجھے بھی اپیل نہیں کررہی تھی۔ لندن آکر مجھے بڑا موافق ماحول ملا تھا۔ معاشی اطمینان بھی تھا۔ دادو تحسین کے ڈونگرے بھی تھے۔ شعروسخن کے حوالے سے میرا مطالعہ اور تجربہ بھی وسیع ہوا تھا۔ پھر بھی کوئی کمی سی تھی جو واقع ہوگئی تھی۔ جیسے کسی نے کوئی بٹن دبا کر سینے میں گھپ اندھیرا کردیا ہو۔

انہی دنوں میں نے اپنی بہن شاہین کو ماموں کے ہاتھ ایک تحفہ بھیجا۔ یہ ایک ہیروں کا ہار تھا۔ کئی ہزار پاؤنڈ قیمت تھی۔ میں نے شاہین کو تاکید کردی تھی کہ وہ والد اور دیگر اہل خانہ کو ہار کی اصلیت نہ بتائے۔ بس یہ کہہ دے کہ معمولی قیمت کا ہے، کسی پرانی دوست نے دیا ہے۔ میں نے شاہین کو ایک خط بھی لکھا تھا۔ اس خط میں دیگر باتوں کے علاوہ عالیہ کا ذکر بھی تھا۔ میں نے شاہین سے پوچھا تھا کہ عالیہ آج کل کہاں ہے اور کیا کررہی ہے (لندن آئے ہوئے، مجھے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ اس دوران میں اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔)

چند روز بعد شاہین کا جوابی خط ملا۔ اس خط میں عالیہ کے بارے میں ایک حیرت انگیز انکشاف موجود تھا۔ شاہین نے لکھا تھا کہ عالیہ لاہور میں واپس آگئی ہے۔ اس کی خالہ بھی لاہور شفٹ ہوگئی ہے اور وہ اس کے پاس ہے۔ وہ بالکل بدل گئی ہے۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور بے سہارا یتیم لڑکیوں کے لئے ایک رفاہی ادارہ قائم کیا ہے، یہاں لڑکیاں بچکانا گارمنٹس تیار کرتی ہیں اور کشیدہ کاری وغیرہ بھی کی جاتی ہے۔ اس ادارے میں بے گھر لڑکیوں کے لئے طعام و قیام کا انتظام بھی تھا۔ عالیہ کے اس کام کو کافی سراہا گیا تھا اور اس کا "سہارا" نامی یہ ادارہ کافی مقبول ہوا تھا۔ شاہین نے ایک سہانجوڑ؟ اخباری تراشہ بھی بھیجا تھا۔ اس تراشے میں عالیہ کے رفاہی ادارے کے بارے میں تفصیلی آرٹیکل چھپا تھا۔ بچیوں اور نوجوان لڑکیوں کو مختلف مشینوں پر کام کرتے دکھایا گیا تھا۔ ان رنگین تصویروں میں عالیہ کی چند تصویریں بھی تھیں، وہ واقعی بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس نے سادہ سی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کے درمیان میں سے مانگ نکلی ہوئی تھی اور انہیں کھینچ کر باندھا گیا تھا۔ چہرہ میک اپ سے یکسر عاری تھا۔ تئیس چوبیس سال میں ہی وہ

پختہ عمر نظر آنے لگی تھی۔ لیکن اس کی مجموعی کشش میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا تھا۔ وہی کمان سا کسا ہوا جسم، لمبی شفاف گردن اور تیکھے نقوش۔ تصویروں میں عالیہ کے ساتھ دو تین سال کی ایک خوبصورت صاف ستھری بچی بھی نظر آتی تھی۔ شاہین نے خط میں اس کا نام پنکی بتایا تھا اور لکھا تھا کہ اس یتیم بچی کو عالیہ نے گود لیا ہے۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ عالیہ کے بارے میں میرا دیوانہ پن پھر شروع ہونے والا ہے۔ اس کی خوابیدہ محبت پھر پوری شدت سے انگڑائی لے کر بیدار ہورہی ہے۔ میں اسے بھولا ہوا تھا لیکن کہاں بھولا ہوا تھا۔ وہ تو میری رگ جاں میں میٹھے زہر کی طرح خون کے ساتھ سفر کرتی تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے جذبات میں کتنے نشیب وفراز آئیں، ان نشیب و فراز کے نتیجے میں میں عالیہ سے کتنا بھی دور بھاگوں، اسے بھول نہیں سکوں گا۔ ایک بار پھر میرے شب وروز کو بے قراری کا روگ لگ گیا۔ نجانے کیوں، کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ میرے اس روگ کا میرے تخلیقی اتار چڑھاؤ سے بھی گہرا تعلق ہے۔

میں اب اپنے رویے پر خود ہی جھنجلانے لگا تھا۔ میں سوچتا تھا میں عالیہ کے قریب جاکر بھی اس سے دور کیوں ہوجاتا ہوں۔ وہ کیا مجبوری ہے جو میری بے تابیوں کے آڑے آتی ہے اور میں اسے ہمیشہ کے لئے حاصل نہیں کرپاتا اور اگر یہ کج روی مجھ سے سرزد ہوہی جاتی ہے تو پھر میں اس کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟ کیوں بار بار اس کی زندگی کو شکست وریخت سے دوچار کرنے کے لئے حملہ آور ہوجاتا ہوں؟ ان سوالوں کا میرے پاس کوئی واضح جواب نہیں تھا اور نہ ان بے قراریوں کا کوئی جواز تھا جو روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔ میں اپنے پچھلے رویے پر شدید نادم تھا اور............ اس مرتبہ اپنی ہر کج روی کا ازالہ کردینا چاہتا تھا۔ میں عالیہ سے یوں ملنا چاہتا تھا کہ پھر اسے کوئی شکایت رہتی اور نہ مجھے کوئی حسرت۔ میں اسے ہمیشہ کے لئے اپنا کر اس کی ساری محرومیوں کو دور کردینا چاہتا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ کیا اس مرتبہ بھی وہ اپنی بانہیں میرے لئے کھول دے گی۔ کیا اب کی بار بھی وہ ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے میری طرف دوڑ پڑے گی۔ کیا ایسا ہوسکے گا۔ کیا میں ایسا کرسکوں گا؟

☆-------------☆-------------☆

میں لاہور واپس آگیا۔ یہاں کی گلیاں میری جانی پہچانی تھیں۔ مجھے ان میں پاپیادہ چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ لندن کے دلکش بازاروں اور شیشہ سڑکوں کی نسبت یہاں کی گرد میرے لئے زیادہ خوب صورت تھی۔ یہ عالیہ کا شہر تھا' یہ میرا شہر تھا۔ یہاں کی فضاؤں میں ہماری محبت کی خوشبو رچی بسی تھی۔ میں ایک بڑے آہنی گیٹ کے سامنے رکا۔ گیٹ کے اوپر قوس کی شکل میں ایک بورڈ آویزاں تھا۔ اس پر "سہارا فاؤنڈیشن" کے الفاظ لکھے تھے۔ گیٹ پر چوکی دار موجود تھا۔

میں نے کہا "میں مس عالیہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کس سلسلے میں"" چوکی دار نے پوچھا۔

"ریڈی میڈ کپڑوں کے سلسلے میں۔ انارکلی میں میری شاپ ہے' احسان گارمنٹس۔"

"اوہ اچھا۔" چوکی دار نے کہا "میڈم صاحب دفتر میں ہے۔ خوچے آپ ادھر صوفے پر بیٹھ جائے' ام ابھی آپ کو بلواتا ہے۔"

میں صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ یہ کافی بڑی عمارت تھی۔ بچیاں اور نوجوان لڑکیاں آجارہی تھیں۔ اندر کسی ہال کمرے سے سلائی مشینوں کے چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص دفتر کے دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اس کے جاتے ہی چوکیدار نے مجھے اندر بھیج دیا۔

میں اندر پہنچا تو عالیہ فون سن رہی تھی۔ کشادہ میز پر چند فائلیں رکھی تھیں۔ دیوار پر ریڈی میڈ کپڑوں کے ڈیزائن ڈسپلے کئے گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر عالیہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ بات مکمل کئے بغیر اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ آج ایک سال بعد میں پھر اس کے سامنے کھڑا ہوں۔

"تمہاری حیرت بجا ہے عالیہ!" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "میں جب بھی آتا ہوں' تمہیں حیران وپریشان کرنے کے لئے ہی آتا ہوں۔"

وہ خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں کے زیریں کنارے سرخ ہوگئے تھے۔ شاید وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کررہی تھی "اب آپ کیوں آئے ہیں یہاں؟ وہ اجنبی لہجے میں بولی۔

"وجہ بتانا ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے۔" اس کا لہجہ خشک و تلخ تھا۔

"ایک دفعہ تم نے کہا تھا کہ بس آنا پڑا۔ آج میں بھی یہی بات کہتا ہوں۔"

وہ بولی "دیکھئے ندیم صاحب! یہ میرا آفس ہے۔ میں یہاں صرف فاؤنڈیشن کے بارے میں بات کرتی ہوں۔"

"دیگر معاملات پر کہاں بات ہو سکتی ہے؟"

"میں آپ سے کسی معاملے پر بات کرنا نہیں چاہتی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ غالباً باہر جارہی تھی۔ میں نے ایک دم اس کا بازو تھام لیا۔ شاید اسے مجھ سے ایسی جرات کی توقع نہیں تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ وہ مجھ پر پھٹ پڑے گی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے کمال ضبط سے کام لیا۔ بڑی سرد نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی "اگر آپ کو کوئی بات کرنی ہے تو کل پانچ بجے "فائن کیفے" میں آجایئے۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ مجھے اس کا بازو چھوڑنا پڑا۔ وہ تند ہوا کے جھونکے کی طرح بغلی دروازے سے گزر کر چلی گئی۔

اگلے روز فائن کیفے کے ایک پرسکون گوشے میں ہماری ملاقات ہوئی۔ عالیہ کے ساتھ لے پالک بچی پنکی بھی تھی۔ یہ صاف ستھری بچی چھوٹی سی پونی ٹیل کے ساتھ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ وہ عالیہ کو ماما کہہ کر پکارتی تھی اور مسلسل اس کی گود میں اترنا چڑھنا جاری رکھے ہوئے تھی۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ عالیہ بچی کو دکھانے کے لئے خاص طور سے یہاں لائی ہے۔

عالیہ کا لب ولہجہ میری توقعات سے کہیں زیادہ اجنبی اور اٹل تھا۔ وہ بول نہیں رہی تھی' پتھر پر لکیر کھینچتی جارہی تھی "دیکھئے ندیم صاحب!" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "جو ہوگیا اسے بھول جانا ہی ہم دونوں کے لئے بہتر ہے۔ آپ تو بہت پہلے ہی بدل چکے ہیں لیکن اب میں بھی بدل چکی ہوں۔ اب میری زندگی کا ایک نصب العین ہے۔ ایک پروگرام ہے۔ میں اس نصب العین سے کسی صورت پیچھے نہیں ہٹ

سکی۔ میں نے اپنی زندگی ان بے آسرا بچوں کے لئے وقف کی ہے جنہیں آپ نے فاؤنڈیشن میں دیکھا ہے۔ آپ کو ان کی آنکھوں میں امید اور زندگی کی چمک نظر آئی ہو گی۔ اب یہ چمک مجھے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔"

میں نے کہا "عالیہ! میں تمہارے نصب العین کی راہ میں کہاں آ رہا ہوں۔ میں تو ایک مختلف بات کر رہا ہوں۔"

وہ بے رخی سے بولی "میں آپ کے منہ سے کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔"

"اپنے نصب العین کے بارے میں بھی نہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"اگر میں یہ کہوں کہ ہم دونوں مل کر اس نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نصب العین کو اور وسیع کرتے ہیں اور بڑھاوا دیتے ہیں۔"

"میں اس بات پر کبھی یقین نہیں کروں گی۔ معاف کیجئے گا' آپ صرف اور صرف اپنی غرض کے بندے ہیں اور انتہائی ناقابل اعتبار بھی۔ آپ کو اگر دنیا میں کسی چیز سے محبت ہے تو وہ صرف آپ کی اپنی ذات ہے۔"

"تم کچھ زیادہ تلخ نہیں ہو رہی ہو؟"

"میں نے آپ سے کہا کیا ہے ندیم صاحب! میرا منہ کھلوائیں گے تو آپ کو کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا پڑیں گی۔ بہتر ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کیجئے۔ میں امید کرتی ہوں کہ آئندہ آپ میری اور اپنی عزت کا خیال کریں گے۔ میں دوبارہ آپ سے ملنا نہیں چاہتی ہوں۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شولڈر بیگ سنبھالا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ بچی اس کے بازو سے لگی ہوئی تھی اور سارے معاملے سے بے پروا نظر آتی تھی۔ میں عالیہ کو روکنا چاہتا تھا لیکن آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

☆--------------☆--------------☆

ڈیڑھ دو ہفتے کے وقفے سے میں نے ایک بار پھر عالیہ سے رابطہ کیا۔ یہ رابطہ بھی فاؤنڈیشن کے دفتر میں ہوا۔ میں نے مختصر لیکن ٹھوس الفاظ میں بات کی......... اپنے سابقہ رویے کی غیر مشروط معافی مانگی اور تسلیم کیا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ میرا خبط اور

پاگل پن تھا۔ وہ ساری سچائی اور سارا اخلاص جو میرے دل میں موجود تھا' میں نے اپنے لہجے میں سمیٹ لیا اور کہا "عالیہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ باقی ماندہ زندگی کی ہر خوشی، غمی تمہارے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں کج ادا بھی ہوں' بے وفا بھی ہوں اور ناقابل اعتبار بھی۔ لیکن عالی' پھر بھی تم سے شدید محبت کرتا ہوں' اور میرے دل میں جو مقام تمہارا ہے وہ کسی اور کا نہیں۔ میں تمہیں اپنا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ دیتا ہوں۔ میں تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔ مجھے امید ہے تم مجھے زیادہ لمبے امتحان سے نہیں گزارو گی۔"

وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن آنسوؤں نے اس کے گلے میں پھندا سا لگا دیا تھا۔ اے خدا حافظ کہنے کے لئے یہ لمحہ بہت مناسب تھا۔ میں نے الوداعی کلمات کہے اور جلدی سے باہر نکل آیا۔

.........میں والد کے گھر نہیں رہ رہا تھا۔ علیحدہ گھر تھا اور اسی گھر کا فون نمبر وغیرہ میں نے عالی کو دیا تھا۔ مجھے یقین تھا میرے آتشیں جذبوں کی شدت ایک بار پھر عالیہ کو پگھلا دے گی۔ برف کتنی بھی ٹھوس ہو جائے' پتھر تو نہیں بن سکتی۔ مجھے قوی امید تھی کہ وہ خود نہ بھی آئی تو میری بہن شاہین یا اپنی سہیلی صوفی کے ذریعے مجھ سے رابطہ کرے گی یا پھر خط' فون وغیرہ کا سہارا لے گی......... مگر دن گزرتے گئے اور ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میری ہر گھڑی ایک امتحان تھی۔ فون کی گھنٹی بجتی تھی تو میں چونک جاتا تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک دل و جان میں زلزلہ برپا کر دیتی تھی۔ ہر آہٹ میری دھڑکن کے لئے مہمیز کا کام کرتی تھی' مگر جس کا انتظار تھا وہ مجھ سے کوسوں دور تھا۔ میں ہر آن ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور عالیہ کی گزشتہ مہربانیوں کو یاد کر رہا تھا۔ وہ رات بار بار میرے اندر پچھتاوے کی آگ بھڑکاتی تھی جب اسلام آباد کے ہوٹل کی اس ریشمی تنہائی میں عالیہ میرے لئے سراپا عنایت و خود سپردگی تھی۔ جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں میں وہ خود بھی ایک جگنو لگ رہی تھی۔ ایک ایسا جگنو جو میری مٹھی میں بند ہونے کے لئے میرے ہاتھ پر آ بیٹھا تھا۔ میں نے بے رخی سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس رات عالیہ کے چہرے پر نظر آنے والی حیرت آمیز مایوسی مجھے ابھی تک بھولی نہیں تھی۔ آہ......... اپنی نگاہوں میں خود کو کتنا غیر اہم محسوس کیا ہو گا اس نے......... کاش مجھ سے ایسا نہ ہوا ہوتا۔

عالیہ کے جاں گسل انتظار کے ان دنوں میں میں نے محسوس کیا کہ میرا رکا ہوا قلم پھر سے رواں ہوگیا ہے۔ لندن میں قیام کے دوران میں تخلیقی عمل جس تعطل کا شکار ہوگیا تھا وہ تعطل ختم ہوچکا تھا۔ میں بہت اچھی نظم لکھ رہا تھا۔ میرے اندر عالیہ کے لئے جو تڑپ اور پکار تھی وہ شاعری میں ڈھل رہی تھی۔ انہی دنوں میں نے "لمس" کے عنوان سے ایک گیت لکھا۔ محبت اور لمس کا باہمی تعلق اس گیت میں وضاحت سے بیان کیا گیا تھا' خاص طور سے مردوزن کی محبت کو لمس کے آئینے میں دیکھا گیا تھا۔ صنف نازک کی نزاکتیں' شیرینیاں اور گداز' مردانہ صنف کی خوبصورتی' حرارت اور بے تابی اور پھر ان صفات کا آپس میں دل نشین ملاپ' یہ سب کچھ اس گیت کے بولوں میں بیان کردیا گیا تھا۔ یہ میرے اب تک لکھے ہوئے تمام گیتوں میں سے زیادہ بولڈ اور واشگاف تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اسے "جذبات انگیز" قرار دیا جائے گا اور شاید اشرف کمال اسے "امپیکٹ" کے نئے البم کے لئے مناسب نہ سمجھے لیکن جب میں نے گیت اشرف کمال کے ایڈریس پر لندن فیکس کیا تو فوراً ہی جوابی فیکس آیا اور اشرف کمال نے گیت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔

بے شک میں اچھی شاعری کررہا تھا لیکن میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ ایک آگ تھی جو مجھے اندر ہی اندر جلارہی تھی۔ یہ عالیہ کے انتظار کی آگ تھی۔ میری شیو بڑھی رہتی تھی' نہ لباس کا ہوش تھا نہ کھانے پینے کا۔ کبھی کبھی تو پورا دن کھانا کھائے بغیر گزر جاتا۔ نیند بھی بہت کم رہ گئی تھی اور جو تھوڑی بہت آتی تھی وہ بھی تازہ دم کرنے کے بجائے بے دم کردیتی تھی۔ والد صاحب نے مجھ سے قطع تعلق کررکھا تھا لہٰذا دیگر اہل خانہ بھی مجھ سے میل ملاپ میں زیادہ گرم جوشی نہیں دکھاسکتے تھے۔ بہنیں ایک دو بار خاموشی سے آکر مل گئی تھیں۔ صرف شاہین تھی جو کبھی کبھی فون کرنے کی جرات کرتی تھی۔ وہ میرے حال دل سے آگاہ تھی۔ جانتی تھی کہ میں ایک بار پھر عالیہ کے جاں گسل انتظار میں مبتلا ہوں اور اندر ہی اندر گھل رہا ہوں۔ ایک روز وہ کہنے لگی کہ یونیورسٹی میں عالیہ کی سہیلی صوفی سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ صوفی سے میرے اور عالیہ کے بارے میں بات کرے۔ میں نے شاہین کو سختی سے منع کردیا اور تاکید کی کہ وہ کوئی بات نہیں کرے۔

صوفی "سہارا فاؤنڈیشن" کو چلانے میں عالیہ کی دست راست تھی......

فاؤنڈیشن کے لئے "فنڈ ریزنگ" میں بھی اس نے عالیہ کے ساتھ مل کر بہت کام کیا تھا۔ ایک دوبار میرا بھی دل چاہا تھا کہ عالیہ کے سلسلے میں صوفی سے بات کروں لیکن پھر میں نے یہ خیال رد کردیا تھا۔

وہ مئی کی ایک سرمئی شام تھی۔ آنگن کے باغیچے میں موتیے کے پھول مہکے تھے اور فضا خوشبو سے لد گئی تھی۔ عالیہ کا انتظار کرتے مجھے دو ڈھائی ماہ ہوچلے تھے۔ ان دو ڈھائی ماہ کا ہر پل میں نے سولی پر گزارا تھا۔ اس خوشبو بھری شام کو اچانک میری ہمت جواب دے گئی۔ میرا پندار ٹوٹا اور ریزہ ریزہ ہوگیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ عالیہ میرے پاس نہیں آئے گی۔ اب مجھے ہی اس کے پاس جانا پڑے گا۔ میرے جسم کا رواں رواں اس کا نام پکار رہا تھا اور اب یہ پکار مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتی تھی۔ پہلے میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر خود اس کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ اپنے گھر کے سامنے سے میں نے ٹیکسی پکڑی اور مسلم ٹاؤن کے اس بنگلے نما مکان پر پہنچ گیا جہاں عالیہ اپنی خالہ اور لے پالک بچی کے ساتھ رہتی تھی۔ شام کے قریباً آٹھ بج رہے تھے جب میں نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا "میں مس عالیہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ملازمہ نام پوچھ کر واپس چلی گئی۔ قریباً پانچ منٹ بعد مجھے دروازے میں عالیہ کی شکل نظر آئی۔ اس کا آدھا چہرہ دروازے کی اوٹ میں تھا اور وہ بالکل اجنبی لہجے میں بات کررہی تھی "جی فرمایئے۔"

"میں تم سے چند بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن میں آپ سے کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی۔"

یوں لگا جیسے وہ دروازہ بند کرنا چاہ رہی ہے' میں نے جلدی سے ایک پٹ تھام لیا "عالی پلیز...... ایک بار' مجھے چند باتیں کہنے کا موقع دے دو۔ اس کے بعد اگر کہو گی تو میں زندگی بھر تمہیں شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

"آپ کچھ بھی کہہ لیں' میرا فیصلہ وہی رہے گا جو اب ہے۔ بہتر ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

"اور اگر میں نہ جاؤں تو؟"

"پھر آپ کی عزت آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔" اس نے کہا اور جلدی سے دروازہ بند کردیا۔

میں اپنی جگہ گم صم کھڑا رہ گیا۔ پورے بدن میں سردی اور مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جس عالیہ کو میں جانتا تھا وہ یہ عالیہ نہیں ہے۔ کہاں گئی تھی وہ عالیہ؟ کہاں کھو دیا تھا میں نے اسے؟

چند لمحے میں اپنی جگہ مبہوت کھڑا رہا پھر میرا سکتہ ٹوٹنا شروع ہوا۔ مایوسی اور محرومی کی جگہ دھیرے دھیرے غم و غصے نے لے لی۔ ایک عجیب سی خود سردی اور ضد میرے رگ و پے میں پھیلنے لگی۔ میں نے سڑک پار کی۔ عالیہ کے گھر کے عین سامنے ایک سرسبز تکون تھی۔ یہ چھوٹا سا باغیچہ تھا جس میں دو ٹوٹے جھولے لگے تھے۔ میں یہاں گھاس پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پھونکنے لگا۔ اپنے خستہ حلیے کے ساتھ یقیناً میں کوئی نشے باز ہی نظر آرہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ سنسان اندھیرے میں فقیروں کی طرح بیٹھا ہوا یہ شخص ندیم احسان ہے جس کے لکھے ہوئے الفاظ سونے چاندی میں تولے جارہے ہیں اور کروڑوں سماعتوں میں رس گھول رہے ہیں۔ ایک جانکاہ تپش تھی جو میرے جسم میں پھیلی ہوئی تھی اور مجھے اندر ہی اندر جھلسا رہی تھی۔ ایک شعر خود بخود موزوں ہوگیا تھا' میں اسے زیرلب دہرانے لگا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر اس شعر کے ساتھ چھ سات مزید شعر جڑ گئے اور ایک خوب صورت غزل مکمل ہوگئی۔ کتنی آسانی سے اور روانی سے یہ غزل مکمل ہوئی تھی اور ایسا بھی نہیں تھا کہ یہ کوئی معمولی غزل ہو۔ تخلیق کار کی حیثیت سے میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ غزل میری اردو کی بہترین نگارشات میں شمار ہوگی۔ طبع آج کل اتنی رواں کیوں ہے؟ یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا اور اس کے ساتھ ہی ایک وسیع و عریض پردہ سا میری نگاہوں کے سامنے سے اٹھتا چلا گیا۔ میرے چاروں طرف ایک دم روشنی سی پھیل گئی اور اس روشنی میں مجھے اپنا ماضی و حال بالکل صاف صاف نظر آنے لگا۔ بالکل جیسے کسی نے بٹن دبا کر رات کو دن میں بدل دیا ہو اور گردوپیش کی ہر شے عیاں ہوگئی ہو۔ اس سنسان اندھیرے میں اس خاموش باغیچے کے اندر مولسری کے پھولوں کے پاس بیٹھے بیٹھے مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ میں عالیہ کے قریب ہوکر بھی آج تک

اس سے دور کیوں رہا ہوں۔ وہ کیا الجھن تھی جو مجھے عالیہ کے لئے تڑپاتی رہی ہے اور اس سے دور بھی لے جاتی رہی ہے؟ ایک ہی لمحے میں میں تحلیل نفسی کے طویل عمل سے گزر گیا اور اپنی ہر کج روی کی بنیاد میرے علم میں آگئی......... مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اپنے تخلیقی عمل کو جوان رکھنے کے لئے عالیہ کے غم کو ایک "توانائی" کے طور پر استعمال کرتا رہا ہوں۔ میں اس کے قریب آنے کے لئے تڑپتا رہا ہوں لیکن جب جب مجھے اپنی خواہش پوری ہوتی نظر آئی ہے' میں اپنے غم کو بچانے کے لئے عالیہ سے دور چلا گیا ہوں' تاکہ ایک بار پھر سے اس کی تمنا کرسکوں اور اس کے ہجر میں ڈوب کر اپنی شاعری کو رعنائیاں بخش سکوں......... ماضی کا ہر ہر لمحہ میرے اس طرز عمل کا گواہ تھا.......... سب سے پہلے میں نے اپنے غم کی پرورش کے لئے یہ ضد پکڑی کہ عالیہ مجھے خط لکھے۔ میں دن رات اس خط کے لئے آہیں بھرتا رہا' آنسو بہاتا رہا اور شعر لکھتا رہا۔ ایک طرح کی......... خودترسی تھی جو ہر لمحہ مجھ پر طاری رہتی تھی لیکن جب عالیہ نے ہار مان لی اور میری خوشی کے لئے مجھے محبت نامہ لکھنے پر تیار ہوگئی تو میں چونک گیا۔ مجھے اپنا غم بکھرتا ہوا نظر آیا اور اس کے نتیجے میں شاعری بانجھ ہوتی دکھائی دی۔ ایکاایکی' خط کا آنا یا نہ آنا میرے لئے غیراہم ہوگیا۔ غیرارادی طور پر میں نے عالیہ کے خط کی طرف سے بے پروائی برتی' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری محبت کا راز فاش ہوا اور دونوں گھرانوں کے تعلقات میں ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی۔ عالیہ کی منگنی ہوئی اور پھر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میرا غم جوان ہونے لگا۔ میری آنکھوں میں آتشیں آنسو تیرنے لگے اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی حیران کن توانائی ملنے لگی۔ عالیہ کی مہندی کی رات میں نے "تضاد" نامی وہ نظم لکھی جس نے میرے لئے شہرت اور پہچان کے نئے دروازے کھولے......... عالیہ کی شادی کے بعد آٹھ دس ماہ کے دوران میں میں نے بہترین شاعری کی اور "امپیکٹ گروپ" میں اپنا مقام پیدا کرلیا لیکن تب ایک بار پھر میرے غم کی دھار کند ہونے لگی میری شاعری میں تیکھاپن ختم ہونے لگا۔ میں اشرف کمال کی فرمائش پر گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا لیکن کاغذ اور قلم کا رشتہ استوار نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہ "بیڈ پیچ" میری پوری زندگی پر محیط ہوجاتا لیکن مری میں ایک بار پھر عالیہ سے ملاقات ہوگئی اور میرے سارے زخم ہرے ہوکر میرے غم پر بہار لے آئے۔ عالیہ اب شادی شدہ تھی اور مجھ سے بہت دور تھی۔

یہی دوری تھی جو میرے اندر اس کی طلب بڑھا رہی تھی اور میرے غم کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کررہی تھی۔ وہ اکرام کی بیوی تھی' میں اپنی اور اس کی تمام تر مجبوریاں سمجھتا تھا لیکن پھر بھی اس کی چاہ میں فنا ہو رہا تھا۔ ان دنوں میرے قلم کو ایک بار پھر روانی اور بے پناہ توانائی ملی "شاید ہم پھر ملیں گے" جیسا پاپولر گیت بھی انہیں دنوں کی یادگار تھا۔ بعد میں میں زخمی ہوا اور علاج کے لئے لندن چلا گیا۔ لندن میں بھی عالیہ کی یاد ہر پل میرے ساتھ رہی اور میرے تخلیقی عمل کو حرارت بخشتی رہی۔ پھر میں لندن سے واپس آیا۔ اسلام آباد کے اس شاندار ہوٹل کے شان دار کمرے میں ایک سحر انگیز شام کو عالیہ سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ سرتاپا میرے خوابوں کی تعبیر میرے سامنے تھی لیکن جب عالیہ نے مجھے بتایا کہ وہ شوہر سے طلاق حاصل کرچکی ہے تو ایک دم وہ دوری اور نارسائی ناپید ہوگئی جو عالیہ کے لئے میری چاہت اور تڑپ کی بنیاد تھی۔ انہونی کو فتح کرنے کی خواہش دم توڑ گئی۔ عالیہ اب میری دسترس میں تھی اور عالیہ کا غم میری دسترس سے بہت دور......... میں ایک بار پھر پیچھے ہٹ گیا۔ عالیہ کو اسلام آباد چھوڑ کر چپکے سے لاہور چلا آیا۔ اس دفعہ بھی بالکل خط والا معاملہ ہوا تھا۔ پہلے شوق کی انتہا پھر بے رغبتی کی انتہا......... چند ہفتے لاہور رہ کر میں دوبارہ لندن چلا گیا تھا۔ لندن میں وہی ہوا تھا جو پہلے ہوتا رہا تھا۔ میری تخلیقی توانائی بتدریج کم ہوتی چلی گئی تھی اور دو ماہ پہلے تک میں قلم و قرطاس سے قریباً بے زار ہوگیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر غم کی حرارت درکار تھی۔ آنسو درکار تھے اور دل کی رگیں توڑنے وال کرب درکار تھا۔ یہ خود اذیتی تھی یا خودترسی' میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بس میں رونا چاہتا تھا اور لکھنا چاہتا تھا انہیں دنوں مجھے شاہین کی طرف سے وہ خط مل گیا تھا جس میں "سہارا فاؤنڈیشن" کا ذکر تھا اور اخباری تراشہ تھا جس میں عالیہ ار اس کی لے پالک بچی کی رنگین تصویریں تھیں۔ ناقابل شکست کو شکست دینے کی فطری خواہش پھر جاگی تھی اور اس کے ساتھ ہی غم کے سوکھے شجر میں سے تازہ کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ میں نے رخت سفر باندھا تھا اور لاہور چلا آیا تھا۔ لاہور میں آکر میں نے عالیہ کا زبردست گریز دیکھا تھا اور میری آتش شوق کو ہوا ملتی چلی گئی تھی۔

.... ماضی کے یہ نشیب و فراز ایک رواں دواں فلم کی طرح میرے پردہ تصور پر نمودار ہوئے اور اوجھل ہوگئے۔ میں اسی طرح مولسری کے پھولوں کے پاس بیٹھا تھا۔

میرے سامنے گھاس پر سگریٹ کے ڈیڑھ درجن ٹکڑے بکھر چکے تھے۔ گھڑی رات کے گیارہ بجارہی تھی۔ باغیچے کے پچھواڑے ایک وسیع کوٹھی میں رکھوالی کا کتا بار بار بھونکتا تھا اور سناٹے کا سینہ چیر دیتا تھا۔ میری ایک ٹانگ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ یہ درد اس چوٹ کی نشانی تھا جو مجھے مری میں لگی تھی۔ کبھی کبھی تھکاوٹ کے سبب یہ درد عود کر آتا تھا۔ میری نگاہیں عالیہ کی رہائش گاہ پر مرکوز تھیں۔ بالائی کھڑکیوں کا منظر میرے سامنے تھا۔ ایک کمرے کی کھڑکیاں روشن تھیں۔ ان کھڑکیوں کے پیچھے کوئی موجود تھا اور یقیناً وہ عالیہ ہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں باغیچے میں موجود ہوں۔ اس نے دو تین بار کمرے کی لائٹ آف کی تھی تاکہ مجھے ٹھیک سے دیکھ سکے۔ وہ جب بھی لائٹ بند کردیتی' میں زیادہ واضح طور سے نظر آنے کے لئے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے چہل قدمی کرنے لگتا تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں یہاں موجود ہوں اور وہ جب تک مجھ سے بات نہیں کرے گی میں یہیں موجود رہوں گا۔ وہ میری اس عادت سے بخوبی واقف تھی۔ اپنے رومانس کے اولین دنوں میں بھی میں ایسے ہی کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی عالیہ مجھ سے ناراض ہوجاتی تھی۔ اپنی ناراضگی کا اظہار وہ اس طرح کرتی تھی کہ کمرے کی کھڑکیاں بند رکھتی تھی۔ میں ساری ساری رات چھت پر کھڑا رہتا تھا۔ یہ ایک طرح کا احتجاجی اقدام ہوتا تھا۔ وہ کونے کھدروں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی اور پیچ و تاب کھاتی رہتی تھی۔ آخر جب وہ کھڑکیاں کھولتی تھی تو میں اپنا "احتجاجی مظاہرہ" ختم کرتا تھا۔ آج برسوں بعد میں ایک بار پھر ویسا ہی احتجاجی مظاہرہ کررہا تھا۔ اس مرتبہ یہ مظاہرہ بہت سنگین تھا۔

رات بارہ بجے کے بعد مکان کی ساری کھڑکیاں تاریک ہوگئیں' وہ کھڑکی بھی جسکے پیچھے عالیہ موجود تھی۔ تاہم اس کمرے میں ٹی وی آن تھا اور گاہے گاہے اسکرین کی نیلی پیلی روشنی شیشوں پر منعکس ہوجاتی تھی۔ میں تکونی گراؤنڈ میں چہل قدمی کرنے کے ساتھ ساتھ سوچتا بھی جارہا تھا۔ میرے دل ودماغ میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ اب تک میں نے جو ناانصافیاں عالیہ سے کی تھیں وہ ایک ایک کرکے ذہن میں آرہی تھیں۔ میں اپنی کج ادائیوں کو کوس رہا تھا اور خود پر ملامت کے ڈونگرے برسا رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی انقلابی تبدیلی رونما ہوچکی ہے۔ کوئی سورج ہے جو تاریک بادلوں کا سینہ چیر کر طلوع ہوا ہے' یا پھر کوئی طوفانی ریلا ہے جو میری ذات کے ہر کہنہ نقش کو مٹاتا چلا

جارہا ہے۔ وہیں اس تاریک باغیچے میں ٹہلتے ٹہلتے میں نے فیصلہ کیا کہ میں عالیہ کو اپناؤں گا اور تین چار روز کے اندر اسے سہاگ کا سرخ جوڑا پہنادوں گا۔ مجھے اب غم کی نہیں عالیہ کی ضرورت تھی۔ ممکن تھا کہ میرے غم کے ساتھ میری شاعری بھی مرجاتی۔ میرے تخلیق کے چشمے سوکھ جاتے لیکن مجھے اب اس کی پروا نہیں تھی۔ میرے فیصلے ایسے ہی اچانک اور فوری ہوا کرتے تھے۔

اچانک میں اپنے خیالوں سے چونک اٹھا۔ ایک ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ یہ آہٹ اس دروازے کی طرف سے آئی تھی جو کچھ گھنٹے پہلے بڑی بے رخی سے مجھ پر بند کردیا گیا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دھیان سے دیکھا۔ دروازہ کھل رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی مدہم روشنی میں مجھے عالیہ کے سبز آنچل کی جھلک نظر آئی۔ ہاں یہ عالیہ ہی تھی جو دروازے پر کھڑی تھی۔ میں قریباً ایک منٹ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ باہر آئی اور نہ اس نے دروازہ بند کیا۔ شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ پاؤں تلے مسلا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے پانچ فٹ کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ کتنا بے ڈھنگا سا لگ رہا تھا یہ سب کچھ! اور کتنی مضحکہ خیز تھی یہ خاموشی۔ مجھے عالیہ کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ نظر آرہا تھا۔

وہ بولی "کیا بات ہے۔ آپ یہاں سے جاتے کیوں نہیں؟ میری نہیں تو اپنی عزت کا خیال کریں۔"

"تمہاری عزت کا خیال مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ ہے عالیہ! لیکن......... کیا میں تم سے چند باتیں کرنے کا حق دار بھی نہیں ہوں۔"

وہ اپنی جگہ گم صم کھڑی رہی پھر ایک دم بدلے ہوئے لہجے میں بولی "اچھا آیئے۔"

اس کا لہجہ سپاٹ تھا اور معنی سے خالی تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے بیرونی دروازے کو پھر سے بولٹ کردیا۔ دبے قدموں سے اس نے صحن پار کیا۔ اس کی احتیاط دیکھ کر میں بھی محتاط ہوگیا۔ یقیناً عالیہ نہیں چاہتی تھی کہ خالہ یا گھریلو ملازمہ جاگ جائے۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے تھے۔ فرش پر قالین تھا۔ کمرے کی آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سٹنگ روم ہے۔

عالیہ نے سادہ سی سبز ساڑی پہن رکھی تھی۔ وہ ساڑی پہننے میں کمال کی نفاست سے کام لیتی تھی۔ یہ لباس اس کے چھریرے بدن پر بجتا بھی بہت تھا۔ میں نے ٹیوب لائٹ کی روشنی میں غور سے اسے دیکھا۔ اس کے جسم میں کوئی جوار بھاٹا تھا۔ معلوم نہیں اس جوار بھاٹے کی نوعیت کیا تھی۔ اس کی سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر تھیں جیسے پوچھ رہی ہوں "اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں بولا تو مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی "عالیہ! کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"میں آپ کو معاف کرچکی ہوں۔"

"میں تمہارے لہجے سے کیا مطلب لوں؟"

میں اسے نگاہوں سے ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ناکامی ہو رہی تھی' "عالیہ' ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا۔

"جو بھی کہنا ہے' ایک ہی بار کہہ لیں۔ بار بار آکر مجھے کانٹوں پر نہ گھسیٹیں۔"

اس کے لہجے میں نجانے کیا بات تھی کہ میں لرز گیا۔ شاید اس لرزش کو چھپانے کے لئے ہی میں نے دو قدم آگے بڑھائے تھے۔ یک لخت میں نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر پائے۔ وہ ایک بے اختیار حرکت تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ بلامزاحمت میرے سینے سے لگ گئی۔ ایک دم میرے ذہن میں دھند سی بھرنا شروع ہوگئی۔ اس دھند میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ عالیہ میرے قریب ہے اور میرے ہونٹ اس کے لمس سے آشنا ہو رہے ہیں۔ نجانے کتنی ہی دیر میں اس میں کھویا رہا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ وہ ایک عام سی لڑکی تھی لیکن اپنی کشش کے اعتبار سے عام نہیں تھی......... اچانک کسی قریبی کمرے سے بچے کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ تب وہ پکارا "ماما......... ماما۔"

میں نے پہچان لیا۔ یہ عالیہ کی لے پالک بچی تھی۔ عالیہ مجھ سے جدا ہوئی اور ساڑی درست کرتے ہوئے بولی "میں ابھی آتی ہوں۔"

اس کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ وہ شب خوابی کے گلابی لباس میں تھی۔ ایک دم میرے اندر ایک آتش فشاں سا پھٹ گیا۔ یہ

شب خوابی کا لباس کس بات کی علامت تھا؟ وہ کیوں تھی اس لباس میں؟ پھر میرے کانوں میں وہ فقرہ گونجا جو تھوڑی دیر پہلے عالیہ نے کہا تھا "جو بھی کہنا ہے' ایک ہی بار کہہ لیں۔ بار بار آکر مجھے کانوں پر نہ گھسیٹیں۔"

یہ کیسا فقرہ تھا؟ کیا معنی پوشیدہ تھے اس میں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں عالیہ کی طرف کھنچا چلا جارہا تھا اور آج وہ سرد مہری بھی درمیان میں حائل نہیں تھی جو اچانک ہی میرے وجود پر حملہ آور ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنا ہر حقیقی اور تصوراتی نقصان نظر انداز کر کے عالیہ کو اپنانے کا حتمی فیصلہ کرچکا تھا۔ میں نے عالیہ کو قریب کیا تو وہ سرتاپا خود سپردگی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ میرے ہاتھوں میں موم کی طرح پگھل رہی تھی "جو بھی کہنا ہے ایک ہی بار کہہ لیں۔" اس فقرے کی گونج بار بار میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ پھر اچانک ایک لہر نے ہم دونوں کو ڈھانپ لیا۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں عالیہ میں کھو گیا......... جدائیوں کی صدیوں کا کرب جب لمس کی آنچ پر کشید ہوا تو خوشی بن گیا اور لمحوں میں سمٹ آیا۔ میرے کانوں میں اپنی دھڑکن گونج رہی تھی۔ ان دھڑکنوں کی بے ترتیبی ایک ترتیب بن گئی تھی۔ سروں کی شکل دھار گئی تھی۔ ون ٹو تھری فور......... ون ٹو تھری......... ون ٹو......... ون ٹو تھری فور۔ یہ لے ایک نغمے کے آہنگ میں ڈھل گئی تھی......... ایک بہت مشہور نغمے کے آہنگ میں "شاید ہم پھر ملیں گے......... شاید ہم پھر ملیں گے"

.... وہ رات میری زندگی کی حسین ترین رات تھی۔ وہ رات ریشم کے ایک بہت بڑے ڈھیر کی طرح تھی۔ میں اور عالیہ اس ریشم میں ڈوب گئے تھے۔ ہمیں دنیا کی بہترین خوشبوؤں نے ڈھانپ لیا تھا اور ہمارے کانوں میں ایسے رسیلے نغمے گونج تھے کہ ہم زمان و مکاں کی حدود سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ مجھے وہ سب کچھ ملا تھا جس کی کوئی عاشق تمنا کرسکتا ہے۔

اس روز اجالا ہونے سے پہلے میں عالیہ کو "خدا حافظ" کہہ کر واپس آگیا تھا۔ میں نے عالیہ کو نہیں بتایا تھا کہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں جو کچھ کرنا چاہتا تھا' اچانک حیران کن تیزی سے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اگلے روز اشرف کمال کو انگلینڈ فون کیا تھا اور

اسے تمام صورت حال بتادی تھی......... میں نے اشرف کمال کے ذمے جو کام لگایا تھا وہ اس نے بڑی خوبی سے انجام دیا اور میری توقع سے زیادہ تیزی دکھائی۔ دوسرے روز رات کے وقت مجھے آئی ایس پی کے ذریعے وہ بھاری بھرکم پارسل مل گیا جس میں میری شادی کے کارڈز موجود تھے۔ یہ کارڈز انگلینڈ کی ایک مشہور اور مہنگی ترین فرم نے تیار کئے تھے اور بات صرف کارڈز تک ہی محدود نہیں تھی۔ میں اپنی اور عالیہ کی شادی کو ایک یادگار شادی بنانا چاہتا تھا میرے بنک میں بہت پیسہ تھا اور بے کار پڑا تھا۔ میں ایک ایسا شخص تھا جسے پیسہ کمانا آتا تھا اور نہ خرچ کرنا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ پیسہ کن کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اب زندگی میں پہلی بار اس پیسے کا ایک مصرف میری سمجھ میں آیا تھا۔ میں عالیہ کو سونے اور جواہرات میں تول کر اپنے گھر لانا چاہتا تھا۔

اشرف کمال نے اپنے ایک دست راست ثاقب رضوی کو پاکستان بھیج دیا تھا۔ یہ شخص میرے پرائیویٹ سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیتا تھا اور بے حد قابل اعتماد تھا۔ میں نے ثاقب رضوی کو شادی کے انتظامات کے سلسلے میں ابتدائی ہدایات دیں اور پیسہ خرچ کرنے کے سلسلے میں اسے فری ہینڈ دے دیا۔ اگلے روز میں نے اپنے گھر' اپنی بہن شاہین سے شادی کے سلسلے میں طویل صلاح مشورہ کیا اور ثاقب رضوی کو ضروری شاپنگ کے لئے دبئی روانہ کردیا۔ ثاقب رضوی کا ایک کارندہ لاہور ہی میں تھا اور شادی کے سلسلے میں دیگر منصوبہ بندیاں کر رہا تھا۔ اسی روز شام کو میں اپنی اور عالیہ کی شادی کے کارڈ لے کر عالیہ کی رہائش گاہ پر پہنچا تھا۔ میں عالیہ کو کارڈ دکھا کر یادگار سرپرائز دینا چاہتا تھا...... لیکن...... ہوا یہ کہ عالیہ کے بجائے مجھے سرپرائز ملا اور یہ سرپرائز یادگار ہی نہیں' ناقابل فراموش بھی تھا۔ یہ بھیانک سرپرائز ایک خط کی صورت میں آج بھی میرے پاس موجود ہے......... دس سال گزر چکے ہیں۔ میں نے اس خط کو بے شمار دفعہ پڑھا ہے۔ چاندنی راتوں میں' گلابی شاموں میں' اداس تہواروں کے موقعوں پر اور رم جھم برستی بارشوں میں۔ اس خط کا کاغذ پرانا ہوچکا ہے' تہ کرنے سے لکیریں بن چکی ہیں' الفاظ مدہم ہوگئے ہیں لیکن اس خط کی سطور میں چھپا ہوا جان لیوا غم روز اول کی طرح تازہ ہے۔ خط کی تحریر کچھ اس طرح ہے۔

جان سے پیارے ندیم!

جب خالہ کے ذریعے آپ کو یہ خط ملے گا' میں آپ سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ بس یوں سمجھ لیں کہ آپ کے لئے مرچکی ہوں گی۔ میں آپ کی بہتری کے لئے آپ کو بتا رہی ہوں کہ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ اس کوشش میں ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں پاکستان میں نہیں اور جہاں ہوں اس کا علم میرے سوا اور کسی کو نہیں۔ والد اور والدہ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اب میرا ہے بھی کون جسے اپنے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں بتاؤں۔

جو کچھ ہفتے کی رات پیش آیا ہے اور جو کچھ دو تین ہفتوں سے پیش آ رہا ہے اس کے بارے میں میں پہلے سے اندازہ لگا چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے جانے کی تیاری میں نے پہلے سے مکمل کرلی تھی۔ میں "سہارا فاؤنڈیشن" کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد کر رہی ہوں۔ اس کمیٹی کی "ہیڈ" صوفی ہوگی۔ فاؤنڈیشن سے متعلق دیگر امور بھی میں نے طے کردیئے ہیں۔ میں پاکستان سے صرف اپنی بچی پنکی کو ساتھ لے جا رہی ہوں.......... یا آپ کی یادیں لے جا رہی ہوں۔

یقیناً اب آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھر آیا ہوگا کہ اگر میں واقعی یہاں سے چلی گئی ہوں تو کیوں؟ اس کا جواب آپ خود ہیں ندیم.......... میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور آپ کی خاطر مر بھی سکتی ہوں' لیکن روز روز اپنے نڈھال جسم کو کانٹوں پر گھسٹتا نہیں دیکھ سکتی۔ آپ مجھ سے اب تک یہی کرتے رہے ہیں اور میں بخوبی جانتی ہوں کہ آپ آئندہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ لاکھ قسمیں کھائیں' وعدے کریں لیکن اس عمل سے آپ باز نہیں رہ سکیں گے۔ یہ آپ کی اٹل مجبوری ہے ندیم۔

آپ ایک نامور شاعر ہیں۔ فلسفے اور نفسیات کی باتیں کرتے ہیں۔ معلوم نہیں اپنی نفسیات پر بھی کبھی آپ کی نظر پڑی ہے یا نہیں۔ بہرحال اپنی کم علمی کے باوجود میں اس حوالے سے بہت کچھ جان چکی ہوں۔ آپ ایک تخلیق کار ہیں ندیم.......... اور آپ کی تخلیقات غم خور ہیں۔ اپنی تخلیقات کا پیٹ بھرنے کے لئے آپ کو ہروقت رنج و غم کی ضرورت رہتی ہے۔ اس "رنج و غم" کے حصول کے لئے آپ اپنے اوپر ستم توڑتے ہیں اور مجھے بھی زندگی اور موت کے درمیان لٹکاتے ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے آپ کی اس ضرورت کو پورا کرنے کا مستقل انتظام کردیا ہے.......... میں آپ سے دور

جا رہی ہوں اس لئے کہ آپ کے اندر کا فن کار ہمیشہ کے لئے آپ کے قریب آجائے.......... آپ کی شاعری زندہ ہو جائے۔ میں جانتی ہوں یہ دائمی دوری جہاں آپ پر شاق گزرے گی وہاں مجھے بھی آخری دم تک خون کے آنسو رلائے گی لیکن مجھے خون کے یہ آنسو قبول ہیں کیونکہ ان میں تسلسل ہوگا' یہ نہیں ہوگا کہ کسی وقت آپ کی عارضی محبت میرے ہونٹوں پر پھول کھلائے گی اور کسی وقت آپ کی بے رحم لاتعلقی میری جان پر عذاب توڑے گی۔ اب جو کچھ بھی ہوگا' یقینی ہوگا اور مستقل ہوگا۔

ممکن ہے وقتی طور پر آپ کو میرا فیصلہ گراں گزرے۔ آپ کہیں کہ آپ نے تو میرے لئے سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا' اپنی شاعری کو بھی ثانوی حیثیت دینے پر تیار ہوگئے تھے لیکن اگر آپ ایسا سوچیں گے تو یہ آپ کی خام خیالی ہوگی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اپنی شاعری سے جدا ہوگئے تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی زندگی آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گی۔ آپ کو اپنے فن کی طرف رجوع کرنا ہی کرنا ہے.......... اور میں اب خود بھی یہ چاہتی ہوں کہ آپ اپنے فن سے جدا نہ ہوں۔ شاید آپ سے وابستہ ہر چیز کی طرف مجھے آپ کے فن سے بھی محبت ہو چکی ہے۔ میں آپ کی شاعری پڑھتی ہوں' آپ کے گیت سنتی ہوں' آپ کے انٹرویوز دیکھتی ہوں تو ایک عجیب سی فخر آمیز خوشی رگ و پے میں پھیل جاتی ہے۔ دل چاہتا ہے آپ بہت بلندی پر جائیں' نیک نامی اور شہرت کی انتہا کو چھوئیں.......... میرا کیا ہے۔ میری جیسی معمولی لڑکیاں تو روز پیدا ہوتی ہیں اور مرتی ہیں لیکن آپ جیسے شاعروں کی شاعری صدیوں زندہ رہتی ہے۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ کسی بھی حوالے سے اس شاعری کی راہ میں آؤں۔

.... مجھے یقین ہے ندیم! بہت جلد آپ کے گیت مقبولیت کی معراج پائیں گے۔ یہ گیت دنیا کے ہر خطے میں گونجیں گے۔ کسی ایسے گم نام خطے میں بیٹھ کر میں بھی یہ گیت سنا کروں گی اور آپ کے الفاظ میں اپنی گم گشتہ محبت کی خوشبو ڈھونڈا کروں گی۔ آپ میرے بارے میں جو کچھ کہیں گے' وہ مجھ تک پہنچ جایا کرے گا۔ پھر میں پہروں بیٹھ کر آپ کے بارے اور آپ کے احساسات کے بارے میں سوچا کروں گی۔ زندگی اگر طویل بھی ہوئی تو اس مصروفیت کے سہارے کاٹنا آسان ہو جائے گی۔ اجازت چاہتی ہوں۔ اگر کسی وقت مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو یا آپ کی "پذیرائی" میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو

مجھے معاف کردیں۔

عالیہ!

یہ خط میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار یہی سوچتا ہوں کہ عالیہ نے میرے لئے نرم ترین الفاظ استعمال کئے تھے۔ اگر وہ چاہتی تو میرے لئے بہت کچھ لکھ سکتی تھی۔ مجھے ایک ایسے ڈریکولا سے تشبیہ دے سکتی تھی جو سنسان راتوں میں اپنی قبر سے نکلتا تھا اور اپنی شاعری کو جوان رکھنے کے لئے "بے گناہ محبت" کا خون چوستا تھا۔ محبت تڑپتی تھی، مچلتی تھی لیکن وہ اپنی ضروریات پوری کر کے رہتا تھا لیکن اس بات کا دھیان بھی رکھتا تھا کہ "محبت" کہیں مر ہی نہ جائے۔ وہ اسے زندہ رکھتا تھا تاکہ پھر کسی وقت شب خون مارے اور اسے نچوڑ کر اپنی شاعری کے لب و رخسار چمکائے۔ وہ بار بار یہ خون نچوڑتا رہا تھا...... اور آخر میں اپنے شکار کی آبرو سے ہی کھیل گیا تھا۔ ایک پوری رات وہ اپنے جسم کی آگ بجھاتا رہا تھا...... ہاں وہ یہ سب کچھ لکھ سکتی تھی۔

اس نے نہیں لکھا تھا، لیکن میں تو لکھ سکتا ہوں۔ میرا تو کام ہی لکھنا ہے۔ ابھی چند روز پہلے میں نے "امپیکٹ گروپ" کے لئے جو تازہ ترین گیت لکھا ہے اس کا عنوان "ڈریکولا" ہے۔ اس کا "تھیم" وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ گیت بھی میرے دو درجن مقبول ترین گیتوں کی صف میں شامل ہو جائے گا، میری شہرت میں اضافہ کرے گا اور میرے معاوضے میں بھی...... لیکن اس شہرت اور معاوضے کا میں کیا کروں گا۔ میں تن تنہا ہوں اور قریباً گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اشرف کمال سیکڑوں بار کہہ چکا ہے کہ میں کیوں ایک معمولی لڑکی کے لئے زندگی برباد کر رہا ہوں لیکن اشرف کمال نہیں جانتا کہ اس لڑکی کا معمولی ہونا بھی کتنا غیر معمولی تھا آہ...... میں کیسے بتاؤں وہ میرے لئے کیا تھی۔ اس کے ساتھ ہونے والی آخری ملاقات کا ایک ایک لمحہ میرے دل و دماغ پر دائمی نقش بنا چکا ہے۔ اس ہوشربا رات کے بعد اب کون سی رات ہے جو مجھے کشش کر سکتی ہے۔ بقول شاعر

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

مجھے تو اب یہ بھی معلوم نہیں کہ کیوں لکھتا ہوں۔ کبھی کبھی تو جھلا کر لکھنا چھوڑ دیتا ہوں لیکن عالیہ مجھے اس قابل بھی نہیں چھوڑ گئی کہ میں لکھنا چھوڑ سکوں۔ غم کا جو سمندر وہ مجھے سونپ گئی ہے وہ روشنائی کا سمندر بن چکا ہے۔ یہ روشنائی جب موج در موج میرے قلم پر حملہ آور ہوتی ہے تو میں لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں...... میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔

اب بھی میں لکھ رہا ہوں۔ رات آدھی گزر چکی ہے کھڑکی کھلی ہے ہوا کے جھونکوں میں کچھ بہت پرانی سرگوشیوں کی گونج ہے۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

"اونہوں۔"

"اچھا اگر ہماری شادی ہو گئی تو کیا کرو گی؟"

"آپ کے کپڑے استری کروں گی۔ آپ کے بوٹ پالش کروں گی۔ جب صبح آپ کام پر جائیں گے تو آپ کی گاڑی صاف کروں گی۔"

"اور کیا کرو گی؟"

"آپ کے لئے کھانا بناؤں گی، آٹا گوندھوں گی، مسالا پیسوں گی، لہسن اور پیاز کاٹوں گی۔"

"اور کیا کرو گی؟"

"بابا! سب کچھ کروں گی جو کہیں گے کروں گی۔"

"وعدہ؟"

"ہاں ہاں"

یہ آوازیں ہیں، اور ایسی بہت سی آوازیں ہیں جن کی "بازگشت" ہر دم مجھے گھیرے رہتی ہے۔ میں جانتا ہوں یہ "بازگشت" زندگی کی آخری سانس تک میرے ساتھ رہے گی۔

======= ختم شد =======
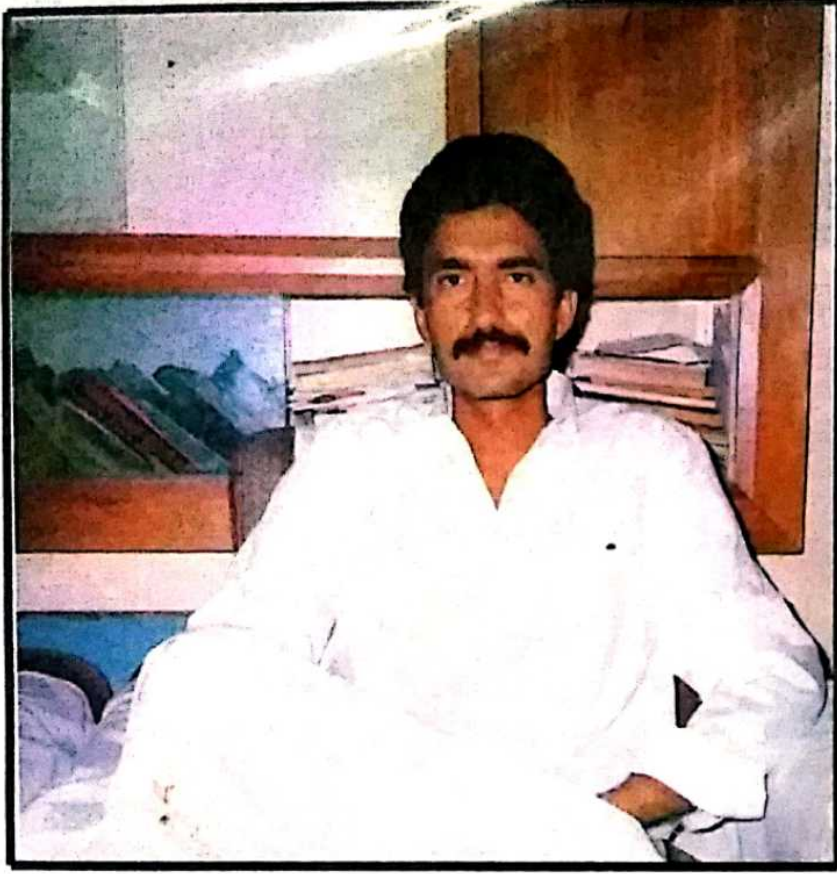
طاہر جاوید مغل صاحب نے اپنے قارئین اور مداحوں کا ایک بہت وسیع حلقہ پیدا کیا ہوا ہے۔ انہوں نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ طاہر جاوید مغل نے جرم و سزا کی کہانیاں اور رومانی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ تاریخی اور سماجی طویل سلسلے اس کے علاوہ ہیں۔ طاہر جاوید مغل نے اہل قلم حضرات کی محفل میں ایک مستقل اور ممتاز مقام حاصل کیا ہوا ہے۔

پہلی بار جب میں نے ان کی لکھی ہوئی اثر وجذبے میں ڈوبی ہوئی ایک رومانی کہانی پڑھی تو یقین نہیں آیا کہ یہ وہی طاہر جاوید مغل ہے جو سلسلہ وار کہانیوں میں پرشکوہ الفاظ اور طرز بیان کی آن بان کے مطابق کردار اور واقعات ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ کہانی اور وہ بھی رومانی کہانی ایک یکسر مختلف مزاج اور سوچ کی طلب گار ہوتی ہے۔ طاہر جاوید نے اس میدان میں بھی خود کو منوا لیا ہے۔ ان کی ہر کہانی کا موضوع اور مزاج مختلف ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت زیر نظر کتاب سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

علی سفیان آفاقی